قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

www.urducouncil.nic.in

جنوری 2013، قیمت -/15

ماہنامہ

اُردو دُنیا

دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

بدعنوانی کے عفریت پر حکومت کی یلغار

مشمولات

ماہنامہ اردو دنیا دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi
قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
جلد: 15، شمارہ: 01، جنوری 2013

مدیر: ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین
نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی
اعزازی مدیر: نصرت ظہیر

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند
مطبع: الیس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020
مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل
کمپوزنگ: محمد اکرام
قیمت -/15 روپے، سالانہ -/150 روپے
■ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000
(شعبۂ ادارت: 49539009)

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
email: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7
آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 26109746
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 1-5، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون: 24415194- 040

اداریہ
ہماری بات 2
خطوط
آپ کی بات — قارئین کے خطوط 3
انٹرویو
اردو کی ترویج وترقی کے ہم سفر — نصرت ظہیر 5
خراج عقیدت
اندر کمار گجرال — سہیل انجم 11
ہلال سیوہاروی — فاروق ارگلی 13
دیویندر اسر — عبدالحی 15
کور اسٹوری
بدعنوانی کے عفریت پر حکومت کی یلغار 1 — شاہد اختر انصاری 18
بدعنوانی کے عفریت پر حکومت کی یلغار 2 — شاہد اختر انصاری 21
زبان و تعلیم
لاشعور میں مادری زبان کی عمل داری — حسن رضا 23
ادبی مباحث
اردو کی اولین نثری نظم اور منٹو — صادق 25
کشمیر کی پہلی اردو نثری تصنیف: گلدستہ کشمیر — قدوس جاوید 28
منظر کاظمی کے افسانے — اختر آزاد 31
پریم چند کے افسانوں میں احتجاجی رویہ — نفیس بانو 34
گیان چند جین کی تحقیقی خدمات — شاہنواز فیاض 36
شخصیت
علامہ راشد الخیری کی نظم نگاری — محمد اکبر 38
مشاہیر ادب
شاد کی غزل کے دو رنگ — عتیق اللہ 40
انتخاب کلام شاد عظیم آبادی 43
صحافت
رسالہ 'شاہراہ' کے اداریے — نوشاد منظر 45
ہماری مطبوعات
ادب، اقدار اور پاپولر کلچر — دیویندر اسر، مترجم: شاہد پرویز 48

تہذیب و ثقافت
اسلامی فنون کی مختلف شکلیں — محمد شجاعت علی راشد 52
سیرت پاک پر ایک علامتی تحریر
سیاہ غلاف اور کالے جرنیل — منظر کاظمی 56
شہر بین
سندیلہ: اردو کا اہم ثقافتی مرکز — ایم حیات نصرت 58

کیریئر گائڈ
اردو سند یافتہ نوجوانوں کے روزگار کے مسائل — امان اللہ 60
جہان نسواں
اردو فکشن میں خواتین کے مسائل — محمد مرتضیٰ 62
دوسری زبانوں سے
پیاسم (ملیالم افسانہ) — کملا داس، مترجم: احمد نسیم صدیقی 65
پرند جو پرواز کر گیا (مختصر فارسی افسانہ) — محمد حجازی، مترجم: احمد نسیم صدیقی 66
صحت
بلڈ پریشر — مشرف علی 67
سائنس
سیارۂ سرخ مریخ کی جانب پیش قدمی — عظیم اقبال 69

کتابوں کی دنیا
تبصرہ و تعارف 71
قومی اردو کونسل کی میٹنگ
تصحیح — ادارہ 77
اردو کیمپس
یونیورسٹیوں کی اردو سرگرمیاں — ادارہ 78
عالمی اردو نامہ — ادارہ 81
خبرنامہ
اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 83

ہماری بات

آرٹی آئی (رائٹ ٹو انفارمیشن) ایکٹ یا حقِ اطلاعات کے قانون کا نفاذ جمہوری ہندوستان کی تاریخ کا وہ انقلابی عمل ثابت ہوا ہے جس نے نہ صرف عوام اور حکومت کے درمیان فاصلے کو بڑی حد تک کم کیا ہے، بلکہ مختلف سطحوں پر ہونے والی بدعنوانیوں پر بھی اس سے ایک کاری ضرب پڑی ہے۔ بدعنوانی ایک ایسا مرض ہے جو کسی بھی جمہوریت کو بے معنی اور کھوکھلا بنا دیتا ہے اور آرٹی آئی اس مرض کے خلاف ایک موثر حربہ بن کر سامنے آیا ہے۔ اس کی بدولت ایک طرف مختلف انواع کی بدعنوانیوں پر سے پردہ اٹھ رہا ہے۔ دوسری طرف مرکزی اور ریاستی حکومتیں اب بہتر طور پر سمجھ پا رہی ہیں کہ ان کے یہاں انتظامی سطحوں پر کہاں کہاں ڈھیلا پن ہے، جس سے بدعنوان عناصر کو کھیل کھیلنے کا موقع مل جاتا ہے۔ اور تیسری طرف عام آدمی کے علم میں یہ بات آ رہی ہے کہ بدعنوانیاں کس طرح پنپتی ہیں اور بدعنوان افسران و ملازمین کرپشن کے لیے کیا کیا طریقے بروئے کار لاتے ہیں۔ ہماری سیاسی جماعتیں موجودہ مرکزی حکومت کی خواہ کتنی بھی نکتہ چینی کیوں نہ کریں، لیکن اس بات کے لیے یو پی اے حکومت کی تعریف کرنی ہوگی کہ اس نے اس ایکٹ کی تشکیل میں خاص دلچسپی لی، افسرانہ سطح پر ایکٹ کو غیر موثر بنانے کے لیے اس میں ترامیم کی جو کوششیں کی گئیں انھیں ناکام بنایا اور اس کے موثر نفاذ کو یہ جانتے ہوئے بھی وقار کا سوال بنائے رکھا کہ ایکٹ کو عمل میں لانے کے بعد سب سے زیادہ سیاسی نقصان حکمراں جماعت کو ہو سکتا ہے۔ آج ہمارا میڈیا سونیا گاندھی کے اس کمٹمنٹ، دور اندیشی اور سیاسی جرأت مندی کو خاطر خواہ انداز میں بھلے ہی سامنے نہ لا رہا ہو لیکن مستقبل کا مورخ انھیں ضرور یاد رکھے گا اور آرٹی آئی کے نفاذ کا ذکر یقیناً سنہرے حروف میں کیا جائے گا۔

'آدھار' کارڈ، جس کے ذریعے سرکاری سبسڈی کو اصل مستحقین تک پہنچانے کی اسکیم کا نفاذ حکومت کے حالیہ اعلان کے مطابق نئے سال کے پہلے دن سے ہونے والا ہے، کرپشن کے خلاف جنگ کے اسی سلسلے کی دوسری اہم ترین کڑی ہے۔ برسوں پہلے ملک کے جواں سال وزیر اعظم راجیو گاندھی نے کہا تھا کہ حکومت عام آدمی کو ایک روپیہ مدد کے طور پر دیتی ہے تو بدعنوان افسروں اور بچولیوں کے سبب بمشکل پندرہ پیسے اس تک پہنچتے ہیں۔ آدھار کارڈ کا استعمال اسی بچولیے کے خاتمے کے لیے کیا جائے گا۔ فی الحال حکومت غریبی کی سطح سے نیچے رہ رہے لوگوں کو مختلف فلاحی اسکیموں کے تحت ملنے والی سبسڈی، آدھار کارڈ کی بنیاد پر کھولے گئے بنک کھاتوں کے ذریعے براہ راست پہنچانا چاہتی ہے۔ اس طرح عام آدمی اور حکومت کے درمیان کوئی بچولیا نہیں رہے گا اور سرکاری رعایتیں سیدھے عوام کو مل سکیں گی۔ اس کے علاوہ عوامی نظام تقسیم کے اندر وسیع پیمانے پر جو بدعنوانیاں ہوتی ہیں ان کا بھی سد باب ہو سکے گا۔ لیکن یہ اس کارڈ کا صرف ایک استعمال ہے۔ آگے چل کر اس کی افادیت کے امکانات لامحدود ہیں۔ اس سے ملک کے ایک ایک شہری کی شناخت متعین ہو جائے گی۔ عام زندگی کے مختلف مراحل میں، سرکاری اور غیر سرکاری ضرورتوں کے لیے یہ کارڈ عام آدمی کی شناخت کا ناقابل تردید ثبوت ہوگا کیونکہ، کارڈ میں دیے گئے 'یونِک آئیڈنٹیفکیشن نمبر' Unique Indentification Number سے بذریعہ کمپیوٹر اس شناخت کی تصدیق ممکن ہو جائے گی۔ لوگوں کی سماجی، معاشی، اقتصادی اور تعلیمی صورت حال سے متعلق بنیادی اعداد و شمار، یوں تو مردم شماری سے بھی مل جاتے ہیں لیکن ان کے حصول میں جہاں کمی رہ جاتی ہے اسے 'آدھار کارڈ' پورا کرے گا۔ یہ مربوط اعداد و شمار مختلف سرکاری منصوبوں اور عوامی اسکیموں کی تشکیل و نفاذ میں بے حد معاون ثابت ہوں گے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس سے تمام سرکاری سماجی اور سیاسی امور میں شفافیت transparency لانے کے اُس عمل کو تقویت ملے گی جو ای گورننس، انفارمیشن ٹیکنالوجی اور مختلف شعبوں میں کمپیوٹرائزیشن سے پورے ملک میں زبردست پیمانے پر شروع ہو چکا ہے۔ یہ شفافیت ہی ہر طرح کے کرپشن کا حتمی علاج ہے، اور خوشی کی بات یہ ہے کہ ہر طرح کی سیاسی ہلچل اور شور شرابے کے باوجود قومی زندگی میں شفافیت لانے کا عمل مسلسل جاری ہے۔

امید ہے نیا سال ہماری قومی زندگی کے لیے ایک نیا سنگ میل ثابت ہوگا جہاں سے ہم سنہرے مستقبل کا ایک نیا سفر شروع کر سکیں گے۔

اسی امید کے ساتھ قارئین 'اردو دنیا' کو نیا سال بہت بہت مبارک ہو۔

آپ کی بات

الحاج شفیق احمد

استاد مدرسہ انوارالعلوم، رام نگر، ضلع بارہ بنکی (یوپی)

ماہنامہ 'اردو دنیا' دسمبر 2012 کے سرورق پر قومی اردو کونسل کے 14 ویں کل ہند اردو کتاب میلے کی شاندار تصویر کو دیکھتے ہی خوشی ہوئی۔ اردو زبان و ادب کے مسائل اور کونسل کی جانب سے فروغ اردو کے لیے کی جارہی کوششوں کے بارے میں مفید معلومات فراہم ہوئی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے چودھویں سالانہ اردو کتاب میلے کا لکھنؤ میں شاندار افتتاح وزیر مملکت برائے انسانی وسائل جناب جتن پرساد کے دست مبارک سے ہونا اور وزیر موصوف کے ذریعے اس بات کی یقین دہانی کرانا کہ کونسل کا سالانہ بجٹ 28 کروڑ سے بڑھا کر 45 کروڑ کر دیا جائے گا۔ اردو زبان کی ترقی اور اسے روزی روٹی سے جوڑنے میں کسی بھی قسم کی رکاوٹ نہیں آنے دی جائے گی۔ یہ سب

پڑھ کر خوشی حاصل ہوئی اس کے لیے وزیر موصوف مبارکباد کے مستحق ہیں۔ 6 نومبر تا 11 نومبر 2012 تک چلنے والے اس میلے کے مختلف پروگراموں کے بارے میں مفید معلومات فراہم ہوئی۔ کونسل نے کمپیوٹر کے ذریعے اردو زبان سیکھنے سکھانے کا جو طریقہ ڈھونڈھ نکالا ہے اس سے لوگ گھر بیٹھے اردو زبان آسانی سے سیکھ رہے ہیں۔ جدید پروگراموں کے ذریعے دیگر زبانوں کی طرح اردو زبان کی ترقی کا خواب بھی انشاءاللہ شرمندہ تعبیر ہوگا۔

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی

سابق ممبر راجیہ سبھا، نئی دہلی

حسن طباعت اور کتابت سے مزین 'اردو دنیا' کا نومبر 2012 کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کے گراں قدر اور معلوماتی مضامین سے کتنا زیادہ مستفید ہوا۔ اس فہرست میں جواہر لال نہرو پر مضمون سرفہرست تھا۔ وہ سیکولرازم اور جمہوریت کے علمبردار تھے۔ ساتھ ہی اردو کے زبردست شیدائی اور محسن تھے۔ اسی طرح ان کے بچپن پر خود ان کا مضمون 'بچوں کا ادب' اور مشاہیر ادب کے تحت قادرالکلام شاعر وحشت کلکتوی اور بجوہنزل واسوخت، ہندوستانی ادب میں دلت کہانیاں، ان مضامین کے اشاعت نہ صرف آنجناب بلکہ ان کے لکھنے والے خاص مضمون نگار بہت بہت مبارکباد کے مستحق ہیں۔ جوش ملیح آبادی کا مضمون بڑا دلچسپ ہے مگر یادوں کی برات لکھ کر انھوں نے اپنی ثقافت کو بری طرح مجروح کردیا ہے اس لیے اس پر اظہار خیال سے قاصر ہوں۔

شاداب اختر

ایم اے اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

'اردو دنیا' ماہ نومبر 2012 کا شمارہ موصول ہوا، گاہے بگاہے اس کا مطالعہ کرتا رہا ہوں اس میں سبھی مضامین اچھے ہیں، خاص طور سے اس شمارے میں ماجد قاضی کا مضمون بمبئی یونیورسٹی اور اردو تعلیم کے مسائل اور امکانات قابل ذکر ہے، انھوں نے صرف بمبئی یونیورسٹی کے کالجوں کا تجزیہ کرکے جو سوالات کھڑے کیے ہیں ایسی صورت حال تقریباً پورے ہندوستان میں ہے اردو کے مسائل پر سوچنا اور غور وفکر کرکے اس کا حل تلاش کرنا ہی اردو سے محبت و ہمدردی کا ثبوت ہے۔ جس کا مجھے گزشتہ کئی برسوں سے احساس تھا اس کا یقین ہوگیا کہ اردو سے طلبہ کی دلچسپی روز بروز کم ہوتی جارہی ہے، واقعی قاضی صاحب کے اس مضمون سے میرے خیال کی ترجمانی بھی ہوتی ہے۔ اردو ہماری مادری زبان ہے، اس کے بغیر ہندوستان کا کوئی شخص ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتا ہے، حسن اتفاق کہ اس شمارے میں پنڈت نہرو کی اردو سے محبت کا بھی ذکر ہے، اور بقول نہرو جی اردو ایک جاندار زبان ہے اس جملے میں جاندار کا لفظ اپنے معنی ومفہوم کے اعتبار سے بہت وسیع اور کشادہ ہے۔

ایم راگھو راؤ

ساؤتھ سول لائنس، چھندواڑا، مدھیہ پردیش

عارف مارہروی سے فیصل عارف کی گفتگو اچھی لگی۔ مارہروی نے جاسوسی ناولوں میں سماجی موضوعات کو بھی جگہ دی۔ حکیم احمد خان فاخر کو اردو و ہندی اور فارسی کے ساتھ عربی زبان پر بھی کامل عبور تھا۔ 'دیوان فاخر' میں اردو کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی کے اشعار بھی ملتے ہیں جو فنی اعتبار سے کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ فاخر کا عربی زبان میں شاعری کرنا ان کے امتیازی وصف کو ظاہر کرتا ہے۔ وحشت کلکتوی نے 'دیوان غالب' کا ایسی گہرائی سے مطالعہ کیا کہ ان کے کلام کی معنی آفرینی کا راز پالیا۔ اپنے تغزل کی سنجیدگی اور دلکشی فارسی ترکیبوں کے استعمال سے غالب اسکول کے نہایت کامیاب شاعر سمجھے جاتے ہیں۔

محمد اکرام الحق

184/10B، نکہت اپارٹمنٹ، گلی نمبر 5، غفار منزل، نئی دہلی

آپ کے موقر رسالے 'اردو دنیا' ماہ نومبر 2012 کی اشاعت میں علامہ خان بہادر رضا علی وحشت کلکتوی کے بارے میں جناب شبیر احمد کا مضمون 'وحشت کلکتوی شخصیت وفن' پڑھا۔ مضمون اچھا اور معلوم افزا ہے لیکن اس میں سہواً کچھ چھوٹ گیا ہے۔ جناب وحشت کی پیدائش 18 نومبر 1881 نہیں بلکہ 18 نومبر 1880 کی ہے۔ دیوان وحشت یعنی مرحوم کا پہلا مجموعہ کلام 1910 کی بجائے 1909 میں کلکتہ سے شائع کیا گیا۔ اُن کا دوسرا مجموعہ کلام 'ترانۂ وحشت' کے نام سے 1954 میں لاہور، پاکستان سے شائع کیا گیا۔ اُس وقت وہ کلکتہ (کولکاتا) مغربی بنگال سے ترک وطن کرکے ڈھاکہ (سابق مشرقی پاکستان اور موجودہ بنگلہ دیش) میں مقیم تھے۔ وہیں 20 جولائی 1956 میں ان کا انتقال ہوا۔ سعید ملیح آبادی کی ادارت میں کلکتہ سے شائع روزنامہ 'آزاد ہند' کے ہفتہ وار'اجالا' کی پانچ اگست 1956 کی اشاعت میں جناب وحشت کلکتوی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ایک مضمون چھپا تھا جس میں مندرجہ بالا معلومات تھیں۔ ان کے انتقال کے وقت میں تقریباً دس سال کا تھا اور کلکتہ کے مومن ہائی اسکول میں درجہ ششم کا طالب علم تھا۔ میں نے ان کی قلمی تصویر اور معلومات کا وہ حصہ کاٹ کر اپنی ذاتی ڈائری میں چسپاں کردیا تھا جو آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ اس خط کے ساتھ اس کی فوٹو کاپی بھی بھیج رہا ہوں۔

مجھے امید ہے کہ آپ میرا خط اور مذکورہ معلومات مع قلمی تصویر کے اپنے رسالے کی آئندہ اشاعت میں ضرور شائع کریں گے تاکہ سند رہے اور سہو کا ازالہ ہوجائے۔ میں اس کے لیے آپ کا شکرگزار رہوں گا۔

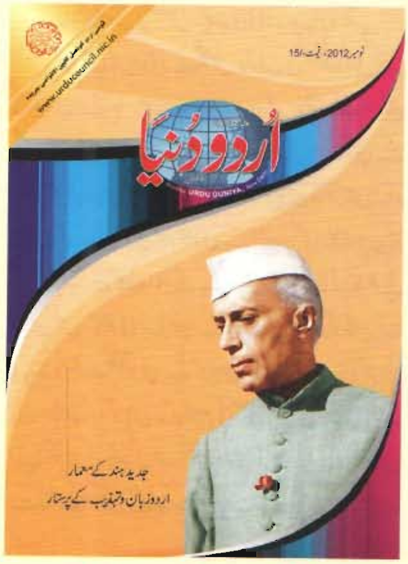

ڈاکٹر محمد وسیم خان

ریل پار، او کے روڈ، آسنسول 2

نومبر 2012 شمارہ دیکھا، کافی اچھا لگا۔ جس طرح سے آپ لوگوں نے اردو دنیا کو مختلف موضوعات کے مضامین سے سجایا ہے ماشاء اللہ ایک ادب کا گلدستہ محسوس ہوتا ہے۔ سبھی مضامین کافی دلچسپ اور معلوماتی ہیں۔ 'ہماری بات' پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوا جیسے یہ میرے ذاتی خیالات ہیں۔ کور اسٹوری میں شامل مضمون 'اردو اور پنڈت نہرو'، 'میرا دوست نہرو' اور 'میرا بچپن' کافی معلوماتی اور دلچسپ ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ یہ تمام مضامین دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ جب تک اس طرح کے رسالے منظر عام پر آتے رہیں گے اردو ادب کا مستقبل تابناک رہے گا۔

رضوانہ ارم

صدر شعبۂ اردو، جمشید پور ویمنس کالج

جدید ہند کے معمار اردو زبان و ادب جو گنگا جمنی تہذیب کی علمبردار ہمیشہ سے رہی ہے، کے پرستار جواہر لال نہرو کی یوم پیدائش کے موقعے پر سرورق اور ادارتی تحریر نے اس رسالے کی قدر و قیمت میں مزید اضافے کیے ہیں۔ کور اسٹوری کے عنوان سے جواہر لال نہرو کی شخصیت اور علمی و سیاسی قدر و قیمت کے متعلق مضامین سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ ادبی مباحث کا گوشہ نئے عنوانات و موضوعات سے ہمیشہ کی طرح مزین ہے۔ مشاہیر ادب کے حوالے سے سجاد ظہیر کی معرکۃ الآرا ادبی حیثیت اور ترقی پسند تحریک کے معمار کی حیثیت سے ان کی خدمات کا اعتراف اس رسالے کا ایک اہم جز ہے۔ ہجو و ہزل اور واسوخت ایک عمدہ اور معلوماتی مقالہ ہے۔ حیدرآبادی ڈھولک کے گیت سے متعلق مصنف کی تحقیق و جستجو لائق ستائش ہے۔ جدید علوم و فنون ٹیکنیک اور جدید ترین سائنس سے باشعور ذہن و دل کو مزید تر و تازہ کیا جانا اردو دنیا کے ہر شمارے کا خاصہ رہا ہے۔ آپ نے کوزے میں معلومات کا ایک بحر بیکراں سمو دیا ہے۔

مجیب سید

مبین کا بیج، منکرنا بائی کالونی، اکولہ، مہاراشٹر

اکتوبر کا رسالہ میرے ہاتھ میں ہے۔ سارے مضامین بہترین ہیں اتنا خوبصورت اور معلومات سے بھرپور رسالہ نکالنے کے لیے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں دعا ہے کہ 'اردو دنیا' بہت ترقی کرے اور آپ کی عمر بھی دراز کرے۔ تاکہ آپ اردو کی اسی طرح خدمت کرتے رہیں۔

ڈاکٹر ٹی آر رینا

ایف 237، لوئر ہری سنگھ نگر، رہاڑی کالونی جموں

سہ ماہی 'فکر و تحقیق' اور 'اردو دنیا' کے شمارے مسلسل پہنچ رہے ہیں۔ سعادت حسن منٹو کے صد سالہ یوم پیدائش پر فکر و تحقیق کا خصوصی شمارہ شائع کرکے آپ نے ثابت کردیا کہ اردو، زبان کسی سرحد میں مقید نہیں کی جاسکتی۔ اسے ہمیں گنگا، جمنی اور سندھ تہذیب کی مشترکہ زبان کہنا چاہیے۔ ملکی تقسیم کی فرضی لکیر اس زبان کا کچھ نہیں بگاڑ سکی۔ اقبال، فیض، جوش ملیح آبادی اور سعادت حسن منٹو جیسی ادبی شخصیات پر ہندوستان بھر میں سیمینار، ادبی تقریبات اور یوم پیدائش منائے جاتے ہیں۔ یہاں تک ہی بس نہیں بلکہ ان شخصیات کے نام سے یہاں ادبی ادارے بھی قائم کیے جاتے ہیں۔ یہ ملک جتنا کثیر المذہب ہے اُتنا ہی وسیع القلب بھی ہے۔

ہلال احمد ہدایت اللہ

کونکٹی (صدیق نگر) سدھارتھ نگر یوپی

اکتوبر 2012 کا شمارہ ابھی ہاتھوں میں ہے۔ شمارے کے پہلے صفحے پر مہاتما گاندھی کا خط جو انھوں نے 9 جون 1938 کو بھائی محمد حسین صاحب کو لکھا تھا اس کو پڑھا۔ دیوان حنان خان کا لکھا ہوا مضمون 'مولانا ابوالکلام آزاد کے تعلیمی نظریات' بے حد پسند آئے۔ منتظر قائمی کا 'گاندھی جی اور ہندوستان' کو بھی بغور پڑھا۔ ان کے علاوہ تمام مشمولات قابل تعریف ہیں۔

معین الدین شمسی

حاجی جمیل احمد روڈ، بھنڈاری ڈیہہ، گریڈیہہ

'اردو دنیا' اکتوبر 2012 کا مجلہ اپنی ساری خوبصورتیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہوا۔ ان کے جملہ مشمولات دلچسپ، مفید اور پراز معلومات ہیں۔ سرورق پر 'مہاتما گاندھی اور اردو' کی تصویر وہ بھی مورخہ 9 جون 1938 کا لکھا خط 'بھائی محمد حسین کے نام' جس میں ڈاکٹر علامہ اقبال کی نظم 'ہندوستاں ہمارا' کا تذکرہ مہاتما گاندھی نے جس انداز سے کیا ہے دیکھ کر از حد مسرت ہوئی۔ بلاشبہ 'اردو دنیا' کا ہی مرہونِ منت ہے کہ آج اردو سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے بہتر وسائل و مواقع موجود ہیں۔ اکادمیاں اور دوسرے ادارے موجود ہیں، اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں موجود ہیں۔ خواجہ محمد اکرام الدین صاحب، مبارکباد کے مستحق ہیں جو 'اردو دنیا' کو انہماک سے نکھارنے میں لگے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج آندھرا پردیش، مہاراشٹر، مغربی بنگال حتیٰ کہ کیرلہ جیسے غیر اردو علاقوں میں بھی اردو تیزی سے پھل پھول رہی ہے۔ شاد عارفی کا انتخاب کلام، جے اے کلکرنی کا باؤلا' (مراٹھی کہانی) ترجمہ: سلام بن رزاق اور مجتبیٰ حسین کا انٹرویو از حد متاثر کن ہیں۔ مجتبیٰ حسین نے

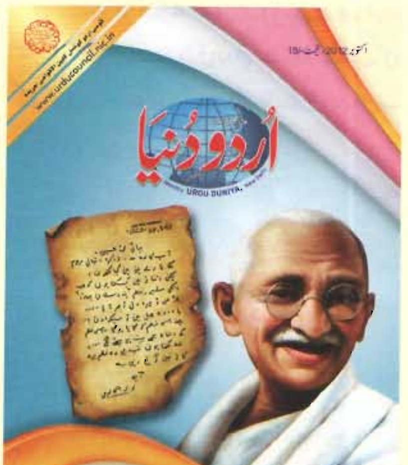

قلم کاروں کو پیغام دیا ہے وہ لکھنے والوں کے لیے مشعل راہ سے کم نہیں۔ کہتے ہیں کہ "قلم کار کو اپنے موضوع میں ڈوب جانا چاہیے۔ آپ جب تک موضوع کا از خود حصہ نہیں بن جاتے۔ آپ کی تحریر میں وہ جان پیدا نہیں ہوتی جو قارئین کو آپ کی تحریر سے جوڑ دے۔"

شمیم خاں راہی

مکھو محلہ، آسنسول

تازہ شمارہ زیر مطالعہ ہے۔ تمام مشمولات پسند آئے۔ شکریہ! سال نو کی آمد پر 'اردو دنیا' کے ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین اور تمام اراکین کو تہہ دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ ساتھ ہی قلم کاروں اور قاری حضرات کو بھی مبارکباد۔

نصرت ظہیر

اردو کی ترویج و ترقی کے ہم سفر

اردو کے سب سے پہلے ہندوستانی ٹی وی چینل ، ای ٹی وی اردو کی شروعات کو دس سال سے اوپر ہوچکے ہیں اور اس عرصے میں اس نے اپنی خاص جگہ بنالی ہے۔

اردو روزنامہ راشٹریہ سہارا جو دس بارہ سال پہلے دو تین شہروں سے چھپتا تھا اب ملک کے طول و عرض میں دس شہروں سے شائع ہونے والا دنیاکا سب سے بڑا اردو اخبار بن چکا ہے۔

ممبئی کانصف صدی سے پرانا مشہور اخباراردو روزنامہ انقلاب ، جو 1986میں شمالی ہند میں مختصر وقفے کے لیے اپنی جھلک دکھا کر واپس ممبئی چلا گیا تھا ، اب دہلی اور لکھنؤمیں بڑی شان سے جم گیا ہے اور شمالی ہندوستان کے اہم ترین اردو اخباروں میں گنا جانے لگا ہے۔

دنیا بھر میں اردو کی سب سے پرانی تنظیم، انجمن ترقی اردو (ہند) اب تقریباً ایک سو دس سال پرانی ہوچکی ہے۔

ان چاروں موقراردو اداروں کی قدر مشترک یہ ہے کہ ان میں اب نیا خون دوڑرہاہے اور ان کی قیادت اردو کی اس نئی نسل کے ہاتھوں میں آگئی ہے جو بیسویں صدی کے اواخر میں جوان ہوئی اور موجودہ صدی کے آغازمیں منظر عام پر آئی ہے۔ راجیش رینا، سید فیصل علی، شکیل شمسی اور ڈاکٹر اطہر فاروقی (علی الترتیب) ان اداروں کو نئی سوچ اورنئے ویژن کے ساتھ چلانا چاہتے ہیں،جو بحیثیت مجموعی اردو زبان کی ترقی کے عمل کے لیے ایک خوش گوار تبدیلی کا اشارہ ہے۔ اردو زبان اور اردو میڈیا کو نئی جہتوں سے روشناس کرانے اور ملک کی اس شاندار اور جاندار زبان کو بدلتے وقت کے بدلتے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوششوں میں مصروف اس نئی نسل کے ذہن کو ٹھیک سے سمجھنے اور اس کی استطاعت کا اندازہ لگانے کے لیے ان چاروں جواں سال شخصیتوں کے مختصر انٹرویو پیش کر رہے ہیں۔ پیش خدمت ہیں نصرت ظہیر کی ان حضرات سے کی گئی گفتگو کے اہم اقتباسات: ادارہ

ویزوئل میڈیا اور پرنٹ میڈیا میں اردو کا مستقبل تابناک ہے

راجیش رینا

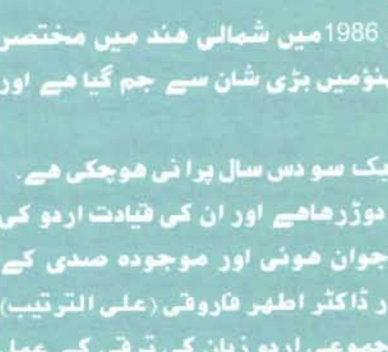

راجیش رینا
ایڈیٹرنیٹ ورک ای ٹی وی گروپ

نصرت ظہیر: ای ٹی وی اردو ہندوستان میں اردو کا پہلا باقاعدہ ٹی وی چینل ہے اور اسے اب دس سال سے اوپر ہوگئے ہیں۔ اس گروپ کے مختلف زبانوں میں کئی ٹی وی چینل پہلے سے موجود تھے۔ اردو میں نسبتاً کم منافع بخش چینل شروع کرنے کا خیال کیوں آیا؟

راجیش رینا: ای ٹی وی گروپ کے بانی جناب راموجی راؤ کو ہمیشہ کچھ نیا کرنے کا جنون ہے۔ حیدرآباد سے شائع ہونے والے تلگوروزنامہ 'ایناڈو' کے بانی ایڈیٹر کی حیثیت سے راموجی راؤ نے ہر ضلع سے اخبار کا ایڈیشن شروع کیا، تاکہ مقامی خبروں کوزیادہ سے زیادہ جگہ دی جاسکے۔ آج قومی سطح پر اس کی نقل کی جارہی ہے۔ جب ای ٹی وی کی شروعات ہوئی تو تلگو کے بعد مراٹھی، بنگالی اور کنڑچینل مرحلے وار طور پر شروع کیے گئے۔ راموجی راؤ کو اردو کی شیرینی اور دنیا بھر میں اُس کی مقبولیت کا اندازہ تھا۔ چونکہ ان کا تعلق فلمی دنیا سے بھی ہے، اس لیے وہ فلموں میں ہندی کے نام پر استعمال ہونے والی اردو سے اچھی طرح واقف تھے، اوراسی لیے وہ اردو کا مکمل ٹی وی چینل کھولنے کا خواب دیکھ رہے

تھے۔ لیکن بعض حلقے انھیں اس سے باز رکھنے کی کوشش کررہے تھے۔ اُن کی دلیل تھی کہ ملک میں کسی بھی میڈیا گروپ نے مکمل اردو چینل کے تعلق سے سوچا بھی نہیں۔ چنانچہ جس طرح ایک دو چینل اردو کے دو بلیٹن ٹیلی کاسٹ کرتے ہوئے اردو کی خدمت کررہے ہیں اُسی طرح ای ٹی وی کے دیگر چینلوں پر اردو کے بلیٹن ٹیلی کاسٹ کیے جائیں تو ٹھیک رہے گا۔ انھوں نے مارکیٹنگ اور اشتہارات نہ ملنے کے جواز بھی پیش کیے کیونکہ کسی بھی چینل کی زندگی کے لیے اشتہار ضروری ہیں۔ لیکن راموجی راؤ ہر طرح کا چیلنج قبول کرنا جانتے ہیں۔ 15، اگست 2001 کو راموجی راؤ کا دیرینہ خواب شرمندہ تعبیر ہوا اور اردو کا پہلا بین الاقوامی چینل شروع ہوگیا۔ اس کا افتتاح شہنشاہ جذبات دلیپ کمار نے کیا تھا۔

ن ظ : گزشتہ دس برسوں میں اردو کے اور بھی کئی ٹی وی چینل شروع ہوئے ہیں۔ ان میں ای ٹی وی اردو کی موجودہ ویورشپ Viewership کیسی ہے؟

راجیش رینا: ای ٹی وی اردو کے آنے کے بعد دیگر میڈیا اداروں نے بھی اردو کا علاحدہ چینل لانے کی کوشش کی، لیکن وہ کتنے کامیاب ہوئے یہ سبھی جانتے ہیں۔ اردو کے نام سے جو چینل چل رہے ہیں اُن پر یا تو صرف مذہبی پروگرام پیش ہوتے ہیں یا تفریحی۔ ای ٹی وی اردو ایک ایسا چینل ہے جس پر مذہبی پروگراموں کے علاوہ خبریں، حالات حاضرہ اور تفریحی پروگرام پیش کیے جاتے ہیں جس کی وجہ سے چینل کی Viewership میں دن بہ دن اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ یہ چینل نہ صرف ہندوستان میں بلکہ ہندوستان سے باہر 52 ممالک میں دیکھا جاتا ہے۔

ن ظ : آپ کے کن پروگراموں نے زیادہ مقبولیت حاصل کی ہے؟

راجیش رینا: یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ کون سا پروگرام مقبول ہے۔ کیونکہ چینل پر نشر ہونے والے تقریباً تمام پروگرام منفرد ہوتے ہیں۔ اسی لیے ہر پروگرام کی اپنی اہمیت ہے۔ اگر ہم خبروں کی بات کریں تو بین الاقوامی خبروں پر مشتمل عالمی منظر، اردو اور اقلیتوں سے جڑی خبروں کا احاطہ کرنے والا پروگرام 'خاص بات' کے علاوہ جموں کشمیر کے کونے کونے کی خبریں پہنچانے والا 'کشمیر بلیٹن' بہت زیادہ مقبول ہے۔ اس کے علاوہ قومی کونسل کے اشتراک سے پیش کیا جانے والا پروگرام 'اردو دنیا' بھی مقبولیت کی بلندی سر کرتا جارہا ہے۔ دیگر پروگراموں میں نت نئے پکوان کے طریقے بتانے والا 'عکس رسوئی' اور اسلامی مہینوں کی مناسبت سے پیش ہونے والے مذہبی پروگرام ناظرین خوب پسند کرتے ہیں۔ مذہبی پروگراموں میں ماہ رمضان کے دوران مکۃ المکرّمہ سے نماز تراویح کا راست ٹیلی کاسٹ، سحر اور افطار کے وقت خصوصی سوال جواب پر مبنی پروگرام، اور محرم کے مہینے میں ملک کے مختلف مقامات پر ہونے والی مجالس کو ٹیلی کاسٹ کیا جاتا ہے۔ اس طرح ناظرین کو ایک ہی چینل پر ہر قسم کے پروگرام مل جاتے ہیں۔

ن ظ : لوگوں کا خیال ہے آپ کے پروگراموں میں اب ادب کا حصہ پہلے سے کافی کم ہوگیا ہے اور اس میں بھی مشاعرے دکھانے پر آپ زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ آپ کا کیا کہنا ہے؟

> ویزوئل میڈیا اور پرنٹ میڈیامیں اردو کا مستقبل تابناک ہے۔کیونکہ لاکھ دعووں کے باوجود فلموں میں ڈائیلاگ اور نغموں کے بول اردوکے ہی ہوتے ہیں۔ آج کل ایف ایم ریڈیو بھی مقبول ہورہے ہیں، ریڈیو پر پیش ہونیوالے بیش ترپروگراموں میں اردو اشعار کا ہی سہارا لیا جاتاہے، اوراُردو زبان کی شیرینی ہر ایک کے دل کوچھو لیتی ہے۔ ہاں ضرورت ہے رسم الخط کو بچانے کی۔ آج کا نوجوان اردو سے دور ہوتا جارہا ہے، کیونکہ ایک خیال یہ ہے کہ اردو روزگار فراہم نہیں کرسکتی، لیکن ای ٹی وی، اور قومی کونسل برائے فروغ اردوزبان نے اس کو غلط ثابت کردیا ہے۔

راجیش رینا: نہیں ایسا نہیں ہے۔ ادبی سرگرمیوں کا ہم خاص طور سے خیال رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً ادبی محفل، اردو کانفرنس، اور ادبی شخصیات پر آدھے آدھے گھنٹے کے خصوصی پروگرام پیش کرتے ہیں۔ رہی مشاعرے کی بات تو سب اس سے واقف ہیں کہ مشاعرے بلالحاظ مذہب وملت ہر عمر کے لوگ پسند کرتے ہیں۔ ہندوستان کے علاوہ دنیا بھر میں مختلف مقامات پر منعقدہ مشاعرہوں کو دیکھنا اور شاعروں کو سننا سب کو اچھا لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان، پاکستان اور خلیجی ممالک کے علاوہ مختلف ممالک میں اردو جاننے والے ناظرین ای ٹی وی اردو پر ٹیلی کاسٹ ہونے والے مشاعروں کا بے صبری سے انتظار کرتے ہیں۔

ن ظ : آپ کی نیوز سروس اچھی ہے اور اردو سماج کے سیاسی وسماجی مسائل کی خبریں آپ کے یہاں دوسرے ٹی وی چینلوں کے مقابلے میں زیادہ تفصیل سے مل جاتی ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ مستقبل میں ای ٹی وی اردو کا ایک علاحدہ نیوز چینل شروع ہوجائے؟

راجیش رینا: ہماری نیوز سروس اچھی ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے نمائندے ہندوستان کے نہ صرف شہروں میں بلکہ ہر ایک گاؤں میں موجود ہیں۔ ہندوستان سے باہر کی خبروں کے لیے مشہور نیوز ایجنسیوں کی خدمات لی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے پاس کونے کونے کی خبریں پہنچتی ہیں۔ اب رہا سوال اردو کا علاحدہ نیوز چینل شروع کرنے کا تو فی الوقت ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ ویسے چینل پر خبروں کے لیے ہی زیادہ وقت دیا جاتا ہے۔

ن ظ : ویزوئل میڈیا میں اردو کا مستقبل آپ کو کیسا نظر آتا ہے؟

راجیش رینا: ویزوئل میڈیا اور پرنٹ میڈیا میں اردو کا مستقبل تابناک ہے۔ کیونکہ لاکھ دعووں کے باوجود فلموں میں ڈائیلاگ اور نغموں کے بول اردو کے ہی ہوتے ہیں۔ آج کل ایف ایم ریڈیو بھی مقبول ہورہے ہیں، ریڈیو پر پیش ہونیوالے بیش تر پروگراموں میں اردو اشعار کا ہی سہارا لیا جاتا ہے، اور اُردو زبان کی شیرینی ہر ایک کے دل کو چھو لیتی ہے۔ ہاں ضرورت ہے رسم الخط کو بچانے کی۔ آج کا نوجوان اردو سے دور ہوتا جارہا ہے، کیونکہ ایک خیال یہ ہے کہ اردو روزگار فراہم نہیں کرسکتی، لیکن ای ٹی وی، اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اس کو غلط ثابت کردیا ہے۔ اردو زبان جاننے والے آج ہر شعبے میں روزگار حاصل کرسکتے ہیں۔

ن ظ : کچھ اپنے بارے میں بھی بتائیں، اردو میڈیا میں کیسے آنا ہوا اور اب کیسا محسوس کرتے ہیں؟

راجیش رینا: میرا تعلق کشمیر سے ہے۔ میں نے جرنلزم میں ایم اے کیا ہے۔ اردو زبان کی شیرینی سے میں بچپن سے ہی واقف ہوں، حالانکہ میری پڑھائی انگلش میڈیم سے ہوئی ہے، لیکن میں اردو لکھنا پڑھنا جانتا تھا۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ ریڈیو اور دوردرشن پر کام کرنے کا موقع ملا یہیں سے میری اردو مزید بہتر ہوئی۔ کشمیر کے نامساعد حالات کے باعث وادی چھوڑنا پڑا۔ لیکن اردو سے ناتا نہیں چھوٹا۔ تقریباً دس سال پہلے ای ٹی وی اردو کے ساتھ جڑا ہوں۔ یہاں بھی مجھے اردو کی خدمت کا موقع ملا۔ میں نے کبھی بھی اردو کو اپنے سے جدا نہیں کیا۔ فی الحال میں ای ٹی وی گروپ کے نیٹ ورک ایڈیٹر کی حیثیت سے گروپ کے دس چینلوں کے Editorial content کا ذمہ دار ہوں۔ ◘

سید فیصل علی
ہیڈ اردو ایڈیٹوریل افیرس اینڈ عالمی سہارا ٹی وی

اردو کو نصاب تعلیم میں بنیادی اہمیت دی جائے اور اسے روزگار سے جوڑا جائے

سید فیصل علی

نصرت ظہیر: آپ ایک ایسے اردو روزنامے کے سربراہ ہیں جس نے اردو صحافت کی نئی تاریخ مرتب کی ہے۔ آج روزنامہ راشٹریہ سہارا اردو دنیا کا واحد اخبار ہے جو ایک ساتھ دس شہروں سے شائع ہوتا ہے اور جس کا ملک میں سب سے بڑا ترسیلی نیٹ ورک ہے۔ اتنے بڑے اردو اخبار سے وابستگی پر کیسا محسوس کرتے ہیں۔

سید فیصل علی: بلاشبہ روزنامہ راشٹریہ سہارا اردو دنیا کا ایک بڑا اخبار ہے جس کی کارکردگی قابل تعریف ہے۔ اس کا حال بھی اچھا ہے اور مستقبل بھی نہایت تابناک ہے۔ اس اخبار سے وابستگی میرے لیے اس لیے بھی خوشگوار ہے کہ مجھے اس کے ذریعے نہ صرف ملک وملت بلکہ اردو زبان کی خدمت کا بھی زریں موقع ملا ہے۔ سہارا انڈیا پریوار اور اس کے سرپرست اعلیٰ سہارا شری نے اردو زبان کے فروغ کی جو تحریک شروع کی ہے اس سے وابستگی پر مجھے خوشی بھی ہے اور اس تحریک کو نتیجہ خیز بنانے کے لیے میں پرعزم بھی ہوں۔

ن ظ: بہت سے اردو والے اب بھی یہ مانتے ہیں کہ اردو صحافت گھاٹے کا سودا ہے۔ سہارا انڈیا پریوار اس بارے میں کس طرح سوچتا ہے۔ کیا روزنامہ راشٹریہ اس کے لیے گھاٹے کا سودا ثابت ہوا ہے؟

فیصل علی: ہندوستان میں اردو زبان کو ان لوگوں نے بھی بہت نقصان پہنچایا ہے جنھوں نے اسے تجارت سے جوڑنے کی کوشش کی۔ جہاں تک سہارا انڈیا پریوار کی بات ہے تو اس نے کسی فائدے یا نقصان کے خیال سے اوپر اٹھ کر اردو زبان کی خدمت کا بیڑا اٹھایا اور اس بات کو بھی ثابت کیا کہ اردو زندہ زبان ہے اور اس کی خدمت کبھی گھاٹے کا سودا ثابت نہیں ہوسکتی۔ ہندوستان خاص طور پر اتر پردیش سے جب اردو زبان ختم ہوتی جارہی تھی اور اردو والوں نے ہی اردو کو گھاٹے کا سودا تسلیم کر لیا تھا، ان حالات میں سہارا انڈیا پریوار نے روزنامہ راشٹریہ سہارا کو نہ صرف جاری کیا بلکہ اس کی ایسی بے نظیر سرپرستی کی جس کی مثال اردو صحافت کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ روزنامہ راشٹریہ سہارا نے روز اول سے ہی نہ صرف اردو کی آبیاری کا فرض ادا کیا بلکہ ملک وملت کے مسائل کو اپنا ایجنڈا بنایا۔ ویسے روزنامہ راشٹریہ سہارا تجارتی نقطہ نظر سے بھی کبھی گھاٹے کا سودا نہیں رہا۔ ہندوستان میں اردو کی طرف مختلف تجارتی وصحافتی گھرانوں نے جو خصوصی توجہ دی اور متعدد اردو کے اخبارات، نیوز چینل اور اردو نیوز ایجنسیاں قائم ہوئیں اس کے پیچھے بھی روزنامہ راشٹریہ سہارا اور سہارا انڈیا پریوار کے سرپرست عالی جناب سہارا شری سبرت رائے سہارا کے خلوص نیت اور جدوجہد کا بڑا دخل ہے۔

ن ظ: روزنامہ راشٹریہ سہارا ملک کے چاروں گوشوں، شمال، جنوب، مغرب اور مشرق کے مختلف شہروں سے شائع ہورہا ہے لیکن وسطی ہندوستان ابھی تک اس کے نقشے پر نہیں آیا ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟

فیصل علی: بلاشبہ روزنامہ راشٹریہ سہارا کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہ ہندوستان کا واحد اردو روزنامہ ہے جو ملک کے مختلف علاقوں سے شائع ہوتا ہے۔ جہاں تک دوسرے شہروں کی بات ہے تو ہم بتادیں کہ ہم جلد ہی بھوپال، ہبلی، دھارواڑ، وارانسی اور سری نگر سے روزنامہ راشٹریہ سہارا کے ایڈیشن شائع کرنے جارہے ہیں۔

ن ظ: روزنامہ 'قومی آواز' کے مدیر آنجہانی موہن چراغی کے بعد آپ شاید دوسرے صحافی ہیں جو انگریزی سے اردو میں آئے ہیں۔ اردو میں کیسا لگ رہا ہے؟

فیصل علی: میرا تعلق گرچہ انگریزی صحافت سے رہا ہے اور ڈیڑھ دہائی سے زائد عرصہ تک میں عرب ممالک کے مشہور انگریزی اخبار 'عرب نیوز' سے وابستہ رہا لیکن میرا مزاج ہمیشہ وہی رہا جو اردو اخبارات لکھتے اور سوچتے رہے ہیں۔ میں ہمیشہ مسلم مسائل پر غور کرتا رہا ہوں اور اردو کے فروغ کی جدوجہد سے میں کبھی غافل نہیں رہا۔ اردو صحافت سے وابستگی پر مجھے خوشگوار احساس ہورہا ہے اور میں اردو صحافت کے ذریعے ملک وملت کی خدمت کے لیے پرعزم ہوں۔ جہاں تک موہن چراغی کی بات ہے تو وہ بڑی شخصیت کے مالک تھے ان کا موازنہ مجھ سے نہیں کیا جاسکتا، وہ ہمیشہ اردو اور مسلم مسائل پر لکھتے رہے، ان کا میں ہمیشہ قدرداں رہا ہوں۔

ن ظ: انگریزی اور اردو دونوں کی صحافت اب آپ کے سامنے ہے۔ انگریزی اخبارات میں ایسا کیا ہے جو اردو کے اخباروں میں نہیں پایا جاتا اور جسے آپ عملی طور پر روزنامہ راشٹریہ سہارا میں متعارف کرانا چاہیں گے؟

فیصل علی: بلاشبہ انگریزی اخبارات کے تجربات وتکنیک سے اردو اخبارات کو فائدہ اٹھانا چاہیے اور اس سمت میں میں نے کئی اقدامات کیے بھی ہیں۔ لیکن عام طور پر انگریزی اخبارات سے اردو قارئین مرعوب رہتے ہیں جب کہ روزنامہ راشٹریہ سہارا جیسے اردو اخبارات کسی بھی انگریزی اخبار سے کم اہمیت کے حامل نہیں۔ مستزاد یہ کہ مسلمانوں کے مسائل جن پر انگریزی اخبارات توجہ نہیں دیتے اس پر روشنی ڈالنے کے لیے اردو اخبارات کے علاوہ کوئی ذریعہ نہیں ہے۔

ن ظ: سہارا پریوار آج اردو کا سب سے بڑا اشاعتی گھرانہ سمجھا جاتا ہے۔ روزنامے کے علاوہ ماہنامہ 'بزم سہارا' ہفت روزہ 'عالمی سہارا' پابندی سے شائع ہورہے ہیں۔ ان رسائل کو مزید ترقی دینے کے لیے بھی کچھ نئے منصوبے آپ کے ذہن میں ہیں؟

فیصل علی: سہارا انڈیا پریوار ہندوستان میں پہلا کارپوریٹ گھرانہ ہے جس نے مختلف میدانوں میں ملک کی خدمت کے ساتھ ساتھ اردو کے اخبارات وجرائد کی سرپرستی کو اپنے اولین ایجنڈے میں شامل رکھا ہے۔ روزنامہ راشٹریہ سہارا کے کثیر ایڈیشن ہفت روزہ عالمی سہارا، ماہنامہ بزم سہارا، اردو نیوز چینل 'عالمی سہارا' اور ایک مضبوط اردو ویب سائٹ ملک وملت اور اردو زبان کی غیرمعمولی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ میں اس عظیم خدمت کو مزید بامعنی، مفید اور دوررس نتائج کا حامل بنانا چاہتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ ہماری تمام اردو اشاعتوں کو حکومت، عوام اور ارباب حل وعقد نہ صرف پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھیں گے بلکہ ہماری کوشش ہے کہ اس کے مشمولات، تجاویز اور مطالبات کو ملک

اورملک میں بسنے والے اردو حلقوں کے مطالبات سمجھ کر حکومتیں بھی اپنی پالیسی بنائیں۔

ن ظ : سہارا پریوار کا اردو نیوز چینل 'عالمی سہارا' بھی آپ کی نگرانی میں ہے۔ اس کی موجودہ صورتحال اور مستقبل کے عزائم کے بارے میں کچھ بتائیے۔

فیصل علی: سہارا انڈیا پریوار کے اردو نیوز چینل 'عالمی سہارا' کے ناظرین کی تعداد میں بھی روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ چینل میں بہتر مواد،خبروں کے انتخاب اور اردو زبان وکلچر سے متعلقہ پیش کش پر بھی خصوصی توجہ دے رہا ہوں۔ اسی ہفتے سے کشمیر پر خصوصی پروگرام پیش کیا جائے گا۔ دوسری طرف عالمی سہارا نیوز چینل کو عام مسلمانوں کے گھروں تک پہنچانے کی سمت میں کافی پیش رفت ہوئی ہے اور مزید کوششیں جاری ہیں۔ ہم نے ملک کے کثیر مسلم آبادی والے پچاس شہروں کا انتخاب کیا ہے جہاں اس چینل کی پہنچ جلد ہی ہوجائے گی۔ مجھے یقین ہے عالمی سہارا چینل کسی بھی ہندی اور انگریزی چینل سے کمتر نہیں رہے گا۔

ن ظ : ملک میں اردو زبان کی ترقی وترویج کے لیے جو کچھ ہورہا ہے وہ آپ کی نظر میں ہے۔ آپ کے خیال میں ایسا کیا ہے جو ابھی تک نہیں ہوا اور جو آپ سمجھتے ہیں کہ فوراً یا ضرور ہونا چاہیے۔

فیصل علی: ہندوستان میں اردو کی ترقی کے لیے حکومت کی سطح پر بھی کافی کام ہورہا ہے اور عوامی سطح پر بھی اس زبان کی آبیاری کی کوششیں کافی تیز ہوئی ہیں لیکن ابھی تک گنگا جمنی تہذیب کی علمبردار اس زبان کو اس کا واجب حق نہیں مل پایا ہے۔ یہ زبان صرف حکومت کے سہارے ترقی نہیں کرسکتی اور نہ ہی صرف عوامی کوششوں پر انحصار کیا جاسکتا ہے،ضرورت اس بات کی ہے کہ اس زبان کو نصاب تعلیم میں بنیادی اہمیت دی جائے، اسے روزگار سے جوڑا جائے اور اردو زبان کی ترقی کے لیے جملہ ضروری اقدامات کیے جائیں۔ لیکن عوام پر بھی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم دینے پر بضد ہوں اور اردو اداروں سے ہر ممکنہ تعاون کریں۔ ہندوستان میں کئی سرکاری اردو ادارے ہیں لیکن 'قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان' نے جو غیر معمولی خدمت انجام دی ہے وہ قابل قدر ہے، میری تو خواہش ہے کہ قومی کونسل کو اقلیتوں کی ترقی سے متعلق دیگر منصوبوں کی بھی ذمہ داری سپرد کردی جانی چاہیے، کیونکہ تجربات سے ثابت ہوا ہے کہ اقلیتی ترقیاتی اسکیموں کو بہتر کرنے کے لیے جتنے زیادہ ہاتھوں سے ہوکر گزارا جاتا ہے ان کے نفاذ میں اتنی ہی تاخیر اور تساہلی ہوتی جاتی ہے۔ این سی پی یو ایل جیسے خود مختار ادارے اقلیتوں کی فلاح و بہبود کے لیے زیادہ بہتر کام کرسکتے ہیں۔ ■

اردو صحافت کبھی گھاٹے کا سودا نہیں تھی

شکیل حسن شمسی

نصرت ظہیر: روزنامہ انقلاب کا ملک کے سب سے بڑے ہندی اخبار گروپ جاگرن سے جڑنا بلاشبہ اردو صحافت کے تعلق سے ایک بڑا واقعہ تھا۔ اتنے بڑے ہندی گروپ کو اردو صحافت میں جانے کا خیال کس لیے آیا۔

شکیل شمسی: جاگرن گروپ نے مڈ ڈے انفو میڈیا نام کی کمپنی کو خریدا تھا۔ یہ کمپنی مڈ ڈے انگریزی، گجراتی اور ہندی میں نکالتی تھی اور انقلاب بھی اس کے پبلی کیشن میں شامل تھا۔ جاگرن نے صرف انقلاب کو نہیں خریدا تھا۔ مڈ ڈے انفو میڈیا خریدنے کے بعد جاگرن نے ہندی کا ایک اور مشہور اخبار نئی دنیا بھی خرید لیا ہے۔ جاگرن ہندوستانی زبانوں کو فروغ دینا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پنجابی زبان میں بھی جاگرن نکلنا شروع ہو چکا ہے۔ یہ افتخار ہندوستانی قوم کو حاصل ہے کہ یہاں اردو کے دو بڑے اخبار دو بڑے کاروباری گھرانے نکال رہے ہیں اور اردو کے تین چینل بھی بڑے کارپوریٹ گروپ ہی چلا رہے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے لوگوں کو بلاقید مذہب وملت اردو سے کس قدر محبت ہے۔

ن ظ: ممبئی کے علاوہ دہلی اور دیگر مقامات سے اس اخبار کی اشاعت کو اب دو سال سے زائد ہو چکے ہیں۔ کیسا تجربہ رہا۔

ش ش: ابھی اخبار کو نکلتے ہوئے دو سال نہیں ہوئے ڈیڑھ سال کا عرصہ ہی گزرا ہے اور اس درمیان انقلاب نے ترقی کی منزلیں بہت تیزی سے طے کی ہیں۔ اب ان شہروں اور قصبوں میں بھی اردو کا اخبار ملنے لگا ہے جہاں آج تک کبھی کوئی اردو اخبار نہیں پہنچا تھا۔ بڑے بڑے اسٹیشنوں پر بھی انقلاب اب دستیاب ہے جب کہ اس سے پہلے اسٹیشن پر اردو اخبار کو آنکھیں ترس جاتی تھیں۔ ہم دہلی میں نمبر ون اخبار بن چکے ہیں، ممبئی میں تو ہمیشہ سے ہی انقلاب ٹاپ پر تھا اور آج بھی ہے۔ یوپی کے کئی شہروں میں اردو کا اخبار پہلی بار چھپنا شروع ہوا ہے۔ انقلاب کی وجہ سے کئی اخباروں کو اپنا انداز تبدیل کرنا پڑا ہے۔ انقلاب کی پیروی کرتے ہوئے خبروں کے صفحات کم کرکے کئی اخباروں نے فیچر پیجز شروع کیے ہیں۔ انقلاب اتنے کم عرصے میں ایک ایسا اخبار بن گیا ہے جو اردو بولنے والوں کی ہر بستی میں دکھائی دینے لگا ہے۔

ن ظ: بہت سے اردو والے اب بھی یہ مانتے ہیں کہ اردو صحافت گھاٹے کا سودا ہے۔ جاگرن گروپ کے مالکان اس بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ کیا انقلاب ان کے لیے گھاٹے کا سودا رہا۔

ش ش: اردو صحافت کبھی گھاٹے کا سودا نہیں تھی۔ یہ بات اور ہے کہ اردو اخباروں میں کام کرنے والے صحافیوں کو اخبار سے ہونے والے فائدوں کا حصہ نہیں ملا۔ بڑے بڑے گروپس کے آنے کے بعد اردو کے

شکیل حسن شمسی
انقلاب (ایڈیٹر نارتھ)

صحافیوں کی زبوں حالی دور ہوئی ہے اور آج ان کو بھی دوسری زبانوں کے صحافیوں کے برابر تنخواہیں ملنے لگی ہیں۔ انقلاب خود اردو صحافت میں کامیابی کی ایک ایسی مثال ہے جس کی کوئی نظیر نہیں۔ انقلاب کے سابق مالکان نے پہلے انقلاب شروع کیا اور اسی کی کامیابی کی بنیاد پر انگریزی اور ہندی کے کئی بڑے روزنامے اور ہفت روزہ اخبار کھڑے کیے۔ پورا مڈ ڈے انفو میڈیا انقلاب کی بانہوں میں ہی پل کر جوان ہوا تھا۔ جہاں تک گھاٹے کا سوال ہے تو کوئی بھی پروفیشنل گروپ کوئی بھی اخبار گھاٹے پر نہیں چلاتا۔ اردو اخباروں کے قارئین کی تعداد میں جیسے جیسے اضافہ ہورہا ہے۔ مشتہرین اس طرف متوجہ ہورہے ہیں اور اب کارپوریٹ گھرانوں کے اشتہارات بھی اردو اخباروں میں آنے لگے ہیں۔ اس لیے یہ بات یقینی ہے کہ اگر کوئی پروفیشنل گروپ اخبار کو چلائے گا تو گھاٹے کا سوال ہی نہیں

ہے۔ اردو اخبارات کی مانگ کافی ہے لیکن سرکولیشن اور ڈسٹری بیوشن کے وسائل نہ ہونے کی وجہ سے عوام تک ان کی رسائی نہیں تھی مگر اب جاگرن گروپ نے اس کمی کو دور کر دیا ہے اور اخبار ماشاءاللہ روز بروز پھیل رہا ہے۔

ن ظ: انقلاب کو اور پھیلانے کی سمت میں آپ کے کیا کیا منصوبے ہیں۔ خاص طور سے جنوبی ہند اور جموں کشمیر کے علاقوں میں جو ابھی تک اس سے محروم ہیں۔

ش ش: انقلاب کو جاگرن گروپ بہت وسعت دینا چاہتا ہے اور عنقریب آپ ملک کے کئی اہم شہروں میں انقلاب کو دیکھ سکیں گے لیکن ابھی اس کا اعلان کرنے کا مجھے کمپنی نے اختیار نہیں دیا ہے۔

ن ظ: پہلے انقلاب گروپ سے فلم اور کھیل سے متعلق رسالے بھی اردو میں شائع ہوا کرتے تھے۔ کیا ایسا کوئی منصوبہ جاگرن والوں کے ذہن میں ہے؟

ش ش: فی الحال تو کوئی ایسا منصوبہ نہیں ہے۔

ن ظ: آپ کا تعلق بنیادی طور پر الیکٹرانک میڈیا اور اس میں بھی ٹیلی ویژن سے رہا ہے، لیکن اب پرنٹ میڈیا کے صحافی کے طور پر بھی آپ کی پہچان بن چکی ہے۔ خود اپنی زندگی کے اس انقلاب کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں۔

ش ش: صحافت تو صحافت ہی ہے۔ اس کے بنیادی اصول وضوابط تو تبدیل نہیں ہوتے۔ فرق صرف ترسیل کے ذریعہ کا ہے۔ الکٹرانک میڈیا کی خوبی یہ ہے کہ اس ذریعہ ان تک بھی ایک خبر پہنچ سکتی ہے جو پڑھے لکھے نہیں ہیں جب کہ پرنٹ کی صحافت ان لوگوں کے لیے مخصوص ہے جو پڑھے لکھے ہیں۔ ٹیلی ویژن میں خبر پہنچانے کے لیے ایک عدد اسکرین ہے جس پر ہر چیز متحرک ہے جبکہ اخبار کی دنیا کچھ صفحات میں سمٹی ہوئی ہوتی ہے جہاں سب کچھ ٹھہرا ہوا ہے۔ اخبار میں آپ خبریں اپنی مرضی سے پڑھ سکتے ہیں۔ پہلے صفحے کی خبر آخر میں پڑھیں چاہے آخری صفحے کی خبر سب سے پہلے پڑھیں۔ ٹیلی ویژن میں آپ کی مرضی نہیں چلتی۔ آپ اسی تسلسل میں خبریں دیکھتے اور پڑھتے ہیں جس میں آپ کو چینل دکھانا چاہتا ہے۔ اخبار میں آپ کچھ خبریں چھوڑ بھی سکتے ہیں اور کچھ خبریں پڑھ بھی سکتے ہیں جب کہ ٹیلی ویژن میں یہ آپشن نہیں ہے۔ ہاں ٹیلی ویژن کا سفر ہر وقت جاری رہتا ہے جب کہ اخبار ایک بار پریس سے باہر نکل گیا تو اس میں پھر کوئی اضافہ یا کوئی کمی ممکن نہیں ہوتی۔

ن ظ: ویسے میں نے اپنے کیریئر کی شروعات پرنٹ سے ہی کی تھی۔ اخباروں میں لکھنے کا کام 1977 میں طالب علمی کے زمانے میں ہی شروع کر دیا تھا۔ لکھنؤ کے ایک مقامی ہفتہ وار 'سرخی' میں ہر ہفتہ مضامین لکھ کر میں نے اپنا کیریئر شروع کیا تھا۔ اس کے بعد اسکرپٹ رائٹنگ فار ماس میڈیا کا کورس جے این یو سے کیا اور کچھ عرصے بعد پیام نو کے نام سے ایک ہفت روزہ اخبار کئی دوستوں کے ساتھ مل کر نکالا اور اس کی ادارت کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی۔ الکٹرانک میڈیا میں آنے کے بعد بھی پرنٹ سے میرا ناطہ نہیں ٹوٹا اور 1990 میں میں نے انقلاب میں کالم لکھنا شروع کیا۔ اس کے علاوہ 1994 میں میڈیا اسٹار نام کی ایک ایجنسی کے ذریعہ اپنے نام سے اور ابوعمران کے قلمی نام سے بھی مضامین لکھنا شروع کئے۔ اس کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ 1997 میں دوردرشن نے میرے خلاف تادیبی کارروائی شروع کرنے کا نوٹس جاری نہیں کر دیا۔

2004 میں دوردرشن سے رضاکارانہ سبکدوشی اختیار کرنے کے بعد میں نے اردو ٹائمز میں آزاد قلم کے نام سے کالم لکھنا شروع کیا جو تقریباً دو سال تک جاری رہا۔ پھر روزنامہ راشٹریہ سہارا سے وابستہ ہونے کے بعد آزاد قلم ہر بدھ کو سہارا میں شائع ہونے لگا۔ یہیں صحافتی شاعری کا سلسلہ بھی شروع ہوا اور حرف آخر کے نام سے ہر روز ایک قطعہ لکھ کر حالات حاضرہ پر تبصرہ بھی کیا۔

جاگرن گروپ کی جانب سے جب مجھے آفر ملی تو میں نے ہنسی خوشی قبول کیا کیوں کہ مجھے معلوم تھا کہ یہ گروپ دنیا کا سب سے بڑا اخبار نکالتا ہے اور پوری طرح پروفیشنل ہے۔ میرے لیے الکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کا فرق کوئی معنی نہیں رکھتا کیوں کہ میں صحافت کا طالب علم ہوں۔ ترسیل کے ذرائع میں الجھنے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔

ن ظ: ملک میں اردو زبان کی ترقی وترویج کے لیے ایسا کیا کام ہے جو ابھی تک نہیں ہوا اور جو آپ کے خیال میں فوراً ضرور ہونا چاہیے۔

ش ش: میرے خیال میں سب سے اہم کام اس دور میں یہ ہے کہ جو لوگ اردو سیکھنے کے خواہش مند ہیں ان کے گھر تک اردو پہنچائی جائے تو بہتر رہے گا، لیکن اردو کلاسز سے کام نہیں چلے گا کیوں کہ آج کے مصروف زمانے میں ہر شخص ایک مقررہ وقت میں ہی کلاس اٹینڈ کر سکے ایسا ناممکن ہے۔ اردو پڑھانے کے لیے ایسا سافٹ ویئر ڈیولپ ہونا چاہیے جس کی مدد سے اردو سیکھنے کا خواہش مند شخص اپنے گھر پر اردو سیکھ سکے۔ اردو کو مقبول بنانے میں اس کی شاعری کا سب سے اہم کردار رہا ہے۔ جو لوگ محبت میں گرفتار ہوتے ہیں وہ سب سے پہلے اردو کے اشعار کا ہی سہارا لیتے ہیں ایسے لوگوں کو اردو سکھانے کا انتظام ہونا چاہیے۔ تعلیمی اداروں میں اگر اردو ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جائے تو ترقی کے نئے دروازے کھلیں گے ویسے اس تجویز پر عمل در آمد ہونا بہت مشکل ہے کیوں کہ اسکولی بچوں کے بیگ پہلے ہی سے اتنے بھاری ہیں کہ وہ شاید نئی زبان کا بوجھ سنبھال نہ سکیں۔ میرا ماننا ہے کہ کوئی بھی زبان جبری طور پر نہیں پڑھائی جا سکتی۔ اردو نے محبت کی آبیاری کی ہے وہ محبت کے ذریعہ ہی پھیل سکے گی۔ □

ڈاکٹر اطہر فاروقی
جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند)

اردو جب تک اسکولی نظام کا حصہ نہیں بنے گی تب تک اس کا احیا ممکن نہیں

اطہر فاروقی

نصرت ظہیر: اردو کے ایک ایسے ادارے کا سربراہ بننے کے بعد جس کے سرپرستوں میں مہاتما گاندھی اور علامہ اقبال جیسی ہستیاں شامل رہی ہوں، آپ کیسا محسوس کررہے ہیں۔

ڈاکٹر اطہر فاروقی: بلاشبہ یہ میرے لیے نہایت فخر کی بات ہے۔ اور میں نے اس عہدے کو اس

وقت قبول کیا جب میں پرائیویٹ سیکٹر کے ایک اہم تعلیمی ادارے میں اس منزل پر تھا جسے آپ کریئر کا نقطۂ عروج کہہ سکتے ہیں۔ اس عہدے کو قبول کرنے کی اہم ترین وجہ یہ تھی کہ یہ اردو کا ایسا واحد رضا کار ادارہ ہے جس کی قومی حیثیت ہے۔ بلاشبہ انجمن متعدد مسائل سے نبرد آزما ہے جس کی سب سے بڑی وجہ بدلتی ہوئی سماجی صورت حال ہے جس نے ملک کی اقتصادیات کے ساتھ اس کی اخلاقیات اور سماجی رویے بھی بدل دیے ہیں۔ انجمن جیسے کسی بھی ادارے کے لیے ماضی سے مختلف اور کہیں مشکل جو چیلنجز پیدا ہوئے ہیں ان سے نبرد آزما ہونا آسان کام نہیں۔

ن ظ: اردو کی یہ سب سے پرانی انجمن ہے جس کا اردو زبان و ادب کے ارتقا میں اہم کردار رہا ہے۔ لیکن محسوس کیا جاتا ہے کہ خود انجمن کا ارتقا اس نہج پر نہیں ہو پایا ہے کہ اسے آج کے دور سے ہم آہنگ اردو ادارہ کہا جاسکے۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

اطہر فاروقی: انجمن پر ہی موقوف نہیں ہی، کسی بھی زبان کے کسی بھی ادارے کا اپنے وقت سے ہم آہنگ ہونا اس وقت تک ناممکن ہے جب تک خود اس زبان کو بولنے والا طبقہ وقت سے ہم قدم نہ ہو۔ اسباب کی بحث سے قطع نظر، اردو کو اپنی زبان کہنے والوں اور اپنی شناخت کا انتہائی اہم جز تصور کرنے والوں کی بڑی تعداد مسلمانوں پر مشتمل ہے اور اردو زبان، مسلم سیاست کے ایجنڈے میں تقسیم کے بعد مذہب کے فوراً بعد شامل رہی ہے۔ یہ بات دیگر ہے کہ تقسیم کے بعد ہندستانی مسلمانوں کی واحد عملی ترجیح مذہب کا تحفظ تھا اس لیے اردو زبان اور اس کا ادب مسلم سیاست کے نعروں سے آگے نہ بڑھ سکے۔

ن ظ: ایک زمانے میں انجمن کی ملک گیر حیثیت ہوا کرتی تھی۔ کیا آپ کو ایسا نہیں لگتا کہ اب وہ دہلی تک اور وہ بھی اپنے صدر دفتر 'اردو گھر' تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کی کیا وجوہ ہیں۔

اطہر فاروقی: آپ کے خیال کے مطابق اگر انجمن اردو ادب تک محدود ہو کر رہ گئی ہے تو اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اردو زبان فنکشنل لینگویج functional language یعنی زندگی کے ہر شعبے کی زبان کے طور پر خود مسلمانوں کی زندگیوں سے غائب ہو چکی ہے۔ جو اردو اپنے رسم خط میں سماجی منظر نامے پر نمایاں ہے اس کا بڑا حصہ مذہبی ادب پر مشتمل ہے اور اردو کی بقا اگر مسلمانوں کے مذہبی اداروں میں ہو رہی ہے تو اس کی اہم ترین وجہ یہ ہے کہ دینی مدارس عربی پر اس درجہ عبور نہیں رکھتے کہ واقعتاً عربی ذریعۂ تعلیم بن سکے۔

ن ظ: تنظیمی سطح پر انجمن کو ملک بھر میں فعال کرنے اور اسے صحیح معنوں میں اردو کی آواز بنانے کے لیے کیا کوئی منصوبہ یا لائحۂ عمل آپ کے ذہن میں ہے؟

اطہر فاروقی: انجمن کی شاخوں کو متحرک کرنے کے علاوہ اور کوئی طریقہ انجمن ترقی اردو (ہند) کا وہ کردار بحال نہیں ہو سکتا۔ اب جس وقت انجمن کے جنرل سکریٹری کا عہدہ میں نے سنبھالا ہے، اس وقت خود اردو گھر متعدد انتظامی مسائل سے نبرد آزما ہے۔ جن کا حل میری اولین ترجیح ہے۔ مگر اس کے باوجود میں اس امر کو فراموش نہیں کر سکتا کہ انتظامی مسائل کے ساتھ ہی شاخوں کو متحرک کرنے کے عمل کی شروعات بھی بے حد ضروری ہے جس کے لیے پیش قدمی کی جا چکی ہے۔ جب تک انجمن کی شاخیں فعال اور متحرک نہیں ہوں گی تب تک انجمن کا مرکزی دفتر واقعتاً بے معنی ہے۔ میں سمجھتا ہوں انجمن کی شاخوں کو فعال اور متحرک کرنے کا لائحۂ عمل بھی ماضی سے مختلف ہوگا جسے نئے سیاسی معاشرے اور ملک کی اقتصادیات سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔

ن ظ: دہلی میں انجمن سے ایک عام شکایت یہ رہی ہے کہ اس کے تنظیمی معاملات اور چناؤ وغیرہ کو صیغۂ راز میں رکھا جاتا ہے۔ انجمن کے سابق جنرل سکریٹری تو انجمن کے اراکین اور دستور و آئین کو بھی سربستہ راز بنا کر رکھتے تھے۔ انجمن کی ویب سائٹ پر بھی جو کہ بہت دیر سے معرض وجود میں آئی تھی، کچھ خاص معلومات اس کے کام کاج کے بارے میں نہیں دی جاتی۔

اطہر فاروقی: انجمن سوسائٹی رجسٹریشن ایکٹ 1860 کے تحت رجسٹرڈ ادارہ ہے۔ اس ایکٹ کے تحت کسی بھی ادارے کے آئین کی مصدقہ نقل کوئی بھی شخص اس وقت بھی حاصل کر سکتا تھا جب RTI وجود میں نہیں آیا تھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس وقت آپ کو انجمن کا دستور حاصل کرنے ڈپٹی رجسٹرار کے دفتر جانا پڑتا، اب آپ یہ کام گھر بیٹھے دس روپے خرچ کر کے کر سکتے ہیں۔

ن ظ: انجمن بنیادی طور پر ایک رضا کارانہ تنظیم یا این جی او ہے، لیکن سرکاری ایجنسیوں سے خود کو دور رکھتی ہے۔ کیا یہ اس لیے ہے کہ انجمن کسی محاسبے کے دائرے میں نہ آسکے، جس طرح قومی کونسل برائے فروغ اردو اور ریاستی اردو اکادمیاں ہیں کہ ان کا ہر کام سب کے سامنے رہتا ہے اور کچھ بھی ڈھکے چھپے انداز میں نہیں کیا جاتا۔

اطہر فاروقی: انجمن، قومی اردو کونسل کے اشتراک سے ماضی میں بھی مختلف پروجیکٹوں پر کام کر چکی ہے اور آئندہ بھی کرتی رہے گی۔ اشتراک کا یہی معاملہ ریاستی اردو اکادمیوں کے ساتھ ہے۔ حکومت سے براہِ راست گرانٹ حاصل کرنے کا معاملہ بہت سے پیچیدہ نظریاتی پہلو لیے ہوئے ہے جن پر اس وقت میری رائے مناسب نہیں لیکن میں اردو کے رضا کار اداروں کے لیے خود حکومت سے گرانٹ حاصل کرنے کے حق میں کبھی نہیں رہا۔

ن ظ: انڈیا انٹرنیشنل سینٹر جیسے کئی ادارے اس ملک میں ایسے ہیں جن کی رکنیت کو لوگ اپنے لیے اعزاز سمجھتے ہیں۔ کیا انجمن کو بھی اردو کا ایسا ہی مرکزی ادارہ نہیں بنایا جاسکتا جس کی رکنیت ہر شخص کے لیے باعث افتخار ہو اور جس سے زیادہ سے زیادہ تعداد میں اردو والوں کو جوڑا جاسکے؟

اطہر فاروقی: خدا کرے انجمن ترقی اردو انڈیا انٹرنیشنل سینٹر جیسا وقیع ادارہ بن جائے۔ مجھے اپنی صلاحیتوں کا مبالغہ آمیز احساس قطعی نہیں ہے، اس لیے، یقین ہے کہ میرے زمانے میں انجمن کا IIC جیسا ادارہ بننا آسمان کو چھونے جیسا ہوگا جس کی مجھے قطعی کوئی توقع نہیں۔

ن ظ: آپ دہلی پبلک اسکول جیسے باوقار تعلیمی ادارے کا وسیع انتظامی تجربہ رکھتے ہیں اور خلیجی ملکوں میں اس ادارے کو پھیلانے میں آپ کا اہم کردار رہا ہے۔ کیا آپ انجمن کی جانب سے ملک میں جدید طرز کے ایسے اردو پبلک اسکول کھولنے کا سلسلہ شروع نہیں کر سکتے جن میں اردو انگریزی اور ہندی کی تعلیم ابتدائی درجے سے ثانوی درجات تک لازمی ہو؟ حکومت اور اردو سماج سے اس سلسلے میں آپ کو کافی تعاون مل سکتا ہے۔ اور یہ اپنے آپ میں ایک انقلابی قدم ہوگا۔

اطہر فاروقی: یہ میرا عقیدہ ہے کہ جب تک اردو اسکول کے نظام کا حصہ نہیں بنے گی تب تک اس کا احیا ممکن ہی نہیں۔ اس لیے، اس فرنٹ پر انجمن اپنی تمام تر توانائی صرف کرنے کو تیار ہے۔ اردو میں اصل قاری تقریباً ناپید ہے۔ اردو ادب کا سارا کاروبار یونیورسٹیوں کے اردو شعبوں اور ان سے الحاق شدہ کالجوں میں اردو اساتذہ کے تقرر کی سماجیات تک محدود ہے۔ ■

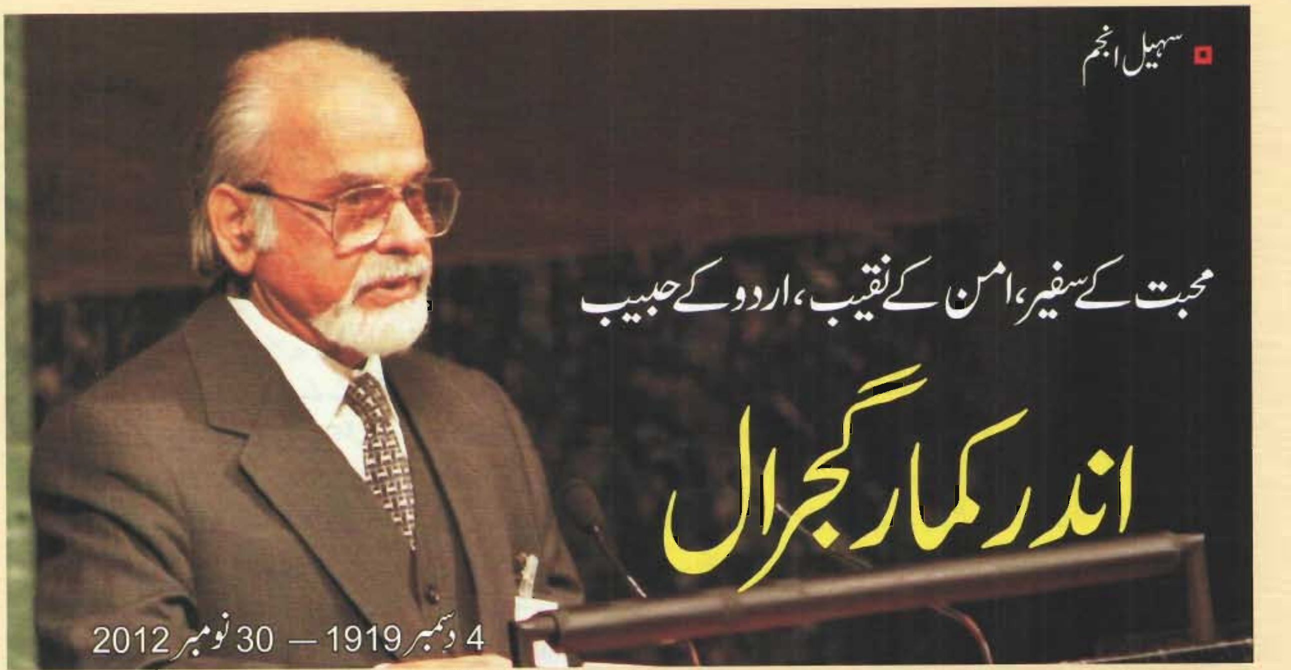

■ سہیل انجم

محبت کے سفیر، امن کے نقیب، اردو کے حبیب

اندر کمار گجرال

4 دسمبر 1919 — 30 نومبر 2012

سابق وزیر اعظم اور محبِ اردو اندر کمار گجرال کی یادوں کے چراغ تادیر روشن رہیں گے۔ ہندوستان کی سیاست کو ایسا شریف النفس سیاست داں اور یہاں کی گنگا جمنی تہذیب کو ایسا خالص اور پاکباز نمائندہ شاید پھر کبھی ملے۔ گجرال صاحب کی شخصیت کے متعدد پہلو تھے۔ وہ مدبر، مفکر، سفارت کار، قلمکار، انسان دوست اور امن کے پیامبر تھے۔ وہ غیر منقسم اور تقسیم شدہ دونوں ہندوستان کی درمیانی کڑی تھے۔ ان کی شخصیت ماضی سے چل کر، حال میں رک کر اور مستقبل کی طرف قدم بڑھانے سے عبارت تھی۔ وہ سفیر محبت بھی تھے اور اسی لیے ان کے دل میں انسان نوازی اور دردمندی کی جوت ہمیشہ روشن رہی۔ نگاہ کی بلندی، گفتگو کی دلنوازی اور جگر وجاں کی پرسوزی ان کی متاع حیات رہی ہیں اور انھوں نے زندگی کے کسی بھی لمحے میں اپنی اس گراں قدر پونجی کو حرص وہوس کے قزاقوں کے ہاتھوں لٹنے نہیں دیا۔

آئی کے گجرال کی پیدائش غیر منقسم ہندوستان کے جہلم ضلع میں ہوئی تھی جہاں ان کے والد وکالت کیا کرتے تھے۔ گجرال صاحب کو جو ذہن ملا تھا وہ ان کے خاندان کا ورثہ تھا جو انھیں اپنے والد کے توسط سے حاصل ہوا۔ ان کے والد ایک پختہ قوم پرست تھے اور اسی لیے جدوجہد آزادی میں کود پڑے۔ انھوں نے بھی اپنے والد کے نقش قدم پر آگے قدم بڑھایا اور تقسیم ملک کے خون آشام دور میں سرحد کے اس پار آ گئے۔ انھوں نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا ہے کہ ''اس وقت جو لوگ بھی پاکستان سے آتے تھے یہ سوچ کر آتے تھے کہ ہمیں پھر وہیں واپس جانا ہے۔ ہم بھی یہی سوچ کر آئے تھے۔ لیکن پھر جانا نہیں ہوا''۔ دراصل قسمت نے انھیں ہندوستان کا وزیر اعظم بنانا طے کر دیا تھا لہٰذا وہ ہندوستان کے ہو کر رہ گئے۔

گجرال صاحب کی زندگی شروع سے ہی عوامی سرگرمیوں سے عبارت رہی ہے۔ لیکن پہلی بار عملی سیاست میں وہ اس وقت داخل ہوئے جب انھیں 1956 میں میونسپل کمیٹی نئی دہلی کا رکن نامزد کیا گیا۔ بعد میں وہ میونسپل کمیٹی کے وائس پریسی ڈنٹ مقرر کیے گئے۔ وہ کہتے ہیں ''بس یہاں سے میری پولیٹیکل زندگی کا آغاز ہوا اور پھر وہیں سے 1964 میں پہلی مرتبہ میں راجیہ سبھا کا ممبر چنا گیا''۔

اس کے بعد جو انھوں نے آگے بڑھنا شروع کیا تو پھر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ سفارت بھی کی، سیاست بھی کی، انسان دوستی کی داستانیں بھی لکھیں، امن و آشتی کے گیت بھی گائے، ہمسایہ ملکوں کو محبت کی ڈور میں باندھنے کے لیے 'گجرال ڈاکٹرین' یا گجرال فلسفہ کی داغ بیل بھی ڈالی۔ مہاتما گاندھی کے فلسفہ عدم تشدد کو جو مقبولیت حاصل ہوئی اس کے بعد اگر کسی اور نظریے کو قبول عام کا درجہ ملا تو وہ 'گجرال فلسفہ' ہے۔ حالانکہ یہ کوئی نیا نظریہ نہیں ہے۔ یہ نظریہ تو ہندوستانی سرزمین کی روح ہے۔ ہندوستان کی قدیم تہذیبی روایات، انسانی اخوت، باہمی رواداری اور پرامن بقائے باہم کا جو فلسفہ ہے دراصل وہی گجرال ڈاکٹرین کی اساس ہے۔ ہاں آئی کے گجرال نے اسے نیا قالب بخشا، نیا رنگ و روپ دیا اور عصری تقاضوں سے پوری طرح ہم آہنگ کر دیا۔ گجرال فلسفہ میں پانچ بنیادی عناصر ہیں۔ (1) بنگلہ دیش، بھوٹان، مالدیپ، نیپال اور سری لنکا جیسے ملکوں کے ساتھ ہندوستان برابری کے سلوک کا تقاضہ نہیں کرے گا بلکہ خود اعتمادی کے ساتھ ان ملکوں کے ساتھ جو کچھ کر سکتا ہے کرے گا۔ (2) جنوبی ایشیائی خطے کا کوئی بھی ملک اس علاقے میں ایک دوسرے کے مفادات کے خلاف اپنی سرزمین کو استعمال کرنے کی اجازت نہیں دے گا۔ (3) کوئی بھی ملک ایک دوسرے کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہیں کرے گا۔ (4) جنوبی ایشیا کے تمام ملک ایک دوسرے کی علاقائی سالمیت اور خود مختاری کا احترام کریں گے اور (5) وہ باہمی تنازعات کو پرامن مذاکرات کی مدد سے حل کریں گے۔

انھیں پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو کے زیر سایہ تربیت و تجربات حاصل کرنے کا موقع ملا اور سابق وزیر اعظم اندرا گاندھی کی دوربیں نگاہوں نے ان کی صلاحیت و قابلیت کو بھانپ لیا تھا۔ انھوں نے اپنی کابینہ میں انھیں وزیر اطلاعات و نشریات مقرر کیا۔ 1975 کے بحرانی دور میں انھوں نے بحسن وخوبی اس ذمہ داری کو نبھایا اور اس طرح نبھایا کہ نہ تو اپنی خود داری اور عزت نفس پر کوئی آنچ آنے دی اور نہ ہی اپنے اصولوں سے کوئی سمجھوتہ کیا۔ 1976 سے 1980 تک وہ سوویت روس میں ہندوستان کے سفیر رہے۔ 1980 میں انھوں نے کانگریس چھوڑ کر جنتا دل جوائن کیا۔ وی پی سنگھ نے انھیں اپنی وزارت میں وزیر خارجہ مقرر کیا۔ پھر 1996 میں جب ایچ ڈی دیوے گوڑا کی حکومت قائم ہوئی تو انھیں ایک بار پھر یہ ذمہ داری تفویض کی گئی۔ وزیر خارجہ کی حیثیت سے ان کو بڑی شہرت حاصل ہوئی بالخصوص ہمسایہ ملکوں کے ساتھ دوستانہ رشتوں کے قیام

کے سلسلے میں انھوں نے جو کوششیں کیں ان کا ایک زمانہ معترف ہے۔ اسی سال انھیں راجیہ سبھا کا قائد مقرر کیا گیا۔ وہ زینہ بہ زینہ آگے بڑھتے رہے اور بالآخر اپریل 1997 میں ملک کے وزیر اعظم ہو گئے۔ لیکن افسوسناک بات یہ ہے کہ ان کا دور صرف گیارہ مہینے تک رہا۔ اگر ان کو پانچ سال کی پوری مدت ملتی تو اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستانی سیاست کو ایک تعمیری اور مثبت جہت حاصل ہوتی اور یہاں کے سیاسی نظام پر وہ مزید ایسے گہرے نقوش مرتب کر جاتے جو آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ بنتے اور ان کی اپنی کامیابیوں کے تاج میں قابل ذکر کلغی کی حیثیت سے روشن نظر آتے۔

گجرال صاحب نے پڑوسی ملک پاکستان کے ساتھ بہتر اور خوشگوار رشتوں کے قیام کے لیے جو فارمولے پیش کیے ان کا ہندوستان کے علاوہ پاکستان کا ایک بہت بڑا طبقہ بھی معترف ہے۔ سیاسی، مذہبی اور دیگر مسائل پر ان کی رائے اکیسویں صدی کے جنوبی ایشیا کے لیے امن و آشتی کا نقیب تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہند و پاک کے علاوہ اس خطے کے دوسرے ملکوں میں بھی ان کی فکر کو بڑا وزن اور وقار حاصل تھا۔ وہ ہندوستان کے ایک ممتاز سیاست داں اور مدبر تو تھے ہی، انھیں پوری دنیا میں ایک صاحب نظر مفکر کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔ انھوں نے انگریزی اور اردو میں اس خطے کے مسائل کے حل کے لیے جو مضامین تحریر کیے وہ برصغیر کی پرامن رائے عامہ کی تشکیل کا موجب بنے۔ انھوں نے ہندوستان کی خارجہ پالیسی کو پنڈت نہرو کے ڈھالے ہوئے سانچے میں پروان چڑھایا اور اپنی کوششوں سے عالمی سطح پر ہندوستان کے وقار کو چار چاند لگائے۔ انھوں نے ایسے بہت سے تنازعات کو سلجھایا جو ایک عرصے سے ہندوستان اور اس کے ہمسایہ ملکوں کے مابین الجھاؤ اور کشیدگی کا باعث بنے ہوئے تھے۔ بنگلہ دیش کے پانی کا سوال ہو یا نیپال سے بعض حل طلب مسائل کا معاملہ ہو، سارک ملکوں کے مابین اشتراک و تعاون کو فروغ دینے کی بات ہو یا ان ملکوں کے درمیان باہمی تجارت کے فروغ کا مسئلہ ہو، انھوں نے ہر شعبے میں اپنی قابل ذکر چھاپ چھوڑی۔ انھوں نے اقوام عالم سے تعلقات کے قیام میں صبر و تحمل، اعتماد سے بھرپور لہجے کے دھیما پن، اعتماد و خیر سگالی کے جذبات اور مذاکرات کو اولیت دینے جیسے لائق خیر مقدم پہلوؤں کا اضافہ کیا۔ ان کی پالیسی تھی کہ مسئلہ خواہ کتنا ہی مشکل اور پیچیدہ کیوں نہ ہو بات چیت سے حل ہو سکتا ہے۔ ان کا ایک نظریہ یہ بھی تھا کہ اگر کوئی تنازعہ بے حد دشوار کن ہے تو اس کو تھوڑی دیر کے لیے حاشیے پر رکھ دیا جائے اور آسانی سے حل ہونے والے تنازعات پر بات کی جائے اور انھیں حل کر لیا جائے۔ اس سے ایک ایسا خوشگوار ماحول تیار ہوگا کہ پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کے حل کی بھی راہ نکل آئے گی۔ ماحول سازی ایک بہت بڑا فن ہے اور گجرال صاحب کو اس فن میں ملکہ حاصل تھا۔

آئی کے گجرال کی شخصیت کا ایک اہم اور قابل قدر پہلو اردو نوازی سے عبارت ہے۔ ان کی اردو خدمات کے ذکر کیے بغیر ان کی شخصیت کا خاکہ نامکمل رہے گا۔ وہ اردو زبان کے زبردست مداح تھے۔ بہت اچھی اردو جانتے تھے اور اردو اخباروں کے لیے اردو ہی میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ انھوں نے اردو میں کچھ شاعری بھی کی تھی۔ اردو شاعری سے، مشاعروں سے اور اردو تہذیب و ثقافت سے ان کو زبردست لگاؤ تھا۔ دراصل ان کی شخصیت کی دلآوازی و دلنوازی اردو زبان ہی کی مرہون منت ہے۔ وہ خلوص دل سے چاہتے تھے کہ ہندوستان میں اردو کو اس کا جائز حق ملے۔ وہ اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے عظیم مبلغ رہے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ بچوں کو مادری زبان ہی میں تعلیم دی جانی چاہیے۔ دوسرے ملکوں میں جہاں اس کا انتظام نہیں ہے وہاں لوگ از خود اس کا اہتمام کرتے ہیں۔ اردو سے ان کی محبت کا منھ بولتا ثبوت 'گجرال کمیٹی رپورٹ' ہے۔ یہ کمیٹی اردو کے مسائل کے حل اور اردو زبان کے فروغ کے لیے قائم کی گئی تھی۔ اس کمیٹی کا اصل نام Committee For Promotion of Urdu تھا اور اس کا چیئرمین گجرال صاحب کو بنایا گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت ایوان اقتدار میں گجرال صاحب سے زیادہ اردو کا ہمدرد اور اردو کے مسائل سے واقف کوئی اور نہیں تھا۔ پھر تو یوں ہوا کہ اس کمیٹی کا نام 'گجرال کمیٹی' ہی پڑ گیا۔ اور آج صورت حال یہ ہے کہ گجرال کمیٹی اور اندر کمار گجرال ایک دوسرے کے لازم و ملزوم بن گئے ہیں۔ گجرال کمیٹی نے پہلے تو اردو کے صحیح مقام کا تعین کیا اور پھر اس مفروضے کو توڑا کہ اردو تقسیم ہند کی ذمہ دار ہے۔ انھوں نے بہت شد و مد کے ساتھ کہا کہ اردو یہیں پیدا ہوئی ہے اور یہیں پروان چڑھی ہے۔ یہ نہ تو غیر ملکی زبان ہے اور نہ ہی تقسیم ملک کی ذمہ دار ہے۔ انھوں نے اردو کی ترویج کے لیے زبردست کوششیں کیں۔ وہ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں ''گجرال کمیٹی کی رپورٹ میں صاف طور پر کہا گیا تھا کہ تعلیم اور سرکاری کام کے لیے آبادی کی تشکیل کو مد نظر رکھتے ہوئے ہی سہولتیں دی جائیں لیکن یہ ہوا نہیں۔ سردار جعفری کمیٹی جو گجرال کمیٹی کی سفارشات پر عمل درآمد کی جانچ کرنے کے لیے بنائی گئی تھی اس کی رپورٹ بے عملی اور بے توجہی کی منھ بولتی تصویر ہے۔ گو کہ اصلیت یہ ہے کہ اردو صرف مسلمانوں کی ہی زبان نہیں ہے لیکن یہ بھی تو سچ ہے کہ اس غیر ہمدردانہ رویے کا اثر زیادہ تر مسلمانوں پر ہی پڑتا ہے''۔

(فن اور شخصیت: اندر کمار گجرال نمبر)

گجرال کمیٹی نے اردو کو اس کا جائز حق دلانے اور اس کے مسائل کو حل کرنے کے لیے 29 قابل ذکر اور اہم سفارشات پیش کی تھیں جن میں مختلف امور کا احاطہ کیا گیا ہے۔ لیکن افسوسناک بات یہ ہے کہ اس کمیٹی کی سفارشات کو پوری طرح نافذ نہیں کیا گیا۔ اس کمیٹی کی رپورٹ پر بالکل ہی عمل نہیں ہوا، ایسا نہیں ہے۔ اس رپورٹ کے بہت اچھے اثرات مرتب ہوئے اور مرکز اور ریاستوں کی سطح پر بہت سے ایسے فیصلے کیے گئے جو مذکورہ رپورٹ کے مرہون منت ہیں۔ اس کی ایک لمبی تفصیل ہے جس کی یہاں پر گنجائش نہیں ہے۔ انھوں نے ذاتی طور پر بھی اردو کے سلسلے میں قابل ذکر کوششیں کی تھیں اور ان کی ذاتی اور شخصی دلچسپی کی وجہ سے بھی بہت سے معاملات میں اردو کے ساتھ انصاف کیا گیا۔ مختلف ریاستوں میں اردو اکیڈمیوں کا قیام، آل انڈیا ریڈیو پر اردو پروگراموں کے اوقات میں اضافہ، اسٹیشنوں کے نام کو اردو میں بھی لکھنا، سولن اور پٹیالہ میں اردو اساتذہ کی تربیت کے مراکز کا قیام، پبلی کیشن ڈویژن سے رسالہ یوجنا کا آغاز، اردو اخباروں کے لیے اردو ٹیلی پرنٹر کا آغاز، ترقی اردو بورڈ کو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان جیسا ادارہ بنانا اور بعض ریاستوں میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینا، یہ سب گجرال کمیٹی کی سفارشات کا نتیجہ ہیں۔ تاہم ابھی اس کی بہت سی سفارشات منتظر عمل ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کو نافذ کیا جائے۔ یہ قدم اندر کمار گجرال کو ایک بہت بڑا خراج عقیدت ہوگا۔

بہر حال اندر کمار گجرال اردو سے صرف محبت ہی نہیں کرتے تھے بلکہ وہ چلتا پھرتا اردو انسائکلو پیڈیا تھے۔ اردو ان کے لیے محض ایک زبان نہیں تھی بلکہ ایک طرز زندگی تھی، ایک زاویہ نگاہ تھی، ایک فلسفہ حیات تھی، محبت کا استعارہ تھی، زندگی برتنے کا سلیقہ تھی اور تہذیبی مرقع تھی۔ آج آئی کے گجرال ہمارے ساتھ نہیں ہیں لیکن ان کی خدمات ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں گی اور ان کی یادوں کے چراغ تادیر روشن رکھے جائیں گے۔

■

Suhail Anjum, 370/6A, Zakir Nagar, New Delhi-110025

فاروق ارگلی

قہقہوں میں قید غم کی داستان

ہلال سیوہاروی

(15 جنوری 1928—15 نومبر 2012)

اسے ضلع بجنور اور اس کے قصبات و دیہات کی مٹی کا جادوئی اثر ہی کہا جائے گا کہ قصبہ سیوہارہ کا رہنے والا صرف درجہ تین تک تعلیم یافتہ ایک مل مزدور اپنی خداداد ذہانت اور ریاضتوں کے بل پر اردو طنز ومزاح کی تاریخ کا ناقابل فراموش باب مرتب کردیتا ہے۔ جی ہاں! یہ ذکر ہے اردو کے مشہور ومعروف طنز ومزاح کے شاعر جناب ہلال سیوہاروی کا، جنھوں نے گزشتہ نصف صدی میں اپنے کمال فن سے طنز وظرافت کے ایسے گلستان کھلائے ہیں جن کی خوشبو دائمی ہے۔ ہلال سیوہاروی اردو کے ایسے طنزیہ اور مزاحیہ شاعر ہیں جن کا کلام گزشتہ چار دہائیوں سے اردو دنیا میں زندگی کے کرب وآلام، تفکرات اور اندیشوں سے پژمردہ ماحول میں قہقہوں کے ساتھ ساتھ زندگی کی حقیقتیں بھی بانٹ رہا ہے۔ ہلال سیوہاروی کا نام ہندوستان اور پاکستان میں ہی نہیں امریکہ، برطانیہ، فرانس، سعودی عرب، متحدہ عرب امارات اور بنگلہ دیش تک وہاں کے عالمی مشاعروں کی کامیابی کا ضامن تصور کیا جاتا رہا لیکن ان کا شمار طنز ومزاح کے ان شعرا میں نہیں کیا جاسکتا جو سامعین کو اپنی حرکات وسکنات، ظریفانہ اداکاری اور چٹخارے دار شاعری سنا کر ہنسانے کا پیشہ ورانہ سلیقہ رکھتے ہیں۔ ہلال صاحب نے اپنی شاعری کو سماج کی بہت سی خرابیوں کے خلاف ایک مصلحانہ تحریک کی صورت بخشی تھی۔ انھوں نے طنز کی دودھاری تلوار سے موجودہ دور کی سماجی زندگی میں گہرے تک اتری ہوئی بداعمالیوں، اخلاقی پستیوں، سیاسی جبر و استحصال اور حکومتی نظام کی بدعنوانیوں پر کاری ضرب لگائی اور دنیا بھر میں لاکھوں انسانوں کو ہنساہنسا کر زندگی کی تلخ حقیقتوں پر غور وفکر کی موثر تلقین بھی کی۔ ہلال سیوہاروی، سید ضمیر جعفری، شہباز امروہوی، رضا نقوی واہی، دلاور فگار اور ساغر خیامی جیسے نامور طنز ومزاح کے شعرا کی صف میں کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ بنیادی طور پر ہلال سیوہاروی اشتراکی نظریہ فکر کے حامل ترقی پسند شاعر تھے، ان کا تعلق محنت کش طبقے سے تھا۔ سرمایہ ومحنت کی روایتی کشمکش کے موضوع پر سنجیدہ شاعری بہت کی گئی ہے لیکن پرولتاریہ طبقے کے اس حساس شاعر نے طنز ومزاح کے پیرایے میں سرمایہ داری اور طبقہ واریت پر بے حد بلیغ فنکارانہ اسلوب میں براہ راست حملہ کیا تھا۔ سیاست حاضرہ پر ان کی گہری نظر شروع سے ہی رہی ہے۔ اقتدار اور کرسی کے لیے جس طرح سیاسی پارٹیاں تمام سیاسی اخلاقیات اور اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر ایک دوسرے سے سمجھوتہ کرلیتی ہیں، اس پر 1963 میں کہی گئی ایک نظم 'گٹھ جوڑ' ان کی سیاسی بصیرت اور پیش بینی کی خوبصورت مثال ہے۔ سیاسی مفادات کے لیے برعکس نظریات والی جماعتوں سے سمجھوتے کرنے والے لیڈر ایک دوسرے کی طرف اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے جو کچھ سوچتے ہوں گے اس کی ترجمانی ہلال صاحب نے اس طرح کی ہے:

ہم میں کوئی بھی ہو ہر اک کو ہے عزت پیاری
تم کو کرسی کی ہوس ہم کو ہے دولت پیاری
تم کو اس دیس کا غم، ہم کو حکومت پیاری
گویا ہر شے ہے ہمیں حسب ضرورت پیاری
ان وچاروں سے جدا ہم بھی نہیں تم بھی نہیں
آؤ مل جائیں خفا تم بھی نہیں، ہم بھی نہیں

ملک کی تعمیر وترقی میں ہلال سیوہاروی نے محنت کش طبقے کو اقتدار، دولت مندی اور عیش وآرام کی زندگی گزارنے والے سیاست دانوں کے مقابلے میں زیادہ اہم اور محترم مانا۔ اپنے مخصوص طنزیہ مزاحیہ انداز میں وہ دل کی آواز عوام تک پہنچاتے ہیں:

اک گدھے سے کہا میں نے کہ میاں اچھے ہو
بولا اینٹوں سے لدا پھرتا ہوں کیا اچھا ہوں
میں نے اس سے کہا کہ اس دور میں لیڈر بن جا
بولا اس سے تو سرکار گدھا اچھا ہوں
کوئی تعمیر ہو لدتی ہیں مجھی پر اینٹیں
پھر بھی مہنگا نہیں کچھ سستے ہی دام آتا ہوں
اپنے بنگلوں میں پڑے رہتے ہیں لیڈر اکثر
میں گدھا ہو کے بھی اس دیش کے کام آتا ہوں

ہلال سیوہاروی کی ایک انقلابی نظم ہے 'خون کی مانگ' جسے پڑھنے کے بعد ذہن میں خود بخود یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہلال طنز ومزاح کے بجائے سنجیدہ قسم کے شاعر ہوتے تو یقیناً ان کا شمار فیض، ساحر اور مخدوم جیسے محترم اور مقبول شعرا کی طرح ادبی منظرنامے پر ابھرتا۔ یہ شاہکار نظم انھوں نے 1964 میں کہی تھی جب حکومت ہند نے زخمی فوجیوں کے لیے عوام سے خون کا عطیہ دینے کی ایک اپیل جاری کی تھی۔ ہلال صاحب نے اس اپیل پر اپنا شاعرانہ ردعمل اس طرح ظاہر کیا تھا:

خون کی مانگ ہے اس دیش کی رکشا کے لیے
میرے نزدیک یہ قربانی ہے چھوٹی، دے دو
لیکن ارباب حکومت سے بھی کہنا ہے مجھے
جن سے خوں مانگ رہے ہو انہیں روٹی دے دو
ان غریبوں کا لہو بہہ چکا بن کر پانی
زندگی ہے کہ بہر حال لیے بیٹھے ہیں
خشک ڈھانچوں سے نچوڑو نہ لہو کی بوندیں
خون لو ان سے کہ جو خون پیے بیٹھے ہیں

ہلال سیوہاروی دیکھتے ہیں کہ سرمایہ دار طبقے وطن کی حفاظت میں جان کی بازی لگانے والے بہادر فوجیوں کے لیے روپے پیسے کا چندہ دے کر حب الوطنی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود کو اپنے قومی فریضے سے بری الذمہ سمجھ لیتے ہیں۔ اس طبقے کو مخاطب کرتے ہوئے ہلال سیوہاروی کہتے ہیں کہ:

پونجی والو! بڑا احسان کیا ہے تم نے
قوم کا دامن صد چاک سیا ہے تم نے
وقت کی نبض کو پہچان لیا ہے تم نے
آج سونے کا بڑا دان دیا ہے تم نے
اب رہا خون تو وہ اہل جنوں دے دیں گے
سونا دینے کو نہ ہوگا تو یہ خوں دے دیں گے

اس شاہکار نظم کے حوالے سے اردو کے کہنہ مشق شاعر جناب فصیح اکمل ایک چشم دید واقعہ بیان کرتے ہیں کہ 1965 میں ممبئی میں جشن محوی صدیقی کے سلسلے میں ایک کل ہند مشاعرے کا انعقاد کیا گیا تھا، جس میں ہندوستان کے تمام نامور شعرا نے شرکت فرمائی تھی۔ اس مشاعرے کے روح رواں شکیل بدایونی تھے۔ مشاعرے میں ہلال صاحب نے سامعین کو اپنا دیوانہ بنالیا تھا۔ مشاعرے کے اگلے دن نامور مزاحیہ اداکار جانی واکر نے ہلال صاحب کو سننے کے لیے خاص طور سے اپنے مکان پر ایک شعری نشست کا اہتمام کیا تھا۔ اس یادگار موقع پر بیکل اتساہی، نیاز حیدر، شاداں لکھنوی، فصیح اکمل، نیز کئی نامور شعرا موجود تھے۔ خصوصی مہمانوں میں نامور فلم ایکٹر پران صاحب بھی وہاں موجود تھے۔ ہلال سیوہاروی نے جانی واکر کی فرمائش پر اپنی یہی نظم 'خون کی مانگ' سنائی تو پران صاحب سرمایہ داروں اور دولت مندوں پر یہ سیدھا طنزیہ وار برداشت نہیں کرسکے اور زبردست طریقے پر ان سے اپنا اختلاف ظاہر کیا۔ نظم کو پسند کرنے والوں اور مخالفت کرنے والوں کے دوگروپ بن گئے،

جن میں زبانی بحث بحثی کے ساتھ ہی ہاتھا پائی تک نوبت پہنچ گئی۔ اس موقع پر نیاز حیدر نے ہلال صاحب کی کھل کر حمایت کی اور ان کی تعریف میں ایسی دلیلیں دیں کہ پران صاحب اور ان کے ہمنوا شرمندہ ہوگئے۔ فصیح اکمل شاہجہاں پور کے ایک اور مشاعرے کا بھی ذکر کرتے ہیں جس میں اس وقت کے بڑے بڑے شعرا نے شرکت فرمائی تھی۔ اس مشاعرہ میں ہلال صاحب نے اپنی مشہور نظم 'جوتا' پڑھی تو داد وتحسین کے نعروں سے ماحول گونج اٹھا۔ نظم پڑھ کر ہلال صاحب مائک سے ہٹ کر جانے لگے تو ونس مور، ونس مور کی آوازیں اس شدت سے اٹھیں کہ ہلال صاحب کو مجبوراً پھر مائک پر آنا پڑا۔ سامعین نے انھیں دیر تک سنا۔ اس سے بیزار ہوکر فراق گورکھپوری صاحب کا پارہ چڑھ گیا۔ انھوں نے با آواز بلند فرمایا Every idiot become popular اور یہ کہہ کر وہ مشاعرہ چھوڑ کر جانے لگے۔ انھیں بڑی مشکل سے منایا گیا۔ ہلال صاحب نے فراق صاحب کی اس بات کا قطعی برا نہیں مانا اور ان کے پاس جاکر ادب سے عرض کیا۔ ''حضور! آپ کا یہ فرمانا میرے لیے باعث افتخار ہے۔''

قاضی حبیب الرحمٰن یعنی ہلال سیوہاروی 15 جنوری 1928 کو قصبہ سیوہارہ ضلع بجنور میں پیدا ہوئے، ان کے والد قاضی فضل حق شعر وسخن کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے، ان کے پردادا قاضی ظہور الحق کا شمار تو فارسی اور اردو کے قادر الکلام شعرا میں ہوتا تھا۔ اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہلال سیوہاروی کو شعر وسخن کا ذوق وراثت میں ملا ہے۔

1936 میں جب ہلال 8 سال کے ہوگئے تھے، انھیں مدرسے میں داخل کیا گیا لیکن تیسری جماعت تک پڑھنے کے بعد انھوں نے اپنی افتادِ طبع اور کھلنڈرے مزاج کی وجہ سے مدرسہ اور تعلیم دونوں کو خیرباد کہہ دیا لیکن گھر اور قصبے کے ادبی ماحول میں ہوش سنبھالنے پر جب شاعری کا شوق پیدا ہوا تو مطالعہ کرنا عادت بنالیا۔ انھوں نے اساتذہ کے دواوین کا جی بھر کر مطالعہ کیا اور زبان وبیان اور فن شعر کے رموز ونکات کو جاننے کی پوری کوشش کی۔ اپنے طور پر انھوں نے اردو کے علاوہ فارسی اور انگریزی بھی سیکھی۔ ادیب ماہر کا امتحان بھی پاس کیا، ان کے مزاج میں بذلہ سنجی اور شوخ مزاجی کے ساتھ ساتھ تیکھا پن بھی فطری طور پر موجود تھا۔ وہی انداز ان کی شاعری میں نکھر کر سامنے آیا اور وہ سنجیدہ سیاسی وسماجی موضوعات پر طنز ومزاح کی چاشنی سے بھرپور شاعری کے ساتھ ادبی منظر نامے پر نمودار ہوئے۔

1946 میں وہ ایک فٹر کی حیثیت سے برلا کی مقامی شوگر مل میں ملازم ہوگئے۔ مل مالک مسٹر کے کے برلا ان کی شاعری کے اس طرح قدرداں ہوگئے تھے کہ 41 سال تک ہلال سیوہاروی شوگر مل کے ملازم رہے لیکن اس شان سے کہ ان پر ڈیوٹی کی کوئی پابندی نہیں رہی اور ان کا زیادہ وقت دنیا بھر کے مشاعروں میں کلام سناتے ہوئے گزرا۔ انھوں نے مزدوروں کے مسائل اور محنت کش طبقے کی زندگی کا بہت گہرا مشاہدہ کیا اور اپنے تجربات واحساسات کو طنز ومزاح کے قالب میں ڈھال کر دنیا کے سامنے پیش کیا۔

بقول شکیل رحمانی '' ان کی شاعری صرف قہقہہ ہی نہیں ہے بلکہ خونِ دل میں ڈوبی ہوئی انگلیوں سے لکھا اس دورِ تشدد اور انحطاط کا منظر نامہ بھی ہے جو ہمارے احساسات کے تاروں کو جھنجھنا کر ہمیں منزلِ انقلاب کی طرف گامزن ہونے کی دعوت دیتا ہے۔ عدم تحفظ، نا آسودگی، فرقہ پرستی، تنگ نظری، بے روزگاری آج سماج کے ناسور ہیں۔ وہ ہمارے بے راہ رو سماج، بدبودار سیاست کے مکروہ اور مسخ شدہ چہروں کو آئینہ دکھاتا ہے۔ روزمرہ کی معمولی معمولی چیزیں جیسے جوتا، مچھر، گدھا یا الو اس منظر نامے کے علائم ہیں اور ان استحصالی قوتوں، بڑی سے بڑی شخصیتوں کی لوٹ کھسوٹ، منافع خوری اور کرپشن کو منظر عام پر لاتا ہے اور ان پر بھرپور طنز کرتا ہے۔ ان کا لہجہ عوامی ہے جو سیدھا دلوں پر اثر کرتا ہے عوام کے مسائل عوام کی زبان میں ان کی مقبولیت کے ضامن ہیں۔ وہ اپنی طویل نظموں کے ذریعے عوامی ذہن میں غصہ، نفرت اور شدید ردعمل پیدا کرکے ایک ذہنی انقلاب کی راہیں ہموار کرنے میں مصروف ہیں۔ وہ ہر فرد کو قوت وجرأت اور ذہنی آزادی کا پیکر دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ آزادیِ انسان کی حرمت کو پامال کرنے والوں، پاکیزگی روح کے تاجروں اور منافع خور بھیڑیوں کے خونیں جبڑوں میں پستے ہوئے عوام کو عہد نو کی بشارت دیتے ہیں۔ ان کی جنگ دوربینی سے لے کر جہاں بینی تک اور ادراک سے اظہار تک جاری ہے۔ ان کی شاعری بدصورتی، پامالی، استحصال، ظلم، لوٹ کھسوٹ اور بے ایمانی کے منہ پر ایک زناٹے دار طمانچہ ہے۔ وہ برصغیر کے مقبول عوامی فن کار ہیں''۔

ہلال سیوہاروی کی طنزیہ ومزاحیہ نظموں میں 'خوں بہا، مشورہ برائے مشاعرہ، غالب ہمدرد دواخانہ میں، غالب گھر، مچھروں سے پریشان ہوکر، اے ایمرجنسی، جوتا، سرخ بادل، نہرو عالم ارواح میں، کتوں کی کانفرنس، انگوٹھا چھاپ اور خون کی مانگ جیسے بھرپور طنزیہ ومزاحیہ شاعری کے ناقابل فراموش نمونے ہیں جنھیں اردو شعروادب میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

ہلال سیوہاروی کی فکری اور فنی جہات کے تناظر میں یہ بات بالکل درست ہے کہ اگر ان کی تخلیقی رو طنز ومزاح کی طرف نہ مڑ جاتی تو وہ ایک جواں فکر غزل گو کی حیثیت سے یقیناً مقبول ومشہور ہوتے، ان کی غزلوں اور نظموں کے دو خوبصورت مجموعے 'فریب سحر' اور 'فریب نظر' غزل کی تہذیبی روایات کی پابندی کے ساتھ عصری اسلوب اور فنی خوش سلیقگی کے بہترین مرقعے ہیں۔ اسی طرح ان کی نظمیں بھی جذبوں کی شدت، مشاہدے کی گہرائی اور جدید نظم کے تقاضوں کے مطابق سہل ممتنع اور سادہ وپراثر لہجے سے مزین ہیں۔ ان کے دو مختصر طنزیہ ومزاحیہ مجموعے 'انگوٹھا چھاپ' اور 'اگر برا نہ لگے' طنز ومزاح کے بڑے بڑے ضخیم مجموعوں پر اپنی اثر آفرینی کی وجہ سے بھاری پڑتے نظر آتے ہیں۔ یہ دونوں مجموعے دیوناگری رسم الخط میں بھی شائع ہوچکے ہیں۔ ہلال سیوہاروی کو مشاعروں میں بے پناہ شہرت حاصل ہوئی، جس سے ان کی اقتصادی حالت بھی مستحکم ہوئی لیکن ان کی سادہ مزاجی اور غیور طبیعت نے اپنی کتابوں کی باقاعدہ اشاعت اور تنقید نگاروں و مدیرانِ جرائد کی نظر کرم کی جانب کبھی توجہ نہیں دی، جس کی وجہ سے مشاعروں سے کنارہ کش ہونے کے بعد ان کی شہرت کو بہت ضعف پہنچا ہے یہ وقت کا تقاضا ہے کہ اس کہنہ مشق اور منفرد فکر رکھنے والے طنز نگار شاعر کی حیات اور کارناموں پر باقاعدہ تحقیقی اور تنقیدی کام کیا جائے اور ان کی نگارشات کو جدید معیار کے ساتھ شائع کیا جائے۔ اسے اردو زبان کی توسیع اور ترقی کے لیے پرخلوص اردو دانشوروں کو ایک فرض منصبی کی طرح محسوس کرنا چاہیے۔ اس ضمن میں یہ کہنا چاہوں گا کہ اترپردیش اردو اکادمی کو اس جانب خصوصی توجہ دینی چاہیے۔ یہ ذمے داری دہلی اردو اکادمی پر بھی عاید ہوتی ہے کیونکہ دہلی کی ادبی فضائیں چار دہائیوں تک ہلال سیوہاروی کی صدائے انقلاب سے معمور رہی ہیں، مجھے یقین ہے کہ ہلال صاحب کو 45-40 سال تک سننے اور ان کو جاننے والے ہزاروں بالغ نظر اصحاب بھی ان معروضات پر سنجیدگی سے غور فرمائیں گے۔

(بشکریہ: روزنامہ 'راشٹریہ سہارا')

مطبوعات

• فریب سحر (غزلیں، نظمیں) • فریب نظر (غزلیں، نظمیں) • انگوٹھا چھاپ (طنز ومزاح) • اگر برا نہ لگے (طنز ومزاح) **(ہندی رسم خط میں)** • دھندلا سویرا • اگر برا نہ لگے **(ایوارڈ)** • غالب ایوارڈ (برائے شاعری 1987) • نیز ملک وبیرون ملک کئی ادبی انجمنوں کی جانب سے اعزازات

■

FAROOQ ARGALI,25, Ganesh Park,
Rasheed Market, Delhi-110051
E-mail: argali70@gmail.com

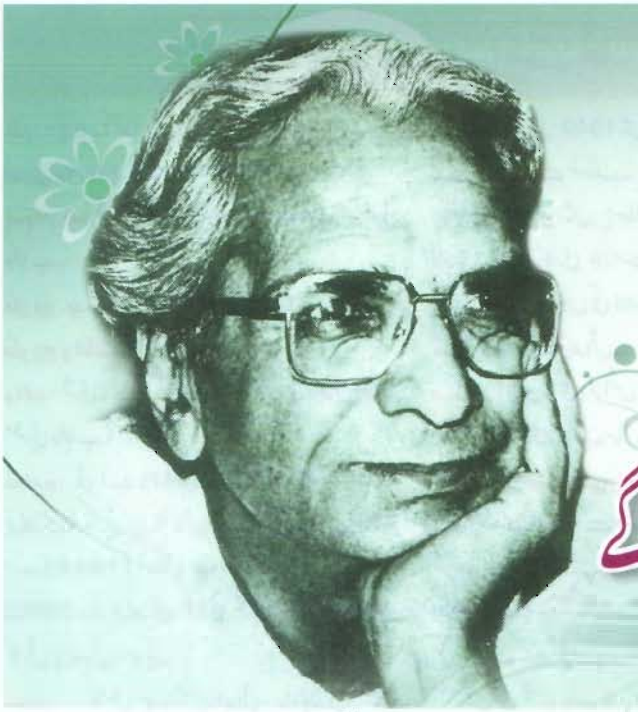

عبدالحی

دیویندر اسر
خوشبو بن کے لوٹیں گے

(14 اگست 1928-6 نومبر 2012)

ایک خاموش طبع متین و نفیس انسان، خوبصورت نقرئی بال، صاف اور میٹھی آواز کے مالک، معلومات کا بحر بیکراں ایک شفیق استاد، زمانے کی بے اعتنائی و بے مروتی سے نبرد آزما ایک مفلوک الحال افسانہ نگار، ایک کامیاب اور حقیقت پسند صحافی و نئے دور کے ممتاز نقاد دیویندر اسر بھی اب ہمارے بیچ نہیں ہیں!

دیویندر اسر سے میری پہلی ملاقات ستمبر 2002 میں ہوئی تھی جب میں جے این یو میں ایم اے کا طالب علم تھا اور وہ وہاں ماس میڈیا اور کمیونیکیشن تھیوری پڑھانے آتے تھے۔ پہلی دفعہ جب وہ کلاس میں آئے تو کلاس میں کسی بھی طالب علم کو ایسا محسوس نہیں ہوا کہ یہ منحنی سا شخص دیویندر اسر ہے، جس نے خوشبو بن کے لوٹیں گے، پرندے اب کیوں نہیں اڑتے اور مستقبل کے روبرو جیسی تحریریں ہمیں دی ہیں اور اردو زبان و ادب کو ایک نئے اسلوب سے متعارف کرایا ہے۔ انھوں نے خود ہی اپنا تعارف کرایا اور اپنے بارے میں جب بتایا تو ہم سبھی طالب علم ان کی سادگی و پرکاری سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔

دو چار کلاسوں کے بعد ہم ان سے کافی گھل مل گئے اور مختلف موضوعات پر ان سے کافی گفتگو ہونے لگی۔ وہ ہمارے سبھی سوالوں کے جوابات بڑی تفصیل سے دیا کرتے تھے اور اس بات پر خصوصی توجہ دیتے تھے کہ ان کی باتیں ہماری سمجھ میں آجائیں۔

دیویندر اسر سے ملاقات تو جے این یو میں ہوئی تھی لیکن ان کے بارے میں مکمل جانکاری نند کشور وکرم کے ترتیب دیے ہوئے عالمی اردو ادب 1995 سے حاصل ہوئی۔ اس خاص شمارے کے مطالعے سے ہم پر دیویندر اسر کی شخصیت واضح ہوئی کہ ہم جس استاد سے عوامی ذرائع ترسیل کے بنیادی نکات پڑھ رہے ہیں وہ کوئی معمولی شخص نہیں بلکہ ایک کامیاب افسانہ نگار، ناول نگار، ڈرامہ نگار، ناقد، ادبی صحافی، ترجمہ نگار اور محقق و دانشور ہے۔ انھوں نے اردو، ہندی، انگریزی اور پنجابی زبانوں میں اپنی تحریروں کے رنگ رنگ جلوے بکھیرے ہیں۔ 1950 کے بعد ابھرنے والے ادیبوں میں دیویندر اسر واحد ایسے ادیب تھے جو اردو ادب کے ساتھ ساتھ ہندی اور پنجابی ادب میں بھی اہم مقام رکھتے ہیں۔ ابھی تک کی زندگی میں جن استادوں نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے ان میں دیویندر اسر خاص ہیں۔ کلاس میں دوران گفتگو وہ میرے غیر موضوع سوالات سے کبھی ناراض نہیں ہوئے۔ میری کم علمی کو نظرانداز کرتے ہوئے انھوں نے میڈیا، سماج، ادب اور عوام سے متعلق سبھی سوالات کا تشفی بخش جواب دیا۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ ایک دن میں کلاس نہیں جاسکا تھا تو انھوں نے جے این یو کے شعبہ اردو سے میرے ہاسٹل فون کروایا اور مجھے بلوایا۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جو مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ یہی نہیں اگر میں نے کوئی لکچر چھوڑ دیا تو انھوں نے دوسرے دن مجھے الگ سے وقت دیا۔ مانسون سمسٹر کے اختتام پر ان سے ملاقات نہیں ہو پاتی تھی، ان کے لکچرس، سادہ گوئی، خوش خلقی اور محبت و شفقت نے مجھے اس قدر متاثر کیا کہ میں ان کا پتہ ڈھونڈھتا ہوا ان کی رہائش گاہ B-3 جنک پوری پہنچ گیا۔ وہاں وہ مجھ سے اس قدر گرم جوشی سے ملے کہ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں اپنے والد سے مل رہا ہوں۔ ان کا گھر تو کافی بڑا ہے لیکن وہ ایک چھوٹے سے کمرے تک ہی محدود تھے۔ کمرے میں کتابوں کا انبار تھا۔ ان میں اردو انگریزی، ہندی اور پنجابی زبان کی کتابیں تھیں۔ ساتھ میں چھوٹا سا دالان تھا اور کھانے پینے کی تمام اشیا و چائے کے سامان رکھے تھے۔ انھوں نے خود ہی چائے بنائی اور بسکٹ، پھل و نمک پاروں کے ساتھ چائے پیش کی۔ میں نے کافی منع کیا کہ جناب ان تکلفات کی ضرورت نہیں لیکن انھوں نے خود ہی سارے انتظامات کیے۔ مجھ سے نہیں رہا گیا اور میں پوچھ بیٹھا کہ جناب آپ اس عمر میں خود کیوں چائے بنا رہے ہیں۔ ان کا جواب آج بھی مجھے یاد ہے، برخوردار یہ بھی زندگی کے تجربے ہیں انسان کو سبھی طرح کے کام کرنے آنے چاہئیں۔ ان کے اس جواب کے بعد مجھے کچھ اور پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ ان سے کافی دیر باتیں ہوتی رہیں اور انھوں نے اپنی دو کتابیں بھی دیں۔

دوران گفتگو میں نے انھیں بتایا کہ نند کشور وکرم کے رسالہ 'عالمی اردو ادب' نے آپ پر جو خصوصی شمارہ شائع کیا ہے وہ میں نے کچھ دن قبل خریدا۔ وہ میری بات درمیان میں کاٹتے ہوئے کہنے لگے کہ وہ آپ کو

دیویندر اسر: سوانحی اشارے

نام: دیویندر ناتھ اسر

ادبی نام: دیویندر اسر

مقام پیدائش: حسن ابدال (پنجہ صاحب) مغربی پنجاب۔

تاریخ پیدائش: 14 اگست 1928،

تاریخ وفات: 6 نومبر 2012

والد: شری ناتھ اسر (ایڈوکیٹ، کیمبل پور (حال اٹک، مغربی پنجاب)

تعلیم: بی اے (1947) گورنمنٹ کالج (پنجاب یونیورسٹی) کیمبل پور (حال اٹک، مغربی پنجاب)، ایم اے (1949) معاشیات، الہ آباد یونیورسٹی، بی ایڈ (1953) دلی یونیورسٹی، کمیونی کیشن آرٹس (1974) کارنل یونیورسٹی، امریکہ

بچپن: کیمبل پور، حسن ابدال، راولپنڈی، تعلیم، پرائمری سے بی اے تک کیمبل پور میں۔

ادبی زندگی: کالج کی میگزین 'مشعل' میں مضامین سے آغاز۔ جن میں منٹو، ایک ادبی جراح، کچھ ٹیگور کے بارے میں اور مداوا، کتاب پر مضمون، انسانی زندگی کا معمار اعظم، ٹیپو سلطان، اور تبصرے وغیرہ شامل ہیں۔ 'مشعل' کے اسٹوڈنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ ادبی تربیت میں جناب ڈاکٹر غلام جیلانی برق (اردو)، ڈاکٹر محمد اجمل (فلسفہ اور نفسیات) اور جناب صدیق کلیم (انگریزی) نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔

پہلی کہانی: بہ عنوان 'چوری'، نسوانی دنیا، (لاہور) کے اگست 1946 کے شمارہ میں شائع ہوئی۔

پہلا ڈرامہ: 'بھوکے دیوتا' نظام ویکلی (بمبئی) 1947 میں شائع ہوا۔

پہلی ہندی کہانی: لیکن (پرتی کریا) 'ہنس' ہندی (بنارس) اکتوبر 1948 میں شائع ہوئی۔ (ہنس میں ہی شائع شدہ کہانی 'مکتی' مارچ 1949 کو سرکار نے قابل اعتراض قرار دیا۔ ہنس میں ہی پہلا ہندی مضمون شائع ہوا۔) بعد میں اردو، ہندی، پنجابی اور انگریزی میں افسانے اور مضامین متعدد رسالوں میں شائع ہوئے اور دوسری زبانوں میں ان کے تراجم ہوئے۔

ذریعہ معاش: 1949 میں کانپور میں روزنامہ 'امرت' کے ادارئیے سے منسلک۔ 1950 میں دہلی میں پرائیویٹ کالجوں میں پڑھانا شروع کیا۔ 26 اکتوبر 1959 میں سرکاری ملازمت اور انگریزی میں شائع ہونے والے رسالوں کی ادارت۔ 31 اگست 1986 میں ملازمت سے سبکدوش۔

سفر: ایران، اٹلی، فرانس، جرمنی، ڈنمارک، انگلینڈ، سوئٹزرلینڈ، کناڈا اور ایک سال کا قیام امریکہ میں۔

سماجی، سیاسی زندگی: کالج کے زمانے سے کمیونسٹ تحریک سے منسلک، طلبا کی تحریکوں میں شرکت، اور 1953 میں اس تحریک کو خیرباد۔

انجمن تحریک پسند مصنفین، الہ آباد اور کانپور کے سکریٹری کی حیثیت سے کام کیا۔ اُترپردیش انجمن ترقی پسند مصنفین کی مجلس عاملہ کا رکن۔ 'کلچرل فورم' (مختلف زبانوں کی ادبی انجمن) کا قیام اور کنوینر۔ جس کے صدر جناب پریم ناتھ در تھے۔

دائرہ عمل: کمیونی کیشن کے مختلف شعبوں میں اکادمک اور عملی سرگرمیاں۔ ہندی میں کمیونی کیشن کی کتاب 'جن مادھیم۔ سمپریشن اور وکاس' پر 'آل انڈیا بھارتیندو ہریش چندر ایوارڈ'، 'کینوس کا صحرا' (افسانوی مجموعہ) 'مستقبل کے روبرو' (تنقید) اور 'خوشبو بن کے لوٹیں گے' (ناول) پر انعامات۔ تخلیقی ادب پر دہلی اردو اکادمی ایوارڈ (1993) غالب انسٹی ٹیوٹ کا غالب انعام برائے نثر (2004)

ادارت: 'امرت' روزنامہ کانپور 'ارتقا' ماہنامہ کانپور، 'شعلہ' ماہنامہ کانپور 'راہی' ماہنامہ دہلی اور انگریزی میں کئی رسائل۔

تصانیف: اردو، ہندی، پنجابی، اور انگریزی میں 50 سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ہندی میں اردو کی کہانیوں، شاعری اور جدید ادب کی کتابیں پیش کیں۔ بالخصوص سعادت حسن منٹو، کی تحریروں کے کئی مجموعے شائع کیے جن میں 'منٹونامہ' منٹو پر تنقیدی انتھالوجی بحیثیت اپنی طرز کی پہلی کتاب کے مقبول ہوئی۔

افسانے: (1) گیت اور انگارے، آزاد کتاب گھر، کلاں محل، دہلی 1952، (2) شیشوں کا مسیحا، حلقۂ ارباب فکر، تین ہٹی، کراچی 1955، (3) کینوس کا صحرا، پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، جے 6 کرشن نگر، دلی 1983، (4) پرندے اب کیوں نہیں اڑتے، پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، جے 6، کرشن نگر، دلی 1992 **تنقید:** (5) فکر اور ادب، مکتبہ قصر اردو، اردو بازار، دلی 1958، (6) ادب اور نفسیات، مکتبہ شاہراہ اردو بازار، دلی 1963، (7) ادب اور جدید ذہن، مکتبہ شاہراہ اردو بازار، دہلی 1968، (8) مستقبل کے روبرو، پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، جے 6 کرشن نگر، دلی 1986 (9) ادب کی آبرو 1996، (10) نئی صدی اور ادب 2000 **ناول:** (9) خوشبو بن کے لوٹیں گے، پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، جے 6 کرشن، نگر دلی 1988 **ہندی افسانے:** (10) پھول بچہ اور زندگی (11) کالے گلاب کی صلیب (12) کراس پر لٹکی تصویریں (13) کہانی کا انت (14) پرندے اب کیوں نہیں اڑتے (15) آدمی پرندہ ہے (16) انوکھا اپہار **ہندی میں تنقید:** (18) چنتن اور ساہتیہ (19) ساہتیہ اور منووگیان (20) ساہتیہ اور آدھونک یگ بودھ (21) ساہتیہ، مکتی اور سنگھرش (22) بھوشیہ سے سمواد **ترتیب و تدوین:** (23) جن مادھیم (24) شبد ستارے (25) سیکس، ہنسا اور یوا پیڑھی (26) بھارتیہ سنسکرتی اور راشٹریہ ایکتا (27) اردو کی غزلیں (28) اردو کی ہاسیہ کہانیاں (29) اردو کی چرچت کہانیاں (30) سم کالین اردو کہانیاں (31) آدھونک اردو ساہتیہ (32) منٹو کی شریشٹھ کہانیاں (33) منٹونامہ (34) وِدروہ اور ساہتیہ (35) ساہتیہ سنگھرش اور پری ورتن (36) منٹو کی راجنیتک کہانیاں (37) منٹو عدالت کے کٹہرے میں (38) ماڈرن ہندی شارٹ اسٹوری **پنجابی:** (39) ساہتیہ اتے ادھنک چیتنا **انگریزی:** (40) Images of Kama (41)، Communication, Mass Media and Thought (Ed.) (42) Development

ترجمہ: (43) میری جیل ڈائری، جے پرکاش نارائن

بحوالہ: عالمی اردو ادب، 1995، مدیر: نند کشور وکرم

کہاں ملا کہیں دریا گنج اتوار بازار سے تو نہیں لیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ دریا گنج سے ہی لیا، لیکن سنڈے مارکیٹ سے نہیں۔ پھر وہ کہنے لگے کہ نند کشور وکرم میرا بڑا اچھا دوست ہے اور اپنی دوستی کے کئی دلچسپ قصے بھی سنائے۔ نند کشور وکرم نے مذکورہ شمارے کے پیش لفظ میں خاص طور سے یہ لکھا ہے کہ ''یہ خصوصی شمارہ دوستی کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کے مسلسل اور منفرد ادبی سفر کے اعتراف کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے جو گزشتہ پچاس برسوں سے جاری و ساری ہے۔''

دیویندر اسر نے جس محبت، خلوص اور خوش اخلاقی کے ساتھ مجھے ادب اور ذرائع ترسیل کے مختلف نکات سے واقف کرایا میں اس کے لیے ہمیشہ ان کا احسان مند رہوں گا۔ ان کے انتقال سے نہ صرف ادب بلکہ صحافت کا بھی بڑا نقصان ہوا ہے۔ یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ ان کی جگہ پر کرنے والا کوئی دوسرا نہیں ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ناقدین نے انھیں نظرانداز کیا اور جس مقام و مرتبے کے وہ اہل تھے وہ انھیں نہیں دیا گیا۔ وہ ہمیشہ ادبی محفلوں اور اعزاز و اکرام کی تقریبات سے دور رہے اور نہایت خاموشی سے کام کرتے کرتے موت کو گلے لگا لیا۔ انتقال کے ایک ہفتے بعد ان کی وفات کی خبر آئی۔ زندگی میں بھی وہ عام ادیبوں سے مختلف رہے۔ اور موت کے وقت بھی اپنی انفرادیت قائم رکھی۔ انھوں نے خود ہی لکھا تھا:

''انسان کتنی راہوں سے کتنی منزلوں سے ہوکر گزرتا ہے۔ زندگی کتنی مختصر ہوتی ہے اور سفر کتنا طویل جب میں باہر دیکھتا ہوں تو مجھے اپنے اور دوسرے میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ اور جب اندر جھانکتا ہوں تو دل پر چھوٹی بڑی، کٹی پھٹی الجھتی راہوں کا ایک جنگل ہے جہاں پگڈنڈیوں کے نشان گم ہوجاتے ہیں۔ ایک ایسا نقشہ ہے جس پر نیند میں یا مدہوشی میں ہی چلا جاسکتا ہے اور یہ سفر احساس، جذبے، خواب، دواسوپن، اور تخیل کی اڑان ہی طے کرسکتے ہیں کیونکہ یہ سفر ہچکاک کی گلی سے ہوکر گزرتا ہے۔ رابرٹ فراسٹ نے لکھا ہے کہ جنگل میں دو راستے الگ الگ تھے میں نے اس راستے کو چنا جس پر بہت کم لوگ گئے تھے۔ اور اس سے سب کچھ فرق ہوگیا۔''
(دیویندر اسر)

یہی دوسرا راستہ دیویندر اسر نے بھی اختیار کیا اور میری نظر میں وہ اردو کے نثری ادب کے رابرٹ فراسٹ ہیں۔ جس طرح رابرٹ فراسٹ نے اپنی نظموں میں اپنے درد و غم، تنہائی، مایوسی اور حقیقی زندگی کی مشکلات کو بیان کیا ہے اسی طرح دیویندر اسر کے افسانوں و ناول میں ایک بے نام سا درد و کرب جا بہ جا بکھرا نظر آتا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد ہندوستان کی ہجرت اور تقسیم کے مناظر کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھنا کچھ ایسے سانحے تھے جو پل پل انھیں بے چین کیے رہتے تھے۔ خود کو مڈنائٹ چائلڈ کہنے والے دیویندر اسر نے تشدد، نفرت اور فسادات کو بہت قریب سے دیکھا تھا اور انسانیت سے اُن کا اعتبار اٹھ گیا تھا۔ ان کے افسانوی مجموعے پرندے اب کیوں نہیں اڑتے، گیت اور انگارے، کینوس کا صحرا میں بھی زندگی کی المناک سچائیوں، مایوسیوں اور خالی پن کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ان کے افسانوں میں جدیدیت اور روایت کا خوبصورت امتزاج پایا جاتا ہے۔ ان کے افسانے قاری کو ایسی دنیا کی سیر کراتے ہیں جہاں انسان اُن کرداروں سے گفت و شنید کرتا ہے اور ان کے درد و کرب کو خود محسوس کرتا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد کی صورت حال کی منظرکشی ان کے افسانوں میں بہت بہتر انداز سے کی گئی ہے۔ ان کی کہانیوں کے بیشتر کرداروں کے پیچھے خود تخلیق کار کی ذات اپنے شب و روز کے ساتھ موجود ہے۔ ان کی کہانیاں ایک ایسے

دیویندر اسر نے جس محبت، خلوص اور خوش اخلاقی کے ساتھ مجھے ادب اور ذرائع ترسیل کے مختلف نکات سے واقف کرایا میں اس کے لیے ہمیشہ ان کا احسان مند رھوں گا۔ ان کے انتقال سے نہ صرف ادب بلکہ صحافت کا بھی بڑا نقصان ہوا ہے۔ یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ ان کی جگہ پر کرنے والا کوئی دوسرا نہیں ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ناقدین نے انہیں نظرانداز کیا اور جس مقام و مرتبے کے وہ اہل تھے وہ انہیں نہیں دیا گیا۔

انسان کی داستان ہے جس نے اپنا سب کچھ کھو دیا ہے اور اپنی بچی کھچی قوت کے ساتھ دوبارہ زندگی جینے کی ناکام کوشش کر رہا ہے۔

دیویندر اسر جہاں اپنی تحریروں میں اس قدر سنجیدہ اور بردبار نظر آتے ہیں وہیں حقیقی زندگی میں بذلہ سنجی اور ظرافت بھی ان کا خاص وصف تھا۔ مختلف اوقات میں انھوں نے اپنی شگفتہ بیانی سے کلاس کو مزید دلچسپ بنا دیا تھا۔ ادب، تاریخ و تمدن، فلسفہ، سماجیات، ذرائع ابلاغ، مذہب، سائنس، سیاست جیسے موضوعات پر اُن کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ یہ ہماری خوش بختی ہے کہ ہمیں ایسے استاد کی رہنمائی حاصل ہوئی۔

مجھے بخوبی اندازہ ہے کہ دیویندر اسر جیسے ادیب و ناقد پر لکھنے کے لیے جس مطالعے اور علم کی ضرورت ہونی چاہیے وہ مجھ میں نہیں ہے۔ یہ تحریر دیویندر اسر کی شفقت و محبت کی محض ایک ہلکی سی جھلک ہے اور وہ آج بھی مجھ جیسوں کے دلوں میں زندہ ہیں۔ وہ ادب کی دنیا میں خوشبو بن کے ہمیشہ آتے رہیں گے۔ قومی اردو کونسل نے حال ہی میں ایک کتاب 'اردو میڈیا' شائع کی ہے جس میں راقم الحروف کا بھی ایک مضمون ہے جس میں میں نے دیویندر اسر کے ترسیلی ماڈل، کا تذکرہ کیا تھا۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ انھیں یہ کتاب پیش کروں گا اور ہم ان سے اردو دنیا کے فلم نمبر کے لیے ایک مضمون لکھوائیں گے لیکن یہ ارادہ ایک خواب ہی رہ گیا۔ ان کی موت بہت پہلے ہی ہوچکی تھی۔ لیکن ان کے اندر کا فنکار اور تخلیق کار زندہ تھا جس نے زندگی کے نئے نئے تجربات و مشاہدات کو آپ بیتی اور آپ بیتی کو جگ بیتی بنا کر فن پارے کی صورت میں کاروانِ زندگی کا جز و بنا دیا تاہم ادبی و ثقافتی محافل سے روپوشی بساط حیات کے سمٹ جانے کے مترادف ہے۔ ایسی صورت میں ایک فنکار کو اگر فن کے مظاہرے کا خاطر خواہ موقع نہ ملے تو وہ چلتی پھرتی لاش ہوجاتا ہے۔ گرچہ اس کی نبض چل رہی ہو اور وہ سانس لے رہا ہو لیکن وہ مر چکا ہوتا ہے۔ دیویندر اسر شاید اُسی وقت مرچکے تھے جب وہ علیحدہ رہنے لگے تھے اور علمی و ادبی دنیا نے انھیں تنہا کر دیا تھا۔ اس موت کا اعلان خود انھوں نے اپنے ناول میں بھی کر دیا تھا۔ انھوں نے لکھا تھا:

''ہم نے زندگی جی ہے اور زندگی نے ہمیں جیا ہے۔ اپنی آزاد خواہش پر بھی مجبور ہوکر داخلی یا خارجی جبر سے بہت کچھ محسوس کیا ہے۔ تنہائی، دہشت، ایلی نیشن، غم، غصہ، حسد، مسرت، مایوسی، لغویت، عزم، دباؤ، ڈپریشن، ہر بار زندگی کا سامنا ایسے ہوتا ہے جیسے پہلی بار اس سے ملاقات ہوئی ہو۔ ایسے جزیرے میں داخل ہوئے ہیں جہاں کسی کے قدم نہیں پڑتے۔ ایسے جنگلوں میں جاتے ہیں جہاں کوئی پگڈنڈی نہیں اور جو بھی اس میں ایک بار داخل ہوتا ہے واپس نہیں آتا۔ یہ خلا سے بھی روبرو ہوتا ہے جسے صرف آپ کا وجود ہی پر کرسکتا ہے۔

... سوال تنہائی کا ہے۔ تنہائی دوسرے لوگوں سے الگ ہونے میں نہیں۔ یہ ایک ذہنی کیفیت ہے۔ داخلی تنہائی ایک حقیقت ہے اور میں نے محسوس کیا کہ میں ایک غار میں داخل ہوچکا ہوں۔ غار آگے سے بند ہے اور پیچھے ایک چٹان رکھ دی گئی ہے۔'' ('خوشبو بن کے لوٹیں گے')۔

دیویندر اسر اپنی تخلیق اور تخلیقی اسلوب میں سدا زندہ رہیں گے۔

■

شاہد اختر انصاری

بدعنوانی کے عفریت پر حکومت کی یلغار—1

حق اطلاعات قانون بدعنوانی کے خلاف اہم ہتھیار

سات سال پہلے ہندوستانی آئین کے رہنما خطوط کا احترام کرتے ہوئے ،ملک کے عوام کو سرکاری و عوامی امور کی جانکاری لینے کا جو حق دیا گیا تھا اس کے مثبت نتائج سامنے آلگے ہیں ، اور آہستہ آہستہ قومی زندگی میں شفافیت لانے کے اس عمل کا پہیہ گھومنے لگا ہے جو برسوں سے رکا ہوا تھا ۔ سرکاری اور انتظامی امور میں شفافیت ہی وہ اسم اعظم ہے جو ملک کو بدعنوانیوں کے عفریت سے نجات دلا سکتا ہے ۔ اس عمل کو مزید تقویت دینے کے لیے ،ملک کی سوا ارب کی آبادی کو انفرادی شناخت نامہ مہیا کرانے کی کارروائی بھی شروع کی گئی تھی، تاکہ نہ صرف ترقیاتی منصوبہ کاری میں قومی سطح پر ارتباط لایاجا سکے بلکہ عوام کو ایک تسلیم شدہ اور معتبر شناخت نامہ کی عدم موجودگی کی بنا پر جو سماجی اور سیاسی پریشانیا ں جھیلنی پڑتی ہیں ان سے بھی نجات مل جائے۔29ستمبر 2010کی ایک تقریب میں متحدہ ترقی پسند محاذ کی چیئر پرسن محترمہ سونیا گاندھی کی موجودگی میں وزیر اعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ نے نندربار مہاراشٹر کے قبائلی گائوں تمبھلی کی ایک خاتون رنجنا سوناونے کو پہلا 'آدھار کارڈ' پیش کر کے 'آدھار پروگرام' کا افتتاح کیا۔ اس شناختی کارڈ میں متعلقہ شخص کا نام، تاریخ پیدائش، تصویر، جنس، اور آنکھوں کی پتلیوں کی کمپیوٹرائزڈ امیج کے علاوہ کارڈ کا ایک 12ہندسوں والاانفرادی نمبر بھی شامل ہوتا۔اگرچہ آدھار کارڈ شہریت کا حتمی ثبوت نہیں ہے لیکن شہریت کو ثابت کرنے میں اس سے مدد ضرور ملتی ہے ۔حکومت نے اس کارڈ کے ذریعے سرکاری امدادی رقم ملک کے ضرورت مند طبقوں تک براہ راست پہنچانے کی اسکیم بھی وضع کی ہے اور اب پائلٹ پراجیکٹ کے ذریعے ملنے والی فیڈ بیک کی روشنی میں حکومت 'کیش ٹرانسفر' کی یہ اسکیم یکم جنوری 2013سے اسے ملک کی 18ریاستوں کے 51چننده اضلاع میں شروع کرنے کا ارادہ رکھتی ہے ، جس کے بعد ایک سال کے اندر اسے پورے ملک میں پھیلا دیا جائے گا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ 'کیش ٹرانسفر' اسکیم کے لیے سب سے بڑا چیلنج ہے ملک کی سوا سو کروڑ کی آبادی کو آدھار کارڈ فراہم کرنا!اوریہ کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے ۔زیر نظر کور اسٹوری کے دونوں مضامین میں، 'حق اطلاعات' کی تفویض کے ساتھ کرپشن کے خلاف شروع ہونے والی جنگ اور اب 'آدھار کارڈ' کے ذریعے بدعنوانیوں کے خلاف حکومت کے نئے منصوبے اور اس کے عوامل و عواقب کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے ۔(ادارہ)

بہت عرصہ قبل جب جمہوریت پر بحث چھڑی تو کئی دانشوروں اور فلاسفروں نے اس کی تشریح مختلف نقطۂ نظر اور زاویوں سے کی تھی لیکن ابراہم لنکن کے خیالات کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہوئے دنیا کے جمہوری ممالک نے جسے جمہوریت کی سب سے اچھی تشریح تسلیم کیا وہ یہ ہے:

Democracy is the government of the people, by the people and for the people.

یعنی جمہوریت عوام کی، عوام کے ذریعے اور عوام کے لیے چلائی جانے والی حکومت ہے۔ مختصر یہ کہ ایک ایسی حکومت جس کی باگ ڈور عوام کے ہی ہاتھ میں ہوگی اور حکومت بھی عوام کے ذریعے منتخب کی جائے گی۔ جمہوریہ ہند بھی اسی تشریح کی توضیح ہے۔ کہتے ہیں کہ سب سے کمزور جمہوریت بھی بادشاہت سے بہتر ہے۔ اس پس منظر میں اب اگر ہم جمہوریت کی تعریف کریں تو واضح ہوتا ہے کہ عوام ہی صحیح معنوں میں ملک کے بادشاہ ہیں اور عوام ہی ملک کے ذمے دار بھی۔

1947 میں جب ہندوستان آزاد ہوا تو ہمارے رہنماؤں نے اپنی صلاحیت، قابلیت اور حکمت عملی کے ذریعے آزاد ہندوستان کی نوک پلک کو سنوارنے میں لگ گئے اور انھوں نے اس ملک کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کی حتی الامکان کوشش کی۔ داخلہ اور خارجہ پالیسیوں سے لے کر معاشی اور تعلیمی حکمت عملی پر ہم نے اپنا کافی وقت صرف کیا۔ غریبوں اور کسانوں کے لیے کچھ پالیسیاں بنائیں۔ ذات پات کی دیوار کو پاٹنے کی کوشش ہوئی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان قائم نفرت سے چھٹکارا حاصل کرنے کی تمام تر کوششیں کی گئیں۔ تمام تر درپیش مسائل سے نمٹنے کی سبیل کی گئی۔ لیکن ترقی اور تجدید کاری کی اس تمام پیش رفت کے باوجود عوام اور انتظامیہ کے درمیان دوری بڑھتی چلی گئی۔ عوام حکومت کے نظم ونسق سے غیر اطمینانی کا اظہار کرنے لگے۔ اب انھیں اس بات کا خوف ستانے لگا کہ اقتدار پر قابض لوگ عوام کے تئیں نیک جذبہ نہیں رکھتے۔ بلکہ اپنے مفاد میں لگے ہیں۔ عوام اور انتظامیہ کے بیچ کی بڑھتی دوری نے وزارتوں اور محکموں میں بدعنوانی اور بے ضابطگی کو بڑھنے کا موقع فراہم کیا۔ لہٰذا اس کی جڑیں اتنی تہہ تک چلی گئیں کہ دیکھتے ہی دیکھتے پورے ملک میں وبا کی صورت اختیار کرگئی۔ عوام کو اس بات کا پتہ نہیں کہ وزارتیں کیا کررہی ہیں، محکمے کیا کررہے ہیں، کتنے منصوبوں اور اسکیموں پر کام ہورہا ہے۔ کتنے ایسے منصوبے جو صرف کاغذوں پہ چل رہے ہیں یا اس پر عمل آوری بھی ہورہی ہے۔ ان سب باتوں سے عوام لاعلم رہے۔ لیکن اس کے پس پردہ بدعنوانی اور بے ضابطگیاں بڑھتی چلی گئیں۔ جب یہ معاملات حد کو پار کرگئے اور بدعنوانیوں اور بے ضابطگیوں نے اپنی حدیں توڑ دیں تو عوام کا اعتماد اقتدار پر بیٹھے لوگوں سے اٹھنے لگا۔

ان نامساعد حالات میں حکومت ہند نے پارلیمنٹ میں اس پر شکنجہ کسنے یا بڑھتی بدعنوانیوں پر روک لگانے کی غرض سے ایک قانون منظور کرایا جس سے عوام کو یہ اختیار ہوسکے کہ وہ کسی بھی محکموں، وزارتوں اور شعبوں سے ایک درخواست دے کر متعلقہ امور کی جانکاری حاصل کرسکیں جسے حق اطلاعات قانون کا نام دیا گیا۔

1947 میں جب ہندوستان آزاد ہوا تو ہمارے رہنماؤں نے اپنی صلاحیت، قابلیت اور حکمت عملی کے ذریعے آزاد ہندوستان کی نوک پلک کو سنوارنے میں لگ گئے اور انھوں نے اس ملک کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کی حتی الامکان کوشش کی. داخلہ اور خارجہ پالیسیوں سے لے کر معاشی اور تعلیمی حکمت عملی پر ہم نے اپنا کافی وقت صرف کیا. غریبوں اور کسانوں کے لیے کچھ پالیسیاں بنائیں. ذات پات کی دیوار کو پاٹنے کی کوشش ہوئی. ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان قائم نفرت سے چھٹکارا حاصل کرنے کی تمام تر کوششیں کی گئیں. تمام تر درپیش مسائل سے نمٹنے کی سبیل کی گئی.

واضح ہو کہ آئین کے آرٹیکل 19 میں بیان کردہ حق اطلاعات کو بنیادی حق قرار دیا گیا ہے۔ آرٹیکل 19 کے مطابق ہر شہری کو بولنے اور اظہار رائے کا حق ہے۔ ہائی کورٹ نے اس بابت یہ فیصلہ دیا ہے کہ عوام جب تک جانیں گے نہیں، تب تک اظہار رائے نہیں کرسکتے۔ لہٰذا 2005 میں ملک کی پارلیمنٹ نے ایک قانون پاس کیا جسے حق اطلاعات قانون 2005 کے نام سے جانا جاتا ہے اس قانون کا اطلاق تمام ریاستوں اور ذیلی ریاستوں پر نافذ ہوتا ہے۔ جموں وکشمیر کا اپنا حق اطلاعات قانون ہے۔

اس وقت کم وبیش دنیا کے 65 جمہوری ممالک میں یہ قانون نافذ ہیں۔ اس قانون کے پارلیمنٹ میں نافذ ہونے سے قبل ملک کی مختلف ریاستوں نے قانونی شکل دے رکھی تھی۔ تامل ناڈو (1997)، راجستھان (1997)، گوا (2000)، دہلی (2001)، مہاراشٹرا (2002)، کرناٹک (2002)، آسام (2002)، مدھیہ پردیش (2003) اور جموں وکشمیر (2004)، (2009)، وغیرہ۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ حق اطلاعات قانون عوام سے زیادہ حکومت کے لیے فائدہ مند ثابت ہوا۔ انتظامیہ چوکنا ہوگئی اور نظم ونسق کا معاملہ چست ودرست ہونے لگا۔ جب تک اس قانون کا قیام عمل میں نہیں آیا تھا تو ملکی اور ریاستی سطح پر ترقیاتی کاموں، منصوبوں اور اسکیموں کی جانکاری حاصل کرنا دشوار کن مرحلہ تھا۔ قانون حق اطلاعات کے تحت جانکاریاں مانگی گئیں تو چونکانے والی سچائیاں سامنے آئیں کہ کس طرح ترقیاتی منصوبوں کے پس پردہ محکمے اور دفاتر بدعنوانیوں اور بے ضابطگیوں سے گھرے ہیں۔ سرکاری دفتروں کا یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے کہ ایک محکمہ دوسرے محکمے کے اندرونی اور داخلی معاملے میں مداخلت نہیں کرتا۔ تاہم قانون حق اطلاعات نے اس طرح کے درپیش مسائل کو حل کردیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج مختلف نوع کی بدعنوانیاں اور بے ضابطگیاں منظر عام پر آرہی ہیں۔ قانون کے نافذ ہوجانے کے بعد انتظامیہ اور عوام کے درمیان دوریاں کم ہوگئیں۔ لوگ سرکاری کام کاج پر نگاہ رکھنے لگے اور عوام اپنی بیداری کا ثبوت ترقیاتی کاموں کی جانکاری حاصل کرنے میں پیش کی ہے۔

قانون حق اطلاعات ملک کے تمام شہری کو یہ اختیار دیتا ہے کہ عوام حکومت سے کوئی بھی سوال پوچھ سکے یا کوئی بھی اطلاع لے سکے۔ کسی بھی سرکاری دستاویز کی مصدقہ کاپی لے سکے کسی بھی سرکاری دستاویز کی جانچ کرسکے یا کسی بھی سرکاری کام میں استعمال شدہ چیزوں کا مصدقہ نمونہ لے سکے۔ اطلاعات کا مطلب یہ ہوا کہ کوئی بھی دستاویز یا انفارمیشن کسی بھی شکل میں ہو۔ مثلاً ریکارڈ دستاویز، میموز، ای میل، رائے، مشورہ، پریس ریلیز، سرکولر، حکم نامہ، لوگ باکس، اگری منٹ، سمپل، ماڈل، ڈاٹا میٹریل وغیرہ سب سے جانکاری حاصل کرسکتا ہے۔

جن معاملوں سے متعلق اطلاع نہیں دی جاسکتی ان کی وضاحت حق اطلاعات قانون کی دفعہ 8 میں درج ہے۔ جو ملک کی سالمیت قومی مفاد پر قائم ہے۔ ملک کی سرحدوں کی حفاظت اور نگہبانی کرنے والی ایجنسیاں بھی اس سے مستثنیٰ رکھی گئی ہیں۔ لیکن حقوق انسانی کی حق تلفی اور بدعنوانیوں کے الزامات کی بنیاد پر جانکاری مانگی

جاسکتی ہے۔اس کے لیے مرکزی انفارمیشن کمیشن یا ریاستی انفارمیشن کمیشن سے اجازت لینی ہوگی۔

وہ ادارے اور ایجنسیاں درج ذیل ہیں:

I.B. Director General of income tax investigation. RAW, Central bureau of investigation . Directorate of revenue intelligence, Central economic intelligence bureau, directorate of enforcement, Narcotics control bureau. Special frontier force BSF, CRPF, ITBP, CISF, NSG, CID, Etc.

مندرجہ بالا نکات کا ذکر اس لیے لازمی تھا کہ عوام کسی طرح کے ابہام و مغالطے میں نہ رہے۔ عوام اس قانون کا استعمال کب اور کیسے کریں اور اس بات کی کس سے جانکاری مانگی جائے اس کا جواب دہندہ کون ہوگا یہ کچھ ایسے سوالات ہیں جس کی تفصیلات وضاحت طلب ہیں۔

حق اطلاعات کے ذریعے پوچھے گئے سوالات یا مانگے گئے دستاویز وغیرہ کی جانکاری یا جواب دینے کے لیے دفعہ 2 (الف) اور (ھ) کے ماتحت محکمے میں ایک یا ایک سے زیادہ پبلک انفارمیشن آفیسر بنائے گئے ہیں جو PIO اور APIO کہلاتے ہیں۔ یہ وہ آفیسر ہیں جو حق اطلاعات قانون کے تحت درخواست قبول کرتے ہیں۔ اور اس درخواست کنندہ کی مانگی گئی اطلاعات مہیا کراتے ہیں۔ سرکار نے مرکزی محکموں اور دفتروں کے لیے پورے ملک میں 629 ڈاک خانوں کا انتخاب کیا ہے جہاں عرض داشت یا درخواست کنندہ دس روپے فیس جمع کرکے اطلاعات حاصل کرسکتے ہیں لیکن ریاستوں کے لیے یہ فیس اس کے متعلقہ دفاتر میں درخواست کے ساتھ ڈی ڈی، منی آرڈر، پوسٹل آرڈر اور کورٹ فیس ٹکٹ کے ساتھ چسپاں کرکے اطلاعات مانگی جاسکتی ہیں۔ بی پی ایل کارڈ یافتہ کے ذریعہ اطلاع مانگے جانے پر کوئی فیس نہیں لی جاتی ہے۔ دفعہ (5) میں دستاویز کی کاپی لینے کے لیے مرکزی حکومت نے فی کاپی 2 روپے فیس رکھی ہے۔ تاہم ریاستوں نے اس کی کچھ الگ فیس کا انتظام رکھا ہے۔

درخواست جمع کرنے کے بعد پبلک انفارمیشن آفیسر کی ذمے داری ہے وہ 30 دنوں کے اندر (کچھ معاملوں میں 35 دنوں کے اندر) اطلاعات مہیا کرائے، اگر پبلک انفارمیشن آفیسر درخواست لینے سے منع کرتا ہے یا مقررہ وقت میں اطلاعات مہیا نہیں کراتا ہے۔ یا غلط، یا غیر تشفی بخش جانکاری دیتا ہے تو 250 روپے یومیہ کے حساب سے 25000 تک کا جرمانہ اس کی تنخواہ سے کاٹا جاسکتا ہے۔ ساتھ ہی اسے اطلاع بھی دینی ہوگی۔ پبلک انفارمیشن آفیسر کو یہ حق نہیں ہے کہ آپ سے معلومات طلب کرنے کی وجہ پوچھے۔ اگر اطلاع مقررہ وقت میں نہیں فراہم کرائی گئی تو اطلاع مفت دی جائے گی۔ دفعہ 7 (6) اگر کوئی پبلک انفارمیشن آفیسر یہ سمجھتا ہے کہ مانگی گئی اطلاع اس کے محکمے سے متعلق نہیں ہے تو یہ اس کا کام ہے کہ اس درخواست کو پانچ دنوں کے اندر متعلقہ محکمے کو بھیج دے اور درخواست دہندہ کو اس کی اطلاع بھی دے۔ ایسی صورت میں اطلاع ملنے کی مقررہ وقت 30 دن کی جگہ 35 دن ہوگی۔ پبلک انفارمیشن آفیسر کے درخواست نہ لینے، پریشان کرنے، زیادہ فیس مانگنے یا حق اطلاعات کے تحت مانگی گئی اطلاع کو نامنظور کرنے، نامکمل، غلط اطلاع دینے جیسی باتوں پر مرکزی یا ریاستی انفارمیشن کمیشن کے پاس شکایت کرسکتے ہیں۔ پبلک انفارمیشن آفیسر کچھ معاملوں میں اطلاع دینے سے منع کرسکتا ہے جن کی تفصیلات گزر چکی ہیں۔

یہ بات ذہن نشیں کرنی چاہیے کہ اگر پبلک انفارمیشن آفیسر مقررہ وقت کے اندر اطلاع نہیں دیتا ہے یا دفعہ 8 کا غلط استعمال کرتے ہوئے اطلاع دینے سے منع کرتا ہے یا دی گئی اطلاع سے اطمینان نہ ہونے کی صورت میں 30 دنوں کے اندر متعلقہ پبلک انفارمیشن آفیسر کے سینئر فرسٹ اپیلیٹ آفیسر کے پاس فرسٹ اپیل کی جاسکتی ہے۔ اگر آپ فرسٹ اپیلیٹ اپیل سے اتفاق نہیں رکھتے ہیں تو دوسری اپیل 60 دنوں کے اندر مرکزی یا ریاستی انفارمیشن کمیشن (جس سے متعلق ہو) کے پاس کرنی چاہیے۔ دوسری اپیل دائر کرنے کے لیے

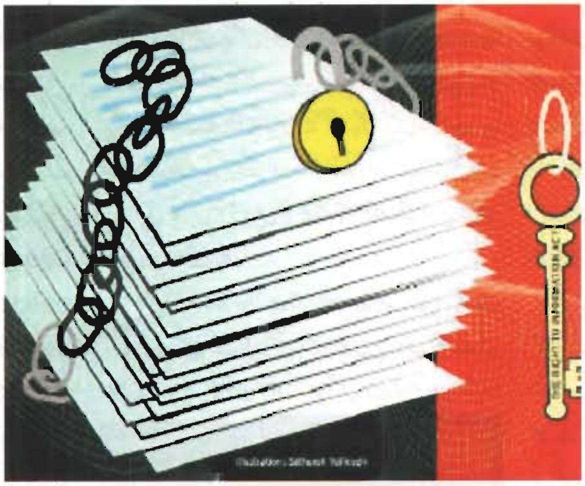

مرکزی محکمے یا دفاتر کے لیے کوئی فیس نہیں۔ البتہ ریاستوں میں اس کا فیس کی نوعیت کچھ الگ ہے۔ دوسری اپیل جمع کرتے وقت نئی درخواست کے ساتھ پہلی پیش کردہ عرض داشت کو ہوش مندی کے ساتھ شامل کریں، ورنہ درخواست مسترد ہونے کا خدشہ بنا رہتا ہے۔ اس اطلاع کے لیے آپ کو 90 دنوں کا انتظار کرنا ہوگا۔

آزادی کے اتنے سالوں کے بعد ڈاکٹر منموہن سنگھ کی قیادت والی یوپی اے سرکار نے ہندوستانی شہریوں کو یہ اختیار دے کر ان کی دیرینہ خواہش کی تکمیل کردی۔ حکومت ہر شعبے کے کام کاج میں شفافیت لانے کے لیے پابند عہد ہے۔ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کو کامیاب بنانے کے لیے عوام اور سرکار کے مابین دوری بالکل مٹادی گئی ہے۔ حکومت کسی بھی سماج کی ترویج و ترقی کے لیے اسکیمیں تو بناسکتی ہے لیکن ان اسکیموں پر عمل درآمد کرتے ہوئے ان سے مستفید ہونے کا کام تو ہمیں لوگ کرسکتے ہیں۔ تاکہ حکومت کا ہر منصوبہ و اسکیم پوری شفافیت کے ساتھ طشت از بام کیا جاسکے لیکن سالوں سے زنگ لگے سسٹم اور سرمایہ دارانہ ذہنیت رکھنے والے نوکر شاہی یا لال فیتا شاہی اس بات کو ہضم نہیں کرپارہے ہیں کہ کوئی عام آدمی حکومت کی کارکردگی یا ترقیاتی منصوبوں کے متعلق ان سے سوال پوچھے۔ اس لیے بیوروکریسی اور سرمایہ دارانہ ذہنیت رکھنے والے لوگ عوام کے درمیان خوف و ہراس کا ماحول پیدا کرنا چاہتے ہیں تاکہ اس طرح کی کوشش سے لوگ باز آجائیں اور ان کے کالے کرتوں کو افشانہ کیا جاسکے۔ ہمیں ان ریشہ دوانیوں اور سازشوں کا پردہ فاش کرنا ہے تاکہ ملک کی سالمیت کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہو۔ جن لوگوں نے ملک کی پوری معیشت پر اپنا پنجہ گاڑ رکھا ہے اسے اکھاڑ پھینکنا ذرا مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں۔ اس لیے ہمیں جو اختیارات دیے گئے ہیں اس کا فائدہ اٹھانا چاہیے۔ کچھ عرض داشتوں کے ساتھ ڈرانے دھمکانے کی بات سامنے آئی ہے۔ انھیں جھوٹے مقدمات میں پھنسا کر جیل میں ڈالا بھی گیا ہے اور کچھ لوگوں کو جسمانی اذیتیں بھی پہنچائی گئی ہیں۔ حکومت ایسے لوگوں کے خلاف سخت قانونی کارروائی کرے تاکہ لوگ بے خوف و خطر ہوکر دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کو استحکام پہنچاسکیں۔

■

بدعنوانی کے عفریت پر حکومت کی یلغار-2

عام آدمی کا 'آدھار': کرپشن کے خلاف نیا ہتھیار

■ شاہد اختر انصاری

کسی بھی ملک کے اصل اور قانونی طور پر جائز شہری کی شناخت کرنا ہمیشہ ایک بڑا مسئلہ رہا ہے۔ مختلف ملکوں میں مختلف زمانوں میں اس کے الگ الگ طریقے وضع کئے جاتے رہے ہیں۔ عام طور پر پاسپورٹ کو شہریت کا سب سے معتبر ثبوت اور دستاویز مانا گیا ہے۔ لیکن ایک تو تمام شہریوں کا پاسپورٹ بنانا بے حد دقت طلب کام ہے دوسرے اس میں ہیرا پھیری کا بھی بڑا امکان رہتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ضروری نہیں کہ پاسپورٹ بنانے کے عمل میں جو معلومات درخواست دہندہ کی طرف سے دی جاتی ہیں وہ سب کی سب درست ہوں۔ شہریت کے قانونی ثبوت کی اہمیت ماضی قریب میں شہریوں کی ایک دوسرے ملک میں تجارت یا دوسری ضرورتوں کے لیے سفر کرنے یا غیر ممالک میں کام اور قیام کرنے تک محدود رہی ہے۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزرا ہے اور دنیا نے ترقی کی ہے، شہریت کا ثبوت بہت سے سماجی، سیاسی اور معاشی شعبوں کے لیے بھی اہمیت اختیار کرتا گیا ہے۔ چنانچہ جن ملکوں میں جمہوریت ہے وہاں ووٹر آئیڈنٹٹی کارڈ بھی شہریت کے ثبوت کے طور پر قبول کر لیے جاتے ہیں۔ اسی طرح راشن کارڈ، ڈرائیونگ لائسنس، بنک کی پاس بک، زمینی مالکانہ حقوق کے کاغذات، یہاں تک کہ اسکول کارڈ کو بھی بعض ملکوں میں شہریوں کا شناختی ثبوت مان لیا جاتا ہے۔

عالمی پیمانے پر اگر نظر ڈالی جائے تو شناختی کارڈ کی ابتدا فرانس میں ہوئی۔ اس کی شروعات Workers Card کے نام سے 1803 میں کی گئی اور اس کا سلسلہ 1890 تک جاری رہا۔ 1912 میں Nomads کے نام سے اور اس کے بعد غیر ملکیوں کے لیے شناختی کارڈ کا دستور عمل میں لایا گیا۔ یہی صورتِ حال یورپ کے دوسرے ممالک میں پائی جاتی ہے۔ البتہ برطانیہ میں اس کی شروعات دوسری جنگ عظیم کے بعد کی گئی۔ ایشیائی ملکوں میں اس کی شروعات حالیہ برسوں میں ہوئی۔

ہندوستان میں سرحدی علاقوں بالخصوص شمال مشرقی ریاستوں میں سیاسی اور سماجی مسئلوں کے پیش نظر بھی شہریوں کے شناختی کارڈوں کی ضرورت محسوس ہوتی رہی ہے جس کے لیے حکومت نے کئی منصوبے بھی شروع کیے۔ لیکن پورے ملک کی آبادی کے لیے شناختی کارڈ بنانے اور اسے متعلقہ شخص کے بارے میں تمام تر معلومات اور اعداد و شمار کی کمپیوٹر فائل سے جوڑنا ایک بالکل ہی نیا نظریہ ہے، جس کی ضرورت ٹیکنالوجیکل ترقی نے ہی پیدا کی ہے اور جس کا حل بھی اسی نے نکالا ہے۔ اس کے تحت ہر شہری کا ایک منفرد شناختی کارڈ بنے گا اور یوں ہر شخص کی منفرد شناخت قائم ہو جائے گی جس میں کسی بھی طرح کی ہیرا پھیری نہیں کی جاسکے گی۔

بھارت کے شہریوں کے لیے ایک منفرد شناختی نمبر فراہم کرنے کی غرض سے ایک ادارے کا قیام فروری 2009 میں عمل میں آیا جسے بھارتی منفرد شناختی اتھارٹی (UIDAI) کا نام دیا گیا۔ دراصل یہ ان طبقے کے لوگوں کے لیے شروع کیا گیا تھا جن کے پاس کوئی دستاویزی ثبوت نہیں تھا، لیکن اس کی افادیت اور اس کے مضمرات کے پیش نظر اسے تمام ہندوستانی شہریوں کے لیے قابل عمل قرار دیا گیا۔ دوسرے ملکوں میں اسی طرح کے شناختی کارڈ موجود ہیں اور وہاں اسمارٹ کارڈ کا بھی رواج ہے لیکن بھارت کی آبادی کے تناظر میں اس مہم کو چھوٹے پیمانے پر ہی شروع کرنے میں بہتری سمجھی گئی۔ اسمارٹ کارڈ میں ایک شخص سے متعلق تمام تر معلومات کو شامل کیا جاتا ہے لیکن اس شناختی نمبر میں نام پتے کے علاوہ ہاتھ کی تمام انگلیوں کے نشان اور آنکھوں کی پتلیوں کی تصویر کے علاوہ ایک پاسپورٹ سائز تصویر شامل ہوتی ہے۔ بھارت کے پلاننگ کمیشن کے تحت کام کرنے والے اس ادارے نے اپنی اس مہم کا نام 'آدھار' رکھا جس کا لغوی معنی اردو میں بنیاد ہوتا ہے اور یقیناً اس میں کسی شخص کے بارے میں بنیادی معلومات درج ہوتی ہے۔

آدھار کی خاص بات یہ ہے کہ یہ بارہ ہندسوں پر مشتمل ایک منفرد نمبر ہے جسے ہندوستان کے تمام شہریوں کو حکومت کی جانب سے مفت فراہم کیے جانے کا پروگرام ہے۔

آدھار کارڈ دراصل لوگوں کو صرف آئی ڈی نمبر فراہم کرے گی جو کہ شناختی دستاویز ہے۔ اس میں درج نمبر سے ہی کسی شخص کے کوائف حاصل ہو سکتے ہیں۔ گویا یہ کسی شخص کے فون نمبر کی طرح ہے۔ حکومت کی جانب سے ملنے والی تمام مراعات کے لیے اس کا استعمال ہو سکے گا۔

نندن نلکانی UIDAI کے پہلے چیئرمین کی حیثیت سے جون 2009 میں منتخب ہوئے اس سے قبل وہ Infosys Technologies کے نائب چیئرمین تھے۔ انھیں اس کام کے لیے کابینہ کا درجہ دیا گیا ہے۔ انھوں نے آئی آئی ٹی سے میکینیکل انجینئرنگ کیا۔ انھیں کئی اعزازات سے نوازا گیا۔ 2006 میں پدم بھوشن دیا گیا اور اسی رواں سال میں Forbe Asia کی جانب سے Businessman of the year کا خطاب ملا۔ 2009 کے Times Magazine میں دنیا کے سو اثر و رسوخ والے لوگوں میں شمار کیے گئے ہیں۔

بھارتی منفرد شناختی اتھارٹی کے چیئرمین نندن نلکانی نے آدھار کارڈ کی اہمیت اور افادیت کو اس طرح پیش کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ UIDAI کے ذریعے جاری کیا جانے والا منفرد نمبر 'آدھار' آفاقی شناخت کے ڈھانچے کی بنیاد فراہم کرتا ہے جس پر سرکاری اور نجی ایجنسیاں اپنی خدمات کو کل ہند سطح پر ہندوستانی شہریوں کو فراہم کرسکتی ہیں۔ اور اپنے کاموں کے عمل در عمل کو بروئے کار لاسکتی ہے۔

حالیہ رپورٹ کے مطابق حکومت نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ پیسوں کی منتقلی کے معاملوں میں آدھار کا استعمال کرے گی جس کی عمل آوری آئندہ سال یکم جنوری سے کی جانے کی توقع ہے۔ حکومت کی جانب سے شہریوں کو دی جانے والی مراعات جیسے نریگا اسکیم، اندرا آواس یوجنا، اندرا گاندھی راشٹریہ وِردھا پینشن یوجنا، راجیو گاندھی گرامین وِدُھت یوجنا اور کسانوں کو دی جانے والی قرض اسکیم وغیرہ اسی آدھار کارڈ کے ماتحت دی جائیں گی تاکہ بچولیوں اور دلالوں سے نجات مل سکے۔

'آدھار' پروگرام کو تیزی سے آگے بڑھاتے ہوئے ہر دن 10 لاکھ لوگوں کو شامل کرنے کا ہدف رکھا گیا ہے۔ پہلی بار آدھار کارڈ کو 29 ستمبر 2010 میں مہاراشٹر کے ایک قبائلی گاؤں Tembhali کی رہنے والی Ranjana Sonawane کو وزیر اعظم ہند نے اپنے

ہاتھوں سے سونیا گاندھی کی موجودگی میں دیا۔ ملک کی یہ پہلی خاتون ہے جنھیں سب سے پہلے آدھار کارڈ پانے کا شرف حاصل ہے۔

25 اکتوبر 2012 تک آدھار کارڈ کی رکنیت حاصل کرنے والوں کی تعداد 21 کروڑ (210 ملین) بتائی گئی جو ملک کی پوری آبادی کا 17 فیصد ہے۔ اب تک جن ریاستوں نے ایک کروڑ تک ہدف پانے میں پیش رفت کی ہے ان میں آندھراپردیش مہاراشٹر، کرناٹک، مدھیہ پردیش دہلی اور پنجاب شامل ہیں اس کی وضاحت اس ذیل کی ٹیبل سے کی جاسکتی ہے—

آدھار کارڈ رجسٹر کرانے کے بعد بھی اگر آپ کا آدھار کارڈ حاصل نہیں ہوا تو اس کے متعلق آپ اپنے موبائل کے ذریعے یا آن لائن جانکاری حاصل کرسکتے ہیں۔ آدھار کارڈ کے رجسٹریشن کے وقت آپ کو اندراج سلپ ملی ہوگی۔ جس پر چودہ ڈجٹ کے ای آئی ڈی (EID) اور انرولمینٹ نمبر لکھے ہوتے ہیں جس کی مدد سے آپ اپنے موبائل پر SMS کے ذریعے مندرجہ ذیل طریقے سے معلومات حاصل کرسکتے ہیں جو موبائل نمبر آپ نے اندراج کے وقت فارم پر لکھا تھا اسی موبائل سے اپنے موبائل کے میسیج باکس میں ای آئی ڈی> ٹائپ کریں اور 51969 پر ایس ایم ایس کریں۔ اگر آپ نے کوئی بھی موبائل نمبر درج نہیں کرائے ہیں تو بھی کسی دوسرے موبائل سے مذکورہ طریقے سے ایس ایم ایس کرکے معلومات حاصل کرسکتے ہیں۔ اس سے صرف آپ کے آدھار کی موجودہ صورتِ حال کی اطلاع آپ کو دی جائے گی۔

اس کے علاوہ آن لائن بھی یہ سہولت دستیاب ہے۔ hhttp://eaadhar.uid/goov.in پر ڈاؤن لوڈ کرکے اسکرین پر دی گئی ہدایت کے مطابق خالی جگہوں کو بھریں۔ آپ کے آدھار کارڈ کی موجودہ صورتِ حال بتا دی جائے گی۔ جانکاری اس طرح ہوگی۔ ''آپ کا آدھار جاری کردیا گیا ہے''، ''آدھار جاری نہیں ہوا ہے'' یا ''آدھار بھیج دیا جائے گا۔ آدھار کارڈ کی اہمیت کے پیش نظر لوگوں کو چاہیے کہ اپنے آدھار کے تعلق سے بیدار رہیں۔ مستقبل میں آدھار کارڈ ہی شخصی شناخت کا سب سے اہم ثبوت مانا جائے گا۔ سرکاری اسکیموں، اسکول میں داخلہ، طلبا کے وظائف، بینک اکاؤنٹ، گیس کنکشن، فون کنکشن، ریلوے ریزرویشن اور تمام سرکاری کاموں میں آدھار کارڈ کی ضرورت پڑے گی۔

■

Dr. Shahid Akhtar Ansari, 38/7 Noor Nagar, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi - 110025

ملک کی مختلف ریاستوں میں جاری کیے گئے آدھار کارڈ

نمبر شمار	ریاست	آبادی	جاری کیے گئے آدھار کارڈ	آبادی کا فیصد
	ہندوستان	**1,210,593,422**	**210,234,909**	**17.37%**
1	آندھراپردیش	84,665,533	46,975,532	55.48%
2	مہاراشٹر	112,372,972	39,139,935	34.83%
3	کرناٹک	61,130,704	15,637,930	25.58%
4	کیرالا	33,387,677	12,082,484	36.19%
5	مدھیہ پردیش	72,597,565	11,862,751	16.34%
6	دہلی	16,753,235	11,664,709	69.63%
7	پنجاب	27,704,236	10,347,550	37.35%
8	اترپردیش	199,581,477	9,852,594	4.94%
9	راجستھان	68,621,012	9,059,766	13.20%
10	جھارکھنڈ	32,966,238	8,420,145	25.54%
11	تامل ناڈو	72,138,958	6,399,012	8.87%
12	گجرات	60,383,628	5,009,821	8.30%
13	ہماچل پردیش	6,856,509	4,137,863	60.35%
14	اوڈیشہ	41,947,358	3,660,944	8.73%
15	مغربی بنگال	91,347,736	3,158,285	3.46%
16	تری پورہ	3,671,032	2,899,153	78.97%
17	ہریانہ	25,753,081	2,281,809	8.86%
18	بہار	103,804,637	2,081,557	2.01%
19	گوا	1,457,723	1,019,496	69.94%
20	اتراکھنڈ	10,116,752	1,004,286	9.93%
21	پانڈیچیری	1,244,464	863,849	69.42%
22	چنڈی گڑھ	1,054,686	604,037	57.27%
23	سکم	607,688	473,796	77.97%
24	منی پور	2,721,756	427,431	15.70%
25	چھتیس گڑھ	25,540,196	311,495	1.22%
26	جزائرانڈمان نکوبار	379,944	158,912	41.83%
27	دمن ودیو	242,911	120,519	49.61%
28	ناگالینڈ	1,980,602	50,484	2.55%
29	جموں وکشمیر	12,548,926	43,934	0.35%
30	لکشدیپ	64,429	38,553	59.84%
31	دادرنگرحویلی	342,853	29,543	8.62%
32	آسام	31,169,272	17,590	0.06%
33	میزورم	1,091,014	8,446	0.77%
34	دیگر	4,346,618	390,698	8.99%

حسن رضا

لاشعور میں مادری زبان کی عمل داری

انسانی حافظہ یا یادداشت کی تین سطحیں ہوتی ہیں۔ شعور، تحت الشعور اور لاشعور۔ تحلیل نفسی کے اولین تجزیہ کار اور ماہر علم نفسیات سگمنڈ فرائڈ نے اس کی تمثیل پانی پر تیرتی ہوئی برف کی سل سے پیش کی ہے۔ اس نے یہ باور کرایا ہے کہ برف کا وہ حصہ جو پانی کے باہر ہوتا ہے، وہ انسانی شعور کی مثل ہے اور پانی میں ڈوبا ہوا حصہ لاشعور کے مصداق ہے، جب کہ درمیانی حصہ تحت الشعور کی مانند ہے۔ اول الذکر دونوں حصے بے حد موٹے اور تہہ دار ہوتے ہیں، جب کہ درمیانی حصہ اس قدر باریک ہوتا ہے کہ وہ کبھی شعور کی سطح فرازی کو مس کرتا ہے تو کبھی لاشعور کی سطح نشیبی کو چھو لیتا ہے۔

سند رہے کہ حافظہ اور یادداشت تک رسائی زبان کے وسیلے سے ہوتی ہے اور یہ زبان یقیناً مادری زبان ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ شعور و تحت الشعور کا سفر کرنے والا ذولسان، سہ لسان یا ہمہ لسان ہو، مگر اس کا یہ ذہنی سفر مادری زبان کی قیادت میں ہی ہوتا ہے کیونکہ مادری زبان انسان کی فطرت و جبلت کا جزو لاینفک ہوتی ہے۔ البتہ انسان مصلحتاً یا ضرورتاً مادری زبان کے علاوہ دوسری زبانوں کا بھی استعمال ترسیل و اظہار کے لیے کرتا ہے۔ وہ خارجی اظہار میں تو اپنی مادری زبان سے پہلو تہی کرسکتا ہے، مگر داخلی غور و فکر اپنی مادری زبان میں ہی کرتا ہے۔ مطلب یہ کہ انسان کے شعور، تحت الشعور اور لاشعور یعنی تینوں سطحوں پر مادری زبان حاوی ہوتی ہے اور حافظے کی جس سطح پر انسان عمل دخل سے قاصر ہو جاتا ہے، وہاں سے (یعنی تحت الشعور اور لاشعور سے) مادری زبان کی حکمرانی شروع ہو جاتی ہے۔

فرائڈ نے کہا ہے کہ شعور انسانی یادداشت کی سب سے بالائی سطح ہے۔ اس پر نقش یا ثبت شدہ باتوں یا واقعوں تک فوراً رسائی ہو جاتی ہے اور اس کا اظہار انسان فوراً مطلوبہ زبان میں کرسکتا ہے، خواہ وہ زبان مادری ہو یا غیر مادری، مگر تحت الشعور تک رسائی بمشکل اور بڑی ذہنی کثرت کے بعد ہوتی ہے۔ اس مرحلے میں ذولسان یا سہ لسان ہونے پر کشمکش بھی شروع ہو جاتی ہے۔ اس وجہ سے بھی حافظہ گڈمڈ ہونے لگتا ہے، لیکن لاشعور پر مکمل عمل داری مادری زبان کی ہوتی ہے۔ لاشعور انسانی حافظے کا وہ تاریک گوشہ ہے جہاں غیر اخلاقی، غیر سماجی، غیر قانونی اور غیر اسلامی خواہشات اور تقاضوں کا انبار لگا ہوتا ہے۔ یہی متروکہ خواہش، واقعات اور چاہتیں لاشعور میں محفوظ ہوتی رہتی ہیں جن کا اظہار خواب میں علامتی انداز سے ہوتا ہے، مگر تبادلۂ خیال اور غور و فکر کے لیے استعمال کی گئی زبان بہر طور مادری زبان ہی ہوتی ہے۔ اس مرحلے میں خود کلامی اور تخاطب عموماً مادری زبان میں ہوتا ہے، مگر مخاطب اگر دوسری زبان کا ہو اور متکلم بھی اس زبان میں گفتگو کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو تو ایسی صورت میں خواب دیکھنے والا غیر مادری زبان بھی استعمال کرسکتا ہے، مگر فطرتاً اور کثرتاً مادری زبان میں ہی خواب کا علامتی اظہار ہوتا ہے۔

لاشعور میں مادری زبان کی کارفرمائی کے جلوے ہم روزمرہ کی زندگی میں بھی دیکھ سکتے ہیں اور ان کا عمومی مشاہدہ وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا ہے۔ اس کے لیے ایک تاریخی واقعہ اور ایک عینی مشاہدہ پیش کر رہا ہوں۔

جرمن چانسلر ایڈولف ہٹلر (45-1936) نے اپنی جاسوسی تنظیم، گیسٹاپو، میں بڑے پیمانے پر خواتین کی تقرری کی تھی اور ان جرمن خواتین کو انگریزی زبان اور ثقافت کی خاطر خواہ تربیت بھی دلوائی تھی تاکہ برٹش کے درمیان رہ کر ان کے لائحہ عمل اور دیگر اہم اطلاعات سے وہ ہٹلر کو آگاہ کرتی رہیں۔ برٹش اہل کار اور افسران یہ جان کر بے حد متوحش اور متفکر تھے کہ ہٹلر ان کے ہر اقدام سے قبل ہی واقف کیسے ہو جاتا ہے۔ محکمہ سراغ رسانی کے برٹش سربراہ نے ایک مشکوک خاتون کے امتحان کے لیے یہ لسانی ترکیب نکالی کہ اگر فلاں خاتون واقعی برٹش ہوگی تو مطلوبہ تقریب میں پن چبھانے پر بے ساختہ کوئی انگریزی فجائیہ یا فجائی صوتی علامت نکلے گی کیوں کہ شدائد کی کیفیت میں ساری احتیاط دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ اس کا یہ حربہ آزمودہ اور کارگر ثابت ہوا۔ ایک تقریب میں پن چبھوتے ہی اس کے منھ سے بے ساختہ ایک مروجہ جرمن گالی نکل گئی اور وہ گرفتار کرلی گئی ہے یعنی وہ جرمن خاتون مادری زبان کی لاشعور عمل داری سے ہی بے نقاب ہوئی۔

ایک مذہب سے بے نیاز، مگر اعلیٰ انگریزی تعلیم سے آراستہ انجینئر خاتون کا اپنے ہم پیشہ خوبرو غیر ہم مذہب نوجوان سے معاشقہ ہو گیا اور بالآخر دونوں نے Court Marriage کرلیا۔ لڑکی نے جلد ہی شوہر کے مذہبی آداب اور مذہبی امور سیکھ لیے۔ اس دوران وہ حاملہ ہوگئی۔ زچگی کے لیے اس کا شوہر اسے اپنے گھر لے آیا۔ کئی مہینے گزرنے کے باوجود کسی کو اس کے غیر مذہبی ہونے کا گمان تک نہ گزرا، مگر جب زچگی کا وقت آیا اور دردزہ نقطہ عروج پر پہنچ گیا تو اس کے منھ سے بے ساختہ مذہبی کلمہ نکل پڑا اور اس کے سسرال والوں پر یہ راز منکشف ہو گیا کہ ان کی بہو غیر قوم اور غیر برادری کی ہے۔

مذکورہ دونوں واقعات مادری زبان کے اعزازات

اور کرشمہ سازیوں کو پیش کرتے ہیں اور یہ نتیجہ منتج کرتے ہیں کہ مادری زبان سے انسان کی فطرت کھلتی بھی ہے اور نکھرتی بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے تمام ترقی یافتہ ممالک مثلاً جرمنی، فرانس، جاپان، اٹلی وغیرہ نے ابتدائی تعلیم کے لیے مادری زبان کو ذریعۂ تعلیم لازمی قرار دے رکھا ہے، مگر ہم کوڑ مغزیا کوری تقلید کے دیوانے ہیں اسی لیے انگریزی ذریعۂ تعلیم کو ابتدائی درجوں سے ہی اپنا لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارے بچوں کے شعور پر تو تعلیمی زبان حاوی ہوتی ہے، مگر ان کے تحت الشعور اور لاشعور پر حکمرانی ان کی مادری زبان کی ہوتی ہے، جس سے ایک لامتناہی لسانی کشمکش جاری ہوجاتی ہے اور قوت حافظہ میں اکتسابی علوم اور مادری زبان کے ذریعہ حاصل شدہ واقفیت باہم خلط ملط ہوکر رہ جاتے ہیں۔ اس کا لازمی اثر یہ ہوتا ہے کہ مختلف نکات کے متعلق متعلم کا مافی الذہن (Concept) واضح نہیں ہو پاتا ہے۔ البتہ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے انگریزی زبان بطور ذریعۂ تعلیم زیادہ کارگر اور پراثر ہوسکتی ہے کیوں کہ انگریزی ایک بین الاقوامی زبان ہے جس میں مواد اور مسالے کی بھی کثرت ہے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ماں کی گود بچے کا پہلا مکتب ہوتی ہے اور اس مکتب کا ذریعۂ تعلیم بھی مادری زبان ہوتی ہے۔ Child Psychlolgy کے ماہرین تو یہاں تک تسلیم کرتے ہیں کہ بچے رحم مادر میں ہی اپنی ماں کی آوازوں کو سنتے ہیں اور خوشی سے مچلتے ہیں جسے عام بول چال میں بچے کا پیٹ میں چلنا کہا جاتا ہے۔ یہ ماہرین تو یہاں تک کہتے ہیں کہ تین ماہ کا ہونے پر بچے جو غوغاں کرتے ہیں، وہ اپنی ماں کی چہار حرفی آوازوں کی بے معنی تقلید کے طور پر کرتے ہیں۔ مثلاً دادا، نانا وغیرہ۔ اس اعتبار سے کہا جاسکتا ہے کہ مادری زبان انسان کی جبلت کا جز ہوا کرتی ہے اور جبلت لاشعور میں بھی بیدار رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مادری زبان کی عمل داری لاشعور میں بھی برقرار رہتی ہے۔ شیرخوار بچوں کا سوتے ہوئے مسکرانا یا کھلکھلا کر ہنس پڑنا بھی اسی لسانی عمل داری کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ مادری زبان ہر سن اور حافظہ کی ہر سطحوں پر فعال اور متحرک رہتی ہے اور فرد کو متحرک اور بیدار رکھتی ہے۔ خصوصاً لاشعور کی سطح پر۔

اظہار ایک مشکل ترین عمل ہے۔ ماہر نفسیات اور ماہر لسانیات دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ اظہار کا کوئی بھی وسیلہ داخلی کیفیات و احساسات کو بعینہٖ ظاہر نہیں کرسکتا۔ حتیٰ کہ زبان بھی جو تمام تر وسیلۂ اظہار میں شدید ترین اور حساس ترین ہے، کلیتاً ان احساسات و کیفیات کو مترشح نہیں کرسکتی۔ یہ تو ہر فرد کے اپنے حسی تجربات ہیں جن کے وسیلے وہ متکلم یا مقرر کے ان احساسات و کیفیات کو سمجھ لیتا ہے یا محسوس کرلیتا ہے جن کو زبان مترشح کرنے سے قاصر رہ جاتی ہے لیکن چوں کہ ہر فرد کے تجربات جداگانہ ہوتے ہیں اور ہر فرد کی محسوساتی قوت بھی جدا جدا ہوتی ہے، اس لیے احساس کی اس سطح کو شاید ہی کوئی مخاطب چھو پاتا ہے اور اگر یہ داخلی اظہار مادری زبان کی بجائے دیگر کسی زبان میں ہوتو معاملہ اور بھی مشکل ہوجاتا ہے۔

Abnormal Psychology میں ذہنی امراض کے تدارک کے لیے مختلف طریقۂ کار مثلاً Hypnosis method نفسیاتی تجزیاتی، طریقہ کار، حیاتیاتی تاریخی طریقۂ کار، جائزاتی طریقۂ کار، Rating, Interview method testing method, method وغیرہ اپنائے جاتے ہیں جن

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ماں کی گود بچے کا پہلا مکتب ہوتی ہے اور اس مکتب کا ذریعۂ تعلیم بھی مادری زبان ہوتی ہے Child Psychology کے ماہرین تو یہاں تک تسلیم کرتے ہیں کہ بچے رحم مادر میں ہی اپنی ماں کی آوازوں کو سنتے ہیں اور خوشی سے مچلتے ہیں جسے عام بول چال میں بچے کا پیٹ میں چلنا کہا جاتا ہے

میں دیگر زبانوں سے زیادہ مادری زبان کارگر ہوتی ہے۔ سائنس و حکمت، فلسفہ و منطق، علوم سماجیات و مذہبیات کے معاملے میں بھی مادری زبان زیادہ معاون ہوتی ہے۔ مثلاً اگر کسی کی مادری زبان فرنچ ہو اور وہ جرمن زبان میں سائنس پڑھ رہا ہو تو اسے ایک ساتھ دو محاذوں پر محنت کرنی پڑتی ہے۔ اولاً اسے جرمن زبان کے اصول و قواعد سیکھنے پڑتے ہیں اور دوم یہ کہ اسے سائنس کے رموز و نکات سمجھنے پڑتے ہیں۔ اس طرح اسے مطالعے کے دوہرے دباؤ سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں میں جہاں غیرملکی زبانیں پڑھائی جاتی ہیں، وہاں ایسے ہی طلبہ و طالبات داخلے کی اہلیت رکھتے ہیں جنھوں نے کم از کم گریجویشن کررکھا ہو یعنی یہ زبانیں کوئی ابتدائی تو کیا ثانوی درجوں میں بھی ان یونیورسٹیوں میں نہیں پڑھ سکتا۔ البتہ جن دو زبانوں میں گہری لسانی مماثلت، قواعد سے متعلقہ یکسانیت اور رسم الخط میں مشابہت ہو، ان میں تعلیم و تعلم کے دوران ایسی شکلیں پیدا نہیں ہوتی ہیں۔ مثلاً سنسکرت اور ہندی۔ ایسی ہی مماثلت اردو اور ہندی کے درمیان بھی ہے۔ بس تھوڑی سی پیچیدگی ہندی کے تتسم شبدوں اور مشکل اور ادق عربی و فارسی لفظوں سے پیدا ہوتی ہے ورنہ رسم الخط کے جداگانہ ہونے کے باوجود اردو اور ہندی کے درمیان زیادہ مغائرت نہیں ہے۔ جب کہ رسم الخط کی یکسانیت کے باوجود اردو، فارسی اور عربی کے درمیان قدرے مغائرت نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن کی مادری زبان اردو ہے، وہ ہندی پڑھنے، لکھنے اور سمجھنے میں زیادہ دشواری محسوس نہیں کرتے۔ جب کہ انھیں عربی و فارسی کا متن پڑھنے میں اس قدر دشواری نہیں ہوتی، جیسا کہ انھیں مفہوم رسائی میں دقت ہوتی ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اردو و ہندی کے قاعدے تقریباً یکساں ہیں۔ ان کے افعال و ضمائر بالکل مماثل ہیں جب کہ اردو، فارسی و عربی کے درمیان ایسی مماثلت نہیں پائی جاتی اگر اردو اور ہندی سے سنسکرت، عربی و فارسی کے اسما و صفات نکال دیے جائیں تو دونوں زبانوں کے بولنے اور سننے میں ذرّہ برابر بھی فرق نہ رہ جائے گا۔ اور اگر دونوں کے لیے ایک مشترکہ رسم الخط وضع کرلیا جائے تو تحریر کی یہ تفریق بھی مٹ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی طلبہ و طالبات جن کی مادری زبان اردو ہے، وہ بلا کسی دشواری کے ثانوی اور اعلیٰ تعلیم بذریعہ ہندی حاصل کرتے آرہے ہیں اور انھیں ہندی کے املا اور صیغوں پر ہندی داں طبقہ (جن کی مادری زبان ہندی ہے) سے زیادہ دسترس حاصل ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ہر مادری زبان کا اپنا رسم الخط نہیں ہے تو پھر اسے ذریعہ تعلیم کیسے بنایا جاسکتا ہے۔ یوں بھی ہندوستان کی بہت سی مادری زبانوں کی حیثیت بولی سے زیادہ کی نہیں ہے اور ان بولیوں کا نہ تو رسم الخط ہے اور نہ قواعد ہے۔ ایسی صورت میں مجھ ہیچ مداں کے خیال میں اس کا حل یہ ہوسکتا ہے کہ وہ بولیاں جن زبانوں سے زیادہ قریب تر ہوں، اسے ابتدائی درجوں کے لیے ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔ اس سے ابتدائی جماعتوں کے طالب علموں کو اس زبان سے اجنبیت محسوس نہیں ہوگی اور بیش تر مانوس اسما کی موجودگی سے انھیں اپنی مادری زبان کا احساس ہوگا۔ اس طرح ''معلوم سے نامعلوم'' کا سفر آسان ہوجائے گا۔

■

Dr. Hasan Raza, Maripur Raod No. 2
Muzaffarpur-482001

صادق

اردو کی اولین نثری نظم اور منٹو

''تحقیق میں کوئی حرفِ آخر نہیں ہوتا۔''

یہ نکتہ میرے زمانۂ طالب علمی ہی میں استادوں نے اچھی طرح ذہن نشین کرا دیا تھا۔ ایک استادِ محترم ترکی زبان کے ماہر تھے۔ انھوں نے ترکی، فارسی اور اردو کی ادبی تاریخوں سے کئی مثالیں پیش کی تھیں۔ دوسرے استادِ محترم نے فارسی، اردو اور دکنی کے علاوہ انگریزی ادب سے مثالیں دے کر اس نکتے کی خوب وضاحت کی تھی جس کے نتیجے میں یہ ہیچ مدان اس قابل ہوا کہ دہلی میں جب محترم رشید حسن خاں نے اپنے مخصوص انداز میں آنکھیں گھما کر ازراہِ کرم یہی نکتہ سمجھانا چاہا تو احقر کی زبان سے کئی ایسی مثالیں سن کر حیران رہ گئے جن سے موصوف کے کان نا آشنا تھے۔ جوشِ جواب میں سنسکرت کی مثال بھی نوکِ زبان پر جو آ گئی تھی۔

یہ بات یوں یاد آئی کہ اس وقت راقم نے منٹو کی شاعری پر لکھنے کے لیے قلم اٹھایا ہے اور اس ضمن میں منٹو کی ایک نثری نظم نذرِ قارئین کرنا چاہتا ہے، جو منٹو کے ایک مضمون سے حاصل ہوئی ہے۔ اس نظم کی بنیاد پر اسے اردو کا اولین نثری نظم نگار قرار دیا جا سکتا ہے۔ دعویٰ ہمیشہ دلیل کا مطالبہ کرتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اردو زبان میں نثری نظم کے آغاز پر بھی ایک نظر ڈالی جائے ہر چند کہ یہ ہمارے ماضی قریب کی بات ہے اور اس نوخیز صنف نے اردو ادب میں اب تک وقار و اعتبار بھی حاصل نہیں کیا ہے۔ تاہم گذشتہ پچاس برسوں میں نثری نظم کے بانی مبانی ہونے کا سہرا وقتاً فوقتاً کئی سروں پر باندھا جا چکا ہے۔

میں اردو کے اولین نثری نظم نگار ہونے کا دعویٰ کرنے والے مؤخرین سے صرفِ نظر کر کے، چھٹی دہائی میں منظرِ عام پر آنے والی ایک کتاب کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ کتاب کا نام ہے 'پگھلا نیلم' جو منٹو کے ہم عصر فکشن نگار اور ترقی پسند تحریک کے قائد سجاد ظہیر کی شعری تخلیقات کا مجموعہ ہے، جس میں صوتی آہنگ کو ملحوظ رکھ کر لکھی گئی نظموں کے ساتھ ساتھ چند ایسی نظمیں بھی شامل ہیں جو نثر میں ہیں یا یوں کہہ لیجیے کہ نثری نظمیں ہیں۔ ان نظموں کو لکھتے وقت سجاد ظہیر کے ذہن میں نثری نظم کا کوئی واضح تصور موجود نہیں تھا۔ لہٰذا انھوں نے مصنفانہ منصفی سے کام لیتے ہوئے اس حقیقت کا برملا اظہار بھی کر دیا تھا:

''میری ان تخلیقات میں شعریت تو ہے لیکن ان کی نوعیت ماقبل دور میں 'ادبِ لطیف' نام سے لکھی جانے والی نثر کی سی ہے۔ انھیں نظم نہیں کہنا چاہیے۔''

یہ 1964 کی بات ہے۔ اس کے کچھ عرصے بعد جب اردو میں جدیدیت کا شور و غوغا بلند ہوا اور نثری نظم کے چرچے ہونے لگے تو تیسرے درجے کے ترقی پسند نقادوں نے 'پگھلا نیلم' کی مذکورہ نظموں کو اردو میں نثری نظم کے اولین نمونے قرار دینے کے معاملے میں بڑی مستعدی دکھائی جب کہ نثری نظم کی 'وافی' شناخت نہ ان کے بس کی چیز تھی اور نہ ہی ان کے قارئین کی— سچ تو یہ ہے کہ اس عہد کے نثری نظم نگار خود بھی اس میدان میں ٹامک ٹوئیے ہی مار رہے تھے۔ اردو کے عصری رسائل و جرائد میں آئے دن چھپنے والی نثری نظمیں پڑھ کر لگتا ہے کہ بیش تر لوگ آج بھی یہی کر رہے ہیں۔

اگر سعادت حسن منٹو کے عہد میں نثری نظم نگاری کا آغاز ہوا ہوتا تو وہ یقیناً یہی کہتا کہ یہ کیا فراڈ ہے؟ لفظ 'فراڈ' اس کا تکیہ کلام نہیں تھا۔ کیونکہ منٹو نے اس لفظ کا استعمال کبھی بے محل نہیں کیا جب کہ گالیاں دینے کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جا سکتی۔

سجاد ظہیر کی نظموں کا مجموعہ 'پگھلا نیلم' 1964 میں منظرِ عام پر آیا۔ اس دہائی (1960 تا 1970) میں ترقی پسند تحریک کا بھٹہ بیٹھ رہا تھا اور ایک نیا بھٹہ تیار ہو رہا تھا جو جدیدیت کے میلان سے عبارت ہے۔ اسی اثنا میں اردو میں 'نثری نظم' کی اصطلاح وجود میں آئی۔ خدا نے

> یہ بات یوں یاد آئی کہ اس وقت راقم نے منٹو کی شاعری پر لکھنے کے لیے قلم اٹھایا ہے اور اس ضمن میں منٹو کی ایک نثری نظم نذر قارئین کرنا چاہتا ہے، جو منٹو کے ایک مضمون سے حاصل ہوئی ہے۔ اس نظم کی بنیاد پر اسے اردو کا اولین نثری نظم نگار قرار دیاجاسکتا ہے۔ دعویٰ ہمیشہ دلیل کا مطالبہ کرتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اردو زبان میں نثری نظم کے آغاز پر بھی ایک نظر ڈالی جائے ہر چند کہ یہ ہمارے ماضی قریب کی بات ہے اور اس نوخیز صنف نے اردو ادب میں اب تک وقار واعتبار بھی حاصل نہیں کیا ہے۔ تاہم گذشتہ پچاس برسوں میں نثری نظم کے بانی مبانی ہونے کا سہرا وقتاً فوقتاً کئی سروں پر باندھا جاچکا ہے۔

جنھیں 'کارِ تحقیق' کے ساتھ ساتھ 'خوئے جستجو' بھی عطا کی ہے وہ چھٹی دہائی میں شائع شدہ سجاد ظہیر اور حسن شہیر کی کتابوں کے علاوہ اس زمانے کے ادبی رسائل (اقدار، شب خون، انتخاب اور شعر و حکمت وغیرہ) میں احمد ہمیش اور راقم الحروف کی نثری نظموں کے ابتدائی نمونے تلاش کر سکتے ہیں۔

ایک بار خلیل الرحمٰن اعظمی نے طویل ادبی گفتگو کے دوران یہ بات بتائی تھی کہ 49-1948 میں بمبئی کے ایک ادبی رسالہ 'خیال' میں بسنت سہائے نامی کسی شخص کی چند نثری نظمیں شائع ہوئی تھیں۔ دورانِ گفتگو خلیل صاحب نے اس قیاس کا اظہار بھی کیا تھا کہ یہ نظمیں میراجی کی ہو سکتی ہیں۔

'خیال' میں شائع شدہ بسنت سہائے کی نثری نظمیں رسالۂ مذکور کے فائلوں میں دفن ہیں۔ وہ کہیں اور نقل نہیں ہوئیں۔ اگر ہوئی بھی ہوں تو اب تک میری نظروں سے نہیں گزریں۔ اس لیے ان کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بسنت سہائے فرضی نام بتایا گیا ہے۔ وہ نظمیں میراجی کی ہوں گی یہ محض قیاس ہے۔ مسئلہ تحقیق طلب ہے تاہم خلیل الرحمٰن اعظمی کے بیان پر اعتبار کر کے یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ ان نظموں کا خالق بسنت سہائے (یا اسی نام کے پردے میں میراجی) مبینہ نثری نظمیں 'خیال' کے 49-1948 کے کسی شمارے میں شائع ہوئی تھیں۔

آج یہ نظمیں دستیاب نہیں لیکن دستیاب ہو جائیں تو بھی بسنت سہائے یا اس کے نام کے پردے میں جو بھی ہو اسے اردو کا پہلا نثری نظم نگار تسلیم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ رسالہ 'خیال' کے اجرا سے چند برس قبل ممتاز افسانہ نگار سعادت حسن منٹو نثری نظم لکھنے کا تجربہ کر چکا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ منٹو نے یہ نظم 'زندگی' نامی ایک فلم پر تبصرہ کرتے ہوئے قلم بند کی تھی۔ یہ تبصرہ 'منٹو کے مضامین' نامی کتاب میں بھی دیکھا جا سکتا ہے جو 1942 میں پہلی بار لاہور سے شائع ہوئی تھی۔ نظم ملاحظہ ہو:

بلوری چوڑیوں نے کھنکناہٹ سے پوچھا:
''میں خوب صورت ہوں کہ تو؟''
عود کا دھواں آگ کے بستر سے پریشان ہو کر اٹھا
ہوا میں سانپ کی طرح اس نے بل کھا کر کہا:
''تو میرے سینے کا راز ہے یا میں؟''
فرشتے آسمان کی ہلکی پھلکی فضاؤں میں پر تول کر رہ گئے
اَبر بہار نے خزاں کی مٹھی کھولی
اور بلند درختوں سے سرگوشیاں شروع کر دیں
طلوعِ آفتاب کی آڑی ترچھی کرنوں کے شعور سے
اندھیارا گھبرا کے اٹھا اور بھاگ گیا
گاگر نے چھلکتے ہوئے پانی سے کہا:
'تو اتنا بے صبر کیوں ہے؟''
گھونگھٹ کے نیچے ایک کنوارے چہرے پر
نہ معلوم کتنے رنگ آئے اور چلے گئے

سوسن کے پھولوں میں شہد کی بھوری مکھیاں پڑی اونگھتی رہیں
آسی شبنم کی بوندوں کی مانند اس کے دل پر ٹپک رہی تھی
دروازے نے ہولے سے آہ بھری اور دہلیز کے ساتھ بغل گیر ہو گیا
تھرتھراتے ہوئے ہونٹوں پر ایک کپکپی منجمد ہوتے ہوتے رہ گئی

سعادت حسن منٹو نہ تو آئین نو سے ڈرنے والوں میں تھا نہ ہی طرز کهن پر اَڑنے والوں میں۔ اس کا موقف بالکل واضح نظر آتا ہے۔ وہ ایسی شاعری کو لایعنی قرار نہیں دیتا (کیونکہ اس کے نزدیک اس نظم پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے اور ہر لفظ کے کئی کئی معنی نکالے جاسکتے ہیں) بلکہ فیشن زدہ اور تقلیدی کہہ کر اسے دماغی عیاشی قرار دیتا ہے۔

اس نظم کے بارے میں خود منٹو لکھتا ہے:

''یہ نثر کی شاعری کا ایک نہایت ہی لطیف نمونہ ہے۔ چند سطروں میں زندگی کا تمام رس نچوڑ کر بھر دیا گیا ہے۔ پہلی سطور میں تصوف کا رنگ ہے۔ بلوری چوڑیوں کا اپنی کھنکناہٹ سے پوچھنا ''میں خوبصورت ہوں کہ تو؟'' کتنا اچھوتا خیال ہے اور تصوف کے چہرے پر سے یہ نقاب کو کس دل کش انداز سے اٹھاتا ہے۔ شاعر کا سینہ قدرت کی رنگینیوں سے معمور ہے۔ وہ فرشتوں تک پہنچتا ہے مگر فوراً ہی زمین پر ابرِ بہار اور بلند درختوں کی سرگوشیاں سننے کے لیے دوڑ آتا ہے۔

نیچریت کا ایسا اچھا نمونہ ہندوستانی شاعری میں ملنا محال ہے اور ان کی قید سے آزاد یہ منثور نظم دیہاتوں میں چلنے والی ہوا کے مانند ہلکی پھلکی اور معطر ہے۔ اس میں زندگی ہے اور اس زندگی کے اندر حرکت ہے۔ ایک لطیف حرکت، ایک پیارا ارتعاش ہے۔ ایسا ارتعاش جو کنواری لڑکیوں کے جسم پر طاری ہوا کرتا ہے۔

الفاظ کی نشست و برخاست بہت اچھی ہے۔ موزونیت بھی نہایت عمدہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نظم منثور کے مصنف نے دلہن کی ساڑی میں تارے بڑے احتیاط سے ٹانکے ہیں ہر ایک لفظ چمکتا ہے لیکن یہ چمک خیرہ کن نہیں، آنکھوں کو کھلتی نہیں بہت پیاری معلوم ہوتی ہے۔''

منقولہ تینوں پیراگراف میں سعادت حسن منٹو نے اپنی نظم کی تعریف میں جو باتیں بیان کی ہیں وہ یہ ہیں:

1. یہ نثر کی شاعری کا ایک نہایت ہی لطیف نمونہ ہے۔
2. چند سطروں میں زندگی کا رس نچوڑ کر بھر دیا گیا ہے۔
3. ابتدائی سطروں میں تصوف کا رنگ ہے۔
4. اس میں اچھوتا خیال ہے۔
5. نظم نگار کا سینہ قدرت کی رنگینیوں سے معمور ہے۔
6. نیچریت کا ایسا اچھا نمونہ ہندوستانی شاعری میں ملنا محال ہے۔
7. اس میں زندگی ہے اور اس زندگی کے اندر حرکت ہے۔
8. الفاظ کی نشست و برخاست بہت اچھی ہے۔
9. موزونیت بھی نہایت عمدہ ہے۔

اتنی خوبیوں کی حامل اس منثور نظم کے بارے میں منٹو کی لکھی ہوئی چند باتوں کو دہرانے کے بعد اب اسی مضمون کے دو اگلے پیراگراف قارئین کی نذر ہیں۔ ملاحظہ ہوں:

''اس نظم پر اسی طرح اور بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے۔ ہر ایک لفظ کے کئی کئی معنی نکالے جاسکتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ نظم منثور محض دماغی عیاشی ہے۔ لکھتے وقت اس کے مصنف کے پیشِ نظر صرف یہ بات تھی کہ لفظ خوبصورت ہوں اور ان کی ترتیب بھی سندر ہو، مگر مطلب کچھ نہ

ہو چنانچہ یہ نظم پڑھنے کے بعد مزہ تو آجائے گا مگر مطلب ہرگز ہرگز سمجھ میں نہیں آئے گا کیونکہ یہ اس غرض سے لکھی ہی نہیں گئی۔

یہ نظم میں نے لکھی ہے اور اس پر میں نے صرف دو منٹ صرف کیے ہیں۔ ہندوستانی ادب میں اب ایسی نظموں کا فیشن عام ہوگیا ہے۔ یورپ کا لٹریچر چونکہ بہت وزنی ہو چکا تھا اس لیے لوگوں نے اس قسم کی ہلکی پھلکی منثور شاعری کی طرف توجہ دی اور یورپ کا قاری جو کہ بوجھل افکار سے تنگ آچکا تھا ایسی نظموں کا دلدادہ ہوگیا۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ یوروپی لٹریچر میں یہ 'ادب لطیف' داخل ہوگیا۔ ہندوستان چونکہ تقلید کا شروع سے عادی ہے اس لیے اس کے ادب نے اس نئی قسم کی شاعری کو قبول کرلیا۔''

منٹو اپنی اهلیه صفیه اور سالی نکیه کے ساتھ

بہہ گئی
جیسے اک جھونکا ہوا کا
پاس سے ہوکر نکل جائے کہیں....
چندروزہ آرزوؤں کا چراغ
جھلملا کر بجھ گیا۔

احمد ندیم قاسمی کے نام ستمبر 1940 میں لکھے گئے منٹو کے ایک خط میں بھی ایک خام نثری نظم ملتی ہے۔ منٹو نے یہ نظم (اگر اسے نظم کہا جائے) احمد ندیم قاسمی کو اپنا مافی الذہن سمجھانے کے لیے لکھی تھی تاکہ قاسمی اسے پیش نظر رکھ کر ایک خاص فلمی سچویشن کے مطابق اچھا سا گیت لکھ سکے— واضح رہے کہ منٹو نے اپنی اس تحریر کو نظم کہنے سے عمداً گریز کیا ہے جب کہ 'نیلی رگیں' اور 'زندگی' میں پیش کیے گئے فن پاروں کو بجا طور پر نظم کہا ہے۔ منٹو نے قاسمی کو لکھا تھا کہ میں شاعر نہیں۔ اسی لیے میں آپ کو ٹھیک طور پر سمجھا نہیں سکتا۔ میں نثر میں کچھ اس طرح کہتا:

نیند کی ایک پری اپنے ہلکے پھلکے پروں پر اُڑتی آئے
اور تیری آنکھوں کے پیمانوں میں نیند کی شراب انڈیل دے
حسن جب سو جائے تو زیادہ حسین ہو جاتا ہے
تارے کرنوں کے سہارے چھم چھم کرتے نیچے اتر آئیں
چاند ڈھولک بجائے اور تو سو جائے
آنکھیں مُند جائیں تو دل سیر کے لیے نکلتا ہے
تیری پلکوں پر شاعر کے سپنے سوئیں
مصور کی تمنائیں انگڑائیاں لیں

منقولہ نظم کے بارے میں منٹو نے جملہ پانچ پیراگراف لکھے ہیں جن میں سے پہلے تین میں اس نظم کے فنی اور فکری محاسن بیان کیے ہیں اور بقیہ دو اس کی تنقید وتنقیص پر مشتمل ہیں۔ اگر ہم اس دور کے ادبی رسائل کا مطالعہ کریں تو پائیں گے کہ اس دور کے ناقدین ومبصرین جدید نظموں کی موافقت ومخالفت میں عموماً اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا کرتے تھے۔ اس دور کی شعری تنقید میں یہی دو رویے کارفرما نظر آتے ہیں۔

سعادت حسن منٹو نہ تو آئین نو سے ڈرنے والوں میں تھا نہ ہی طرز کہن پر اڑنے والوں میں۔ اس کا موقف بالکل واضح نظر آتا ہے۔ وہ ایسی شاعری کو لایعنی قرار نہیں دیتا (کیونکہ اس کے نزدیک اس نظم پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے اور ہر لفظ کے کئی کئی معنی نکالے جاسکتے ہیں) بلکہ فیشن زدہ اور تقلیدی کہہ کر اسے دماغی عیاشی قرار دیتا ہے۔

اس نثری نظم کی تنقید وتنقیص کو ن م راشد اور منٹو کے درمیان جاری سرد جنگ سے جوڑ کر بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ مگر مجھے تو قرین اصلیت یہی معلوم ہوتا ہے کہ منٹو ایک حقیقت پسند فنکار تھا۔ کسی بات کو سات پردوں میں چھپانا اس کی سرشت کے خلاف تھا۔ وہ تو ہر جگہ کھل کر کھیلنے کا قائل تھا۔ اس کے برعکس نظم جدید کا ابہام وعلائم سے خونی رشتہ تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی نظموں سے منٹو ایسے حقیقت نگار فنکار کو خوشی نہیں آسکتی تھیں۔

اس نثری نظم سے پہلے بھی منٹو دو مختصر نظمیں لکھ چکا تھا جو کہ اس عہد کی عام روش کے مطابق صوتی آہنگ کو ملحوظ رکھ کر نظم آزاد کی ہیئت میں لکھی گئی تھیں۔ منٹو کے ایک ریڈیو ڈرامے 'نیلی رگیں' کا آغاز اور 'اختتام' ان ہی نظموں سے کیا گیا ہے۔ پہلی نظم یہ ہے:

مرمریں پیکر پہ نیلم کے خطوط
سرد ہے دنیائے خواب
میرے برفانی تصور میں مگر
بہہ رہا ہے نیلگوں سیلاب سا

اس نثری نظم کی تنقیدوتنقیص کو ن م راشد اور منٹو کے درمیان جاری سرد جنگ سے جوڑ کر بھی دیکھاجاسکتا ہے۔ مگر مجھے تو قرین اصلیت یہی معلوم ہوتا ہے کہ منٹو ایک حقیقت پسند فنکار تھا۔ کسی بات کو سات پردوں میں چھپانا اس کی سرشت کے خلاف تھا۔ وہ تو ہر جگہ کھل کر کھیلنے کا قائل تھا۔ اس کے برعکس نظم جدید کا ابہام وعلائم سے خونی رشتہ تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی نظموں سے منٹو ایسے حقیقت نگار فنکار کو خوشی نہیں آسکتی تھیں۔

جس طرح جاری ہو قلب وروح میں
اک حسیں افعی کا زہر
چاندنی میں جس طرح نیلی شعاعوں کی جھلک
مرمریں پیکر پہ نیلم کے خطوط...

ڈرامہ 'نیلی رگیں' کا اختتام جس آزاد نظم پر کیا گیا ہے وہ منٹو کی ہدایت کے مطابق دھیمے سروں میں بجتے ہوئے ساز کی لَے پر دردبھری آواز میں پیش کی گئی تھی۔ نظم یہ ہے:

موج سی پانی میں اک پیدا ہوئی

بلاشبہ منٹو شاعر نہیں۔ شاعر ہونے کا مدعی بھی نہیں۔ اسے شاعری کے وزن وبحور کا علم نہیں تھا۔ علم عروض سے بھی واقفیت نہیں تھی، لیکن جب اس نے پہلی مرتبہ پیرایۂ نظم میں کچھ لکھنے کی سعی کی تو صوتی آہنگ کو ملحوظ رکھ کر دو آزاد[11] میں موزوں کردیں اور دوسری بار ایک نثری نظم۔ یہ نظم اس نے سنجیدگی کے ساتھ لکھی ہو یا غیر سنجیدگی سے، وہ جدید شاعری یا نظم آزاد کا حمایتی تھا یا مخالف، اس سے ہمیں کوئی غرض نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے ایک نثری نظم تخلیق کی تھی جو اب تک کی حاصل شدہ معلومات کے مطابق اردو زبان میں لکھی جانے والی اولین نثری نظم قرار دی جاسکتی ہے اور منٹو ہمارا پہلا نثری نظم نگار۔

□

Prof. Sadique, A.G.I/47C. Vikas Puri, New Delhi-110018

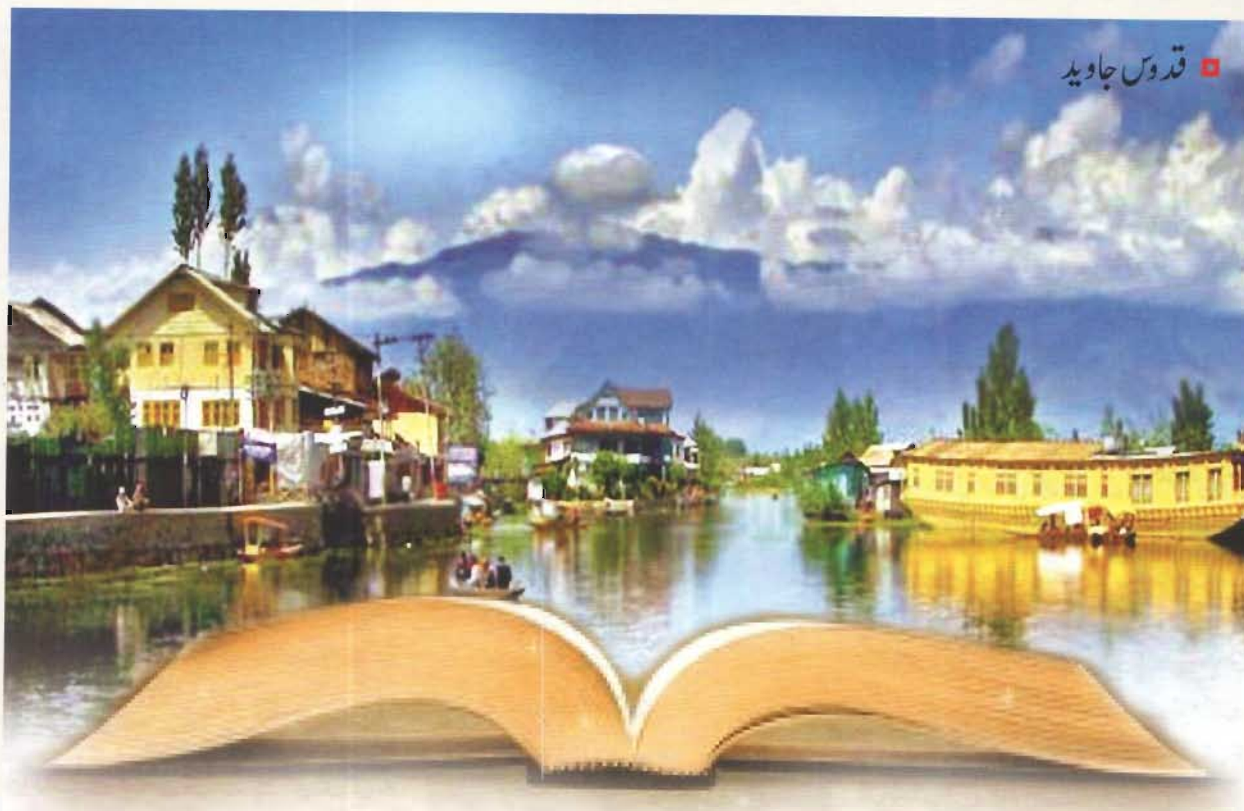

قدوس جاوید

کشمیر کی پہلی اردو نثری تصنیف: گلدستہ کشمیر

کسی بھی زبان اور علاقے میں نثر نگاری عام طور پر شاعری کے بعد ہی اپنے بال و پر نکالتی ہے۔ چنانچہ ریاست جموں و کشمیر میں بھی اردو شاعری کے نمونے یوں تو سترہویں صدی عیسوی میں ہی ملا محسن فانی، میر کمال الدین حسینی رسوا اور مرزا عبدالغنی قبول وغیرہ کے یہاں مل جاتے ہیں لیکن اردو نثر کے آغاز و ارتقا کے شواہد انیسویں صدی کے آس پاس سے ہی نظر آتے ہیں اور ان نثری نمونوں میں سب سے اہم، پنڈت ہرگوپال خستہ کی تصنیف 'گلدستہ کشمیر' ہے۔ جو صحیح معنوں میں ریاست جموں و کشمیر کا تاریخی و جرافیائی جائزہ ہے لیکن اس تصنیف میں ادبی چاشنی کی بھی کوئی کمی نہیں۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ 1857 تک اردو زبان وادب کا دبدبہ دکن اور دلی، لاہور اور لکھنؤ کے علاوہ برصغیر کے دور دراز علاقوں تک قائم ہو چکا تھا جن میں ریاست جموں و کشمیر بھی شامل ہے۔ کشمیر کے علما وفضلا، ادیب اور دانشور دلی، لاہور لکھنؤ اور پٹیالہ کے درباروں اور سرکاری دفتروں سے بھی وابستہ رہے ہیں۔ دلی اور پنجاب کے ساتھ جموں و کشمیر کے عوام کا تجارتی، تعلیمی اور ثقافتی لین دین کا رشتہ پرانا رہا ہے۔ دہلی اور لاہور کے اخبارات رسائل و جرائد کی بھی جموں و کشمیر کے عوام تک رسائی تھی۔ لہٰذا انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے اوائل تک ایک طرف جہاں جموں و کشمیر کی اردو شاعری پر میر و غالب، اقبال، پنڈت دتاتریہ کیفی اور سیماب اکبرآبادی سے لے کر جوش اور جگر مرادآبادی تک کے رنگ و آہنگ کی پرچھائیاں رقصاں نظر آتی ہیں وہیں کشمیر کی اردو نثر پر میر امن، حیدر بخش حیدر، اور رجب علی بیگ سرور سے لے کر سرسید احمد خاں، حالی، محمد حسین آزاد اور شبلی سے لے کر ابوالکلام آزاد تک کے اسالیب کے اثرات نظر آتے ہیں۔

کشمیر میں اردو نثر کے اکا دکا نمونے اٹھارہویں صدی میں ضرور ملتے ہیں۔ گرچہ اٹھارہویں صدی بلکہ انیسویں صدی کے وسط تک ریاست کی سرکاری اور علمی زبان فارسی تھی۔ لیکن چونکہ جموں و کشمیر میں کشمیری کے علاوہ ڈوگری، گوجری، اور پہاڑی بولیاں بھی بولی جاتی تھیں جو ساخت کے اعتبار سے پنجابی اور اردو کے قریب تھیں۔ اس کے علاوہ امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ کی کشمیر آمد، دین اسلام کی ترویج اور فارسی اور عربی کی مذہبی، علمی اور ادبی تصانیف کے زیر اثر اہل کشمیر اردو زبان کے اس 'سرمایہ الفاظ' سے مانوس تھے جن کا تعلق فارسی، عربی، پنجابی اور ہندی جیسی زبانوں سے تھا۔ اسی طرح انیسویں صدی کے وسط تک آکر خاص طور پر مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد حکومت (1857-1885) میں کشمیر میں چونکہ امن و امان کا ماحول تھا اور سرکاری سطح پر علوم وفنون کی ترویج و اشاعت کے لیے بیرون

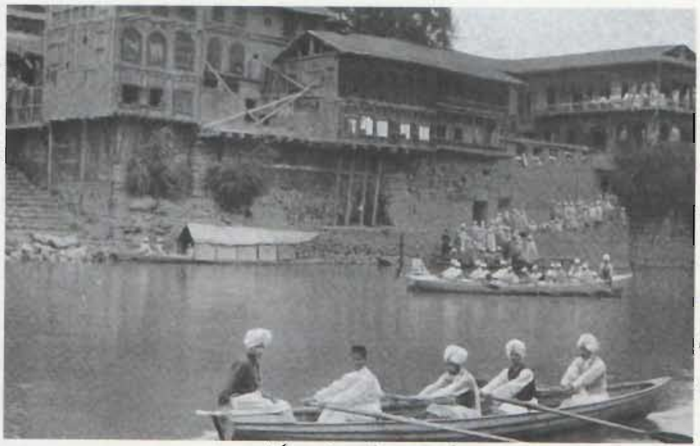

ریاست کے ایسے علما اور عہدہ داروں کو دربار اور سرکاری میں جگہ دی گئی جو اردو زبان میں بھی دسترس رکھتے تھے۔ ان غیر ریاستی عہدہ داروں کو دربار اور سرکار میں جگہ دی گئی جو اردو زبان میں بھی دسترس رکھتے تھے۔ ان غیر ریاستی عہد داروں میں سے ایک شخص بھاگ رائے نے سرکاری دستاویزات میں اردو کا استعمال شروع کیا اس کے علاوہ مہاراجہ کے وزیراعظم دیوان کرپارام نے ریاست کی انتظامی صورت حال پر اردو میں ہی رپورٹیں تیار کروائیں۔ ان اردو دستاویزوں اور رپورٹوں کو عوامی سطح پر کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ حکومت کو بھی ان کے ذریعے عوام سے رابطہ قائم کرنے میں آسانیاں پیدا ہوئیں اس لیے اردو کی عوامی مقبولیت اور دفتری امور میں پیدا ہونے والی آسانیوں کے پیش نظر مہاراجہ رنبیر سنگھ نے جموں میں ایک دارالترجمہ قائم کیا جہاں انگریزی سنسکرت اور عربی فارسی کی متعدد کتابوں اور قلمی نسخوں کا ڈوگری اور ہندی کے ساتھ ساتھ اردو میں ترجمہ کروایا گیا۔ یہ ترجمے جن لوگوں نے کیے ان میں غلام غوث خاں، پنڈت بخشی رام، مولوی فضل الدین، لالہ بسنت رائے وغیرہ کے نام اہم ہیں ایک دستیاب سرکاری رپورٹ کے مطابق اردو میں ترجمے کا یہ سارا کام 83-1882 میں مکمل ہوا۔ 1 اس پر 4502 روپے اجرت کے طور پر ادا کیے گئے۔ اس عرصے میں سرکاری دارالترجمہ سے باہر بھی کئی نثری کارنامے وجود میں آئے۔ ان میں چودھری شیر سنگھ مہتہ کا 'سفرنامہ بخارا' بے حد اہم ہے۔ یہ سفرنامہ 65-1864 میں لکھا گیا۔ اس سفرنامے کو ریاست جموں وکشمیر کی پہلی باضابطہ ادبی نثری تصنیف قرار دیا جاسکتا ہے۔ گرچہ اردو نثر میں ادبی اور صحافتی نگارشات کی اشاعت کا باقاعدہ سلسلہ 1882 میں 'بدیابلاس' نامی اخبار کے اجرا کے بعد شروع ہو چکا تھا۔ یہ اخبار ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں شائع ہوتا تھا۔ ویسے اگر دیکھا جائے تو کشمیر میں اردو نثر کا پہلا مربوط اور معتبر کارنامہ پنڈت ہرگوپال کول خستہ کی تصنیف تواریخ کشمیر (گلدستہ کشمیر) ہے۔ ہرگوپال خستہ نے یہ کتاب 1877 میں مکمل کی تھی لیکن اس کی اشاعت لاہور میں 1883 میں عمل میں آئی۔ ہرگوپال کشمیر الاصل تھے۔ ملازمت کے حوالے سے خود خستہ کو لاہور پٹیالہ اور شملہ میں رہنے کا موقع ملا۔ پنڈت ہرگوپال نے اپنا تخلص 'خستہ' غالب کے شاگرد — مرزا تفتہ کے اتباع میں اختیار کیا تھا۔ ان کے پردادا پنڈت گواشہ کول سکھ دور میں پنجاب چلے گئے تھے خستہ کے دادا پنڈت مہادیو کا شمار بھی شرفا میں ہوتا تھا۔ والد پنڈت رام چندر کول شیوفلسفہ کے جانے مانے عالم تھے۔ جن دنوں خستہ لاہور میں تھے ان کا رابطہ پنجاب کے ڈائریکٹر تعلیمات کرنل ہالرائڈ سے ہوا۔ گلدستہ کشمیر کی اشاعت میں

کشمیر میں اردو نثر کے اکا دکا نمونے اٹھارھویں صدی میں ضرور ملتے ھیں۔ گرچه اٹھارھویں صدی بلکه انیسویں صدی کے وسط تک ریاست کی سرکاری اور علمی زبان فارسی تھی۔ لیکن چونکه جموں و کشمیر میں کشمیری کے علاوہ ڈوگری، گوجری، اور پهاڑی بولیاں بھی بولی جاتی تھیں جو ساخت کے اعتبار سے پنجابی اور اردو کے قریب تھیں۔

کرنل ہالرائڈ کے تعاون کا اعتراف خستہ نے مذکورہ تصنیف کے اخیر میں 'خاتمۃ الکتاب' کے عنوان سے مختلف افراد کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان الفاظ میں کیا ہے:

''گلدستہ کشمیر، بہ نظر فیض اثر، قدردان اہل علم و ہنر، فیض رساں.. سخن پرور، فاضل اجل عالم اکمل، امیر دریار دِل جناب فضیلت مآب، لفٹنٹ کرنل ڈبلیو ایم ہالرائڈ صاحب، ڈائریکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب ... زیور طبع سے آراستہ وپیراستہ ہوئی۔''

کرنل ہالرائڈ اردو دوست انگریز افسر تھے انھیں کی ایما پر محمد حسین آزاد نے 15 اگست 1867 میں لاہور میں 'انجمن پنجاب' قائم کی تھی۔ پروفیسر عبدالقادر سروری اور پروفیسر حامدی کاشمیری نے انجمن پنجاب کے قیام کا سال 1867 ہی بتایا ہے لیکن بعض لوگوں نے 8 مئی 1874 کو ہونے والے انجمن کے پہلے اجلاس کو ہی اس کی تاریخ تاسیس قرار دیا ہے۔ 8 مئی 1874 کو انجمن کا جو (پہلا بڑا) اجلاس ہوا اس میں کرنل ہالرائڈ، مسٹر تھارنٹن سکریٹری پنجاب گورنمنٹ، کرنل میکلاگن اور مسٹر بینگ وغیرہ انگریز افسران کے علاوہ اردو کے قلم کاروں میں صرف مولوی سید احمد (مصنف فرہنگ آصفیہ) مولوی کریم الدین (مصنف خط تقدیر) رائے بہادر پیارے لال آشوب، منشی درگا پرشاد نادر، پنڈت من پھول، نواب عبدالمجید خاں اور فقیر سید قمرالدین کے نام دیے گئے ہیں۔ پنڈت ہرگوپال خستہ اُن دنوں لاہور میں ہی تھے لیکن انجمن کے مذکورہ اجلاس میں شرکت کی تھی یا نہیں۔ اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ البتہ ڈاکٹر برج پریمی نے لکھا ہے کہ ''قیام لاہور کے دوران وہ (خستہ) راوی ریفارمر، خیرخواہ کشمیر' اور 'دلیش کی پکار' جیسے اخبارات ورسائل سے وابستہ رہ چکے تھے ... وہ انجمن کی کارکردگیوں اور اس عہد کے نئے خیالات وتصورات سے واقف تھے۔ اس زمانے میں سرسید تحریک کے زیر اثر اردو میں تعمیری شاعری کے ساتھ ساتھ نثر میں، تاریخ، جغرافیہ، سوانح عمری، تنقید وتحقیق، سائنس، زراعت اور فلسفہ جیسے موضوعات کو ترجیح دینے کا رجحان عام ہو چکا تھا۔ مقصد عوام میں روشن خیالی پیدا کرنا تھا۔ اس مقصد کے تحت سوامی دیانند سرسوتی نے بھی 1975 میں 'آریہ سماج تحریک' شروع کی تھی۔ چنانچہ ان دونوں تحریکات نے ہندستانی معاشرت ثقافت اور شعر وادب میں جو جدید رجحانات پیدا کیے اس کا اندازہ اس زمانے کے اردو ہندی اور بنگلہ شعر وادب سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اسی جدید ادبی وثقافتی صورت حال میں ہرگوپال خستہ نے بھی جغرافیہ، تاریخ سوانح عمری اور اصلاحی قصہ نویسی کی جانب توجہ دی حالانکہ بقول مرتب 'بہار گلشن کشمیر' خستہ بنیادی طور پر شاعر تھے۔ ان کی شاعری کا ذکر پروفیسر عبدالقادر سروری نے اپنے ایک مضمون مطبوعہ 'نیا دور' لکھنؤ 1965 میں کیا ہے۔ لیکن خستہ نے

(1) جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشو ونما: ڈاکٹر برج پریمی، ص25

تقاضائے وقت کے مطابق نثرنگاری کو اپنا شعار بنایا۔ اپنی نثری تصنیفات کے بارے میں پنڈت ہرگوپال ختہ نے 'گلدستہ کشمیر' کے دیباچے میں خود لکھا ہے:

1931 بکرمی (مطابق 1874) میں اس ناچیز نے ایک مختصر جغرافیہ کشمیر کا لکھا تھا جو کہ مطبع بہار کشمیر لکھنؤ میں چھپا تھا اس کے نا مکتفی ہونے کے باعث دل کو یہ شوق پیدا ہوا کہ 'تواریخ کشمیر' زبان اردو میں جو کہ فی زمانہ مروج اور زودفہم ہے۔ بشمول جغرافیہ کشمیر جو اب تک ہندستانی زبانوں یا فارسی میں کسی نے نہیں لکھا، ایسا تیار کروں جس کے پڑھنے سے ناظرین کو سطح کشمیر کا حال اس طرح پر معلوم ہو سکے گویا وہ کشمیر میں پھر کر سیر کر رہے ہیں۔ اسی غرض سے بامداد پنڈت دامودر صاحب (جو اس وقت فضیلت و لیاقت کے باعث سپہر علم سنسکرت کے آفتاب ہیں) کتابِ لاجواب راج ترنگنی مصنفہ کلہن پنڈت، کو جو کہ معتبر اور پرانی تواریخ کشمیر ہے ترجمہ کیا اور تواریخ کشمیر نارائن کول اور بیربل کاچرو و مرزا حیدرو گلزار کشمیر و سفرنامہ داین صاحب و مور کرافٹ صاحب وانسز گائڈ جموں و کشمیر مصنفہ ڈریو صاحب و ناردرن باریر و تاریخ فرشتہ، وغیرہ کتب از سرتا پا دیکھا اور بعض ضروری مقامات نیل مت پران وشار کا مہاتم، وتستا مہاتم وسوئم مہاتم کو پنڈت صاحب موصوف کی زبانی بخوبی سنا۔ بہت سے اطراف واکناف کو بچشم خود دیکھا اور محسن آدمیوں سے بہت سی باتیں تحقیق کیں اور 1934 بکرمی (1877) میں بڑی احتیاط کے ساتھ بلا مبالغہ بہ ترک فضول نسخہ، ہذا لکھ کر تین حصوں میں تقسیم کیا اور نام 'گلدستہ کشمیر' رکھا۔ باقی احوال مفصل اس عبودیت افعال کا کتب مولفہ بندہ گوپال نامہ' چہار گلزار'، 'شگفتہ بہار'، 'مخزن ختہ' معروف بہ 'گل بہار' وسوانح عمری ختہ وغیرہ میں درج ہیں۔ (دیباچہ گلدستہ کشمیر از ہرگوپال ختہ ص11)

'گلدستہ کشمیر' کے دیباچے سے ماخوذ اس اقتباس سے کئی اہم باتیں سامنے آتی ہیں:

(1) اس زمانے (1873) کے آس پاس اردو دوسری زبانوں کے مقابلے میں زیادہ 'مروج' اور زودفہم زبان تھی۔

(2) 'گلدستہ کشمیر' محض تاریخ نہیں بلکہ کشمیر کی جغرافیائی تاریخ ہے۔ اس اعتبار سے یہ ایک منفرد تصنیف ہے۔ Geography of Jammu and Kashmir کے نام سے پروفیسر ماجد حسین[1] نے 1985 میں جو کتاب ترتیب دی ہے اس کے اکثر مضامین سے گلدستہ کشمیر میں فراہم کردہ معلومات کی تصدیق ہوتی ہے۔

(3) ختہ نے گلدستہ کشمیر لکھتے ہوئے اس وقت تک دستیاب کشمیر کی تمام اہم تاریخی کتابوں سفرناموں اور رپورٹوں سے استفادہ کیا ہے۔ گرچہ ختہ نے اپنے دیباچے میں اس کا اعتراف نہیں کیا۔ لیکن گلدستہ کشمیر میں فریڈرک ڈریو (Fredric Dreu) کی کتاب The Jammu and Kashmir Terretoria (مطبوعہ 1857) میں جموں وکشمیر کے جغرافیہ، آب وہوا، موسم، کوہ و بیاباں، جھیلوں اور چشموں سے لے کر ریاست کی مختلف قوموں اوران کے رسوم و رواج، تہوار اور اہل کشمیر کے مزاج، فطرت اور خط وخال وغیرہ کے بارے میں جو تفصیلات بیان کی ہیں کہا جاسکتا ہے کہ ختہ نے ان سے خوب خوب استفادہ کیا ہے۔ لیکن چونکہ یہ تفصیلات عمومی ہیں اور اکثر و بیشتر مورخین نے ان کا ذکر کیا ہے اس لیے اسے سرقہ تو نہیں کہا جاسکتا البتہ اظہار و بیان میں مبالغہ اور تعصب کے عناصر کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔

کرنل ہالرائڈ اردو دوست انگریز افسر تھے انہیں کی ایما پر محمد حسین آزاد نے 15 اگست 1867 میں لاہور میں 'انجمن پنجاب' قائم کی تھی۔ پروفیسر عبدالقادر سروری اور پروفیسر حامدی کاشمیری نے انجمن پنجاب کے قیام کا سال 1867 ہی بتایا ہے لیکن بعض لوگوں نے 8مئی 1874 کو ہونے والے انجمن کے پہلے اجلاس کو ہی اس کی تاریخ تاسیس قرار دیا ہے۔

(4) ختہ نے راج ترنگنی کو معتبر تواریخ کشمیر قرار دیا ہے جب کہ کئی دانشوروں نے راج ترنگنی کو تصورات اور مفروضات پر مبنی تاریخ بھی قرار دیا ہے۔

(5) عام طور پر گوپال ختہ کی اردو تصنیف کے طور پر صرف گلدستہ کشمیر کا نام لیا جاتا ہے۔ لیکن ختہ کے مذکورہ بالا اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تصنیفات کئی ہیں مثلاً (1) مختصر جغرافیہ کشمیر (2) گلدستہ کشمیر (3) گوپال نامہ (4) چہار گلزار (5) شگفتہ بہار (6) مخزن ختہ معروف بہ گل بہار اور (7) سوانح عمری ختہ۔ ڈاکٹر برج پریمی نے اپنی کتاب 'جموں وکشمیر کی نشوونما' میں ہرگوپال ختہ کی ایک اور تصنیف 'گلزار فوائد' کا ذکر یا ہے اور لکھا ہے کہ 'یہ دراصل ایک قصہ ہے جس میں ڈپٹی نذیر احمد کے 'مراۃ العروس' کا تتبع کیا گیا ہے۔ اسلوب سلیس اور واضح ہے کہیں کہیں مقفیٰ اور مسجع عبارت کا التزام کیا گیا ہے۔'

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ریاست جموں وکشمیر میں اب تک کی تحقیق کے مطابق، نثر نگاری کا باضابطہ اور باوقار آغاز ہرگوپال ختہ کی نثری تصنیفات سے ہوتا ہے لیکن ختہ سے قبل جموں وکشمیر میں اردو نثر کے اورکون کون سے اور کیسے نمونے ملتے ہیں اور یہ بھی کہ ختہ کے بعد سے آج تک ریاست میں اردو نثر کا ارتقا کن خطوط پر ہوا۔ یہ تحقیق کا ایک مستقل موضوع ہے لیکن اتنی بات تو کہی جاسکتی ہے کہ پنڈت ہرگوپال ختہ کی تصنیف ریاست جموں وکشمیر میں اردو نثر کے آغاز وارتقا کی ایک اہم کڑی ہے جسے کسی بھی طرح نظرانداز نہیں کیا جاسکتا

■

Prof. Quddus Javed, Baitul- Zehra, 27, Green Hills Colony, Near Govt. Sec. School, Bhatindai, Jammu- 1881152

(1) پروفیسر ماجد حسین ہندوستان کے معتبر جغرافیہ دانوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے کشمیر یونیورسٹی میں شعبۂ جغرافیہ کی بنیاد رکھی اور ایک عرصہ تک اس شعبہ میں درس وتدریس وتحقیق کے فرائض انجام دیتے رہے۔ مذکورہ کتاب ان کے کشمیر میں قیام کے دوران کی ہی تصنیف ہے۔

اختر آزاد

منظر کاظمی کے افسانے

اسلامی حقائق وواقعات کی روشنی میں

ترقی پسند تحریک کی نفی کرتے ہوئے جدیدیت ایک نئے تیور کے ساتھ ادب میں نمودار ہوئی اور بنے بنائے تمام اصول وضوابط کو توڑتے ہوئے زندگی کے نئے افہام وتفہیم میں جُٹ گئی۔ ابتدا میں جدیدیت کی مخالفت ہوئی کیوں کہ یہ انسان کے داخلی کرب کو جہاں اجاگر کرتی ہے وہیں خارجیت سے داخلیت، افراد سے فرد، شوروغل سے خاموشی اور بھیڑ سے تنہائی کی طرف کا ایک ایسا سفر تھا جو انسان کے اندرون میں جاکر ختم ہوتا تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ اندرون کا یہی سفر ذات سے شروع ہوکر کائنات میں تبدیل ہونے لگا۔ اس تبدیلی نے ادب میں ایسے دور کا آغاز کیا جس کی وجہ سے تمثیل، علامت، استعارہ اور تشبیہ نے زبان وبیان میں پہلے سے زیادہ شگفتگی پیدا کی، نئے مفاہیم عطا کیے۔

فکشن کی دوسری صنف کی طرح جدید اردو افسانے میں بھی حیرت انگیز تبدیلی ہوئی اور وہ افسانہ جو 'کفن' میں لپٹا ہوا تھا، جدیدیت کے کاندھے پر سوار ہوکر' دوسرے آدمی کے ڈرائنگ روم تک پہنچ گیا۔ منظر کاظمی جیسے افسانہ نگار ڈرائنگ روم میں بیٹھنے والے نہیں تھے۔ بھٹک بھٹک کر منزل تک پہنچنے میں انھیں مزہ آتا تھا۔ اس لیے وہ جدید افسانہ نگاروں کے ساتھ ساتھ چلتے تو رہے، لیکن وقت ملتے ہی دور نکل گئے۔ لکشمن ریکھا کی تلاش میں... اس سلسلے میں جوگیندر پال لکھتے ہیں

''خوشی کا مقام یہ ہے کہ منظر کاظمی اگر اظہار کے روایتی اسالیب سے مطمئن نہیں تو یہ بھی ہے کہ وہ اظہار کے نئے امکانات کو بے جواز قبول کرنے کے حق میں نہیں ....بعض یار لوگ شکایت کرتے ہیں کہ کہانی اپنے راستے سے بھٹک گئی تھی۔ میں اس بیان کو شکایت کنندگان کی سادہ لوحی پر محمول کرتا ہوں۔ بھٹکنے کی جرأت کے بغیر 'نئی دنیا' کی دریافت کیوں کر ممکن ہے۔ سیدھے سیدھے چل کر تو آپ وہیں پہنچیں گے جہاں سبھی ٹکٹ کٹا کر بآسانی جا پہنچتے ہیں۔ مگر منزلیں انجانی ہوں تو مسافر کو خود آپ ہی اپنا راستہ کھوجنا پڑتا ہے۔ منظر کاظمی بڑی ثابت قدمی سے اپنی انجانی منزلوں کی ٹوہ میں ہے اور کٹی پھٹی راہیں ہموار کرنے میں برابر جٹا رہتا ہے۔ ایسے میں فن کار بھٹک بھٹک کر فن کو اچھوتے مقامات کو جالیتے ہیں اور جہاں جہاں وہ آج بھٹکے ہیں، وہیں کل نئی شاہراہوں کا اہتمام انجام پانے لگتا ہے۔''

'منظر نامہ' کے فلیپ سے مرتب: ڈاکٹر ہمایوں اشرف منظر کاظمی کا تعلق جدید افسانہ نگاروں کی اس نسل سے ہے جنھوں نے اردو میں جدید افسانے کی بنیاد رکھی۔ یہ وہ دور تھا جب ترقی پسند تحریک دم توڑ رہی تھی اور جدیدیت اپنے نئے امکانات کی تلاش میں سرگرداں تھی۔ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ جب کوئی تحریک سالہا سال چلتی ہے تو بہت سارے لوگ اس کے ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں لیکن ایک ہی سمت میں، ایک ہی رفتار کے ساتھ اور ایک ہی منزل کی تلاش میں چلتے چلتے کچھ لوگ اکتا بھی جاتے ہیں۔ کچھ تھک کر رک جاتے ہیں اور کچھ دوسری سمت سفر میں لگ جاتے ہیں۔ قدم قدم پر بکھرے نئے مناظر ان کی آنکھوں میں حیرت واستعجاب کا رنگ گھول کر متحیر کردیتے ہیں۔ نئی چیز کو دیکھنے اور پانے کی تمنا میں ان کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے۔ نئی چاہت میں وہ اپنا راستہ بدل دیتے ہیں۔ پہلی منزل کو چھوڑ کر دوسری منزل کی تلاش میں آگے بڑھ جاتے ہیں۔

وقت بدلتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ بہت ساری قدریں بدلتی ہیں اور یہی وہ قدریں ہیں جو آہستہ آہستہ ماحول کو سازگار بناتی رہتی ہیں۔ یہی ترقی پسند ادب کے ساتھ بھی ہوا۔ ترقی پسندوں نے ادب پر جو ترقی پسندی تھوپ رکھی تھی۔ اسے سامنے رکھ کر ہر کوئی ادب تخلیق نہیں کرسکتا تھا کیوں کہ سماجی، تہذیبی اور خارجی رشتوں میں شکست وریخت کا دور شروع ہوچکا تھا۔ ترقی پسند ادب کی حمایت کرنے والے بھی ایک راستے پر چلتے چلتے اوب چکے تھے۔ اس لیے متعین راہوں سے گزرتے ہوئے کترانے لگے۔ یہیں سے نئی نسل میں بے چینی اور اضطرابی کیفیت پیدا ہوئی اور 1955 سے 1960 تک آتے آتے ترقی پسند تحریک پژمردگی کا شکار ہونے لگی اور تب جدیدیت غاروں سے نکل کر اندھیرے میں شب خون مارنے لگی۔

منظر کاظمی نے بہت زیادہ نہیں لکھا۔ لیکن جو لکھا وہ بہت سوچ سمجھ کر لکھا۔ ان کے نزدیک زیادہ لکھنے سے بہتر کم اور اچھا لکھنا تھا۔ اپنے بیالیس سالہ ادبی سفر میں انھوں نے اتنا بھی نہیں لکھا جتنا ایک بسیار نویس دوچار سال میں لکھ ڈالتا ہے۔ ان کے اکلوتے افسانوی مجموعے 'لکشمن ریکھا (1991) میں کل سترہ افسانے ہیں۔ باقی رسالوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ ان کے یہاں دو طرح کے افسانے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ایک وہ جس میں ہمیں سیاسی، سماجی، اقتصادی، معاشرتی، جنسی اور کہیں کہیں سائنسی ترقی کی گونج سنائی دیتی ہے اور دوسرے طرز کے افسانے وہ ہیں جن میں قرآنی آیات اور اسلامی واقعات کے موتیوں کو نہایت ہی نفاست اور باریکی کے ساتھ افسانوی لڑیوں میں پرویا گیا ہے اور یہی وہ سب سے اہم حصہ ہے جو دوسروں کے یہاں مفقود ہے۔

60 سے 80 کے درمیان جدید افسانہ نگاروں نے علامتی اور تجریدی افسانے کے نام پر کچھ ایسے افسانے لکھے جہاں ترسیل کا مسئلہ سب سے اہم تھا۔ منظر کاظمی نے اپنے افسانوں میں علامت، تمثیل، استعارہ، تشبیہ اور تلمیح کا برمحل اور خوبصورت استعمال کرکے، سہل تجریدیت اور متحرک علامت نگاری کو اتنا عام فہم بنادیا کہ قاری تک اس کی رسائی ممکن ہوگئی۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر لطف الرحمٰن نے لکشمن ریکھا کے فلیپ پر اپنی رائے دیتے ہوئے لکھا ہے:

''منظر کاظمی نے تلمیحات و استعارات اور خوبصورت علامتوں کے ذریعے عہد حاضر کی ان حسّیات وکیفیات کو اپنے دلکش اور رگ وجاں کو چھو جانے والے اسلوب میں اس طرح پیش کیا ہے کہ قاری ان کے جمالیاتی تجربات و مشاہدات کا محض شاہد ہی نہیں رہ جاتا بلکہ خوفن کاری کی طرح ان دکھوں کا نوحہ گر بن جاتا ہے۔ ان کی سب سے بڑی انفرادیت یہ ہے کہ ان کی کہانیوں میں قصہ پن بدرجہ احسن موجود رہتا ہے۔ ان کی کہانیاں آج کے بیش تر افسانہ نگاروں کی تخلیقات کی طرح معمّہ نہیں رہ جاتیں۔ جہاں گوہرِ معنیٰ موجوں کے پسِ پردہ نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ بلکہ ان کی کہانیوں میں معنیٰ کی تہہ داری کے باوجود مختلف سطحوں پر ترسیل وابلاغ کی حسین موجیں ساحل بہ کنار نظر آتی ہیں۔ ہم عصر افسانہ نگاروں میں ان کی یہی انفرادیت ان کے سچّے مخلص اور ممتاز فنکار کا منصب عطا کرتی ہے۔''

منظر کاظمی کے چند نمونے دیکھئے:

''پیپل کی گھنی چھاؤں میں بیٹھے ہوئے لوگ اگر ہم سے پوچھیں گے کہ ہماری آنکھیں، جنھیں ہم نے ہر حال میں محفوظ رکھا تھا، کیا ہوئیں تو ہم کیا جواب دیں گے۔؟'' (لکشمن ریکھا)

''چاند کو چھونے کی تمنا میں آج کے انسان کا اسقاط ہو گیا ہے۔'' (کانٹوں کا تاج)

''کولہوں کی چرمراتی ہڈیاں اور مشرق ومغرب میں پھیلی ٹانگوں کا منظر اب کیمرے کی تقدیر ہے۔ اجتماعی آبروریزی کی فلم بندی ایک نیا تجربہ ہے اور یہ سارے قبولیت کے دروازے کھٹکھٹا رہا ہے۔'' (ٹاور آف بے بی لون)

ان کے اسلوب کے متعلق شفیع جاوید لکھتے ہیں:

''جس طرح ہر موسم کی ایک دعا ہوتی ہے۔ جس طرح ہر منظر کا ایک سلام ہوتا ہے، اسی طرح ہر لکھنے والے کا ایک اندازِ بیان ہوتا ہے جو اس کی شناخت ہوتی ہے۔ منظر کاظمی اس طور پر منفرد ہیں۔ ان کا ہر افسانہ۔ اس کا لہجہ، اس کا بیان، اس کی بُنت، اس کی تعمیر وتربیت، اس کا سلگتا ہوا فن اپنی انفردیت اس طرح رکھتا ہے کہ افسانہ نگار کا نام ہٹا بھی دیا جائے تو اسٹائل اور یہ سارے اجزا چیخ چیخ کر کہیں گے کہ ہم منظر کاظمی کے قلم سے لہو کی بوند کی مانند ٹپکے ہیں۔''

مضمون 'داغِ جگر کی نمود'، منظر نامہ، مرتب: ڈاکٹر ہمایوں اشرف کے چند اقتباس:

''جب نشیبی علاقوں میں پانی جوان ہوتا ہے تو اس کا

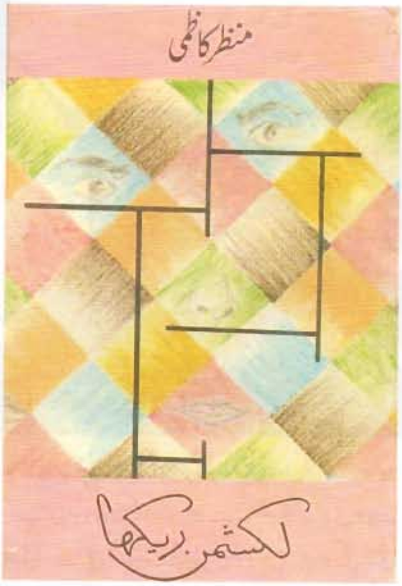

براہِ راست اثر ریڑھ کی ہڈی پر ہوتا ہے۔''

(ٹاور آف بے بی لون)

''مقابل میں کوئی بھی ہو پھر بھی فتح ان ہی کی ہوتی ہے اور یہ بات بھی دیکھی گئی ہے کہ تعداد کوئی جنس نہیں ہوتی اور مقصد سے بڑا کوئی جرنیل نہیں ہوتا۔''

(سیاہ غلاف اور کالے جرنیل)

منظر کاظمی نے بہت زیادہ نہیں لکھا۔ لیکن جو لکھا وہ بہت سوچ سمجھ کر لکھا۔ان کے نزدیك زیادہ لکھنے سے بہتر کم اور اچھا لکھنا تھا۔ اپنے بیالس سالہ ادبی سفر میں انھوں نے اتنا بھی نہیں لکھا جتنا ایك بسیار نویس دو چار سال میں لکھ ڈالتا ھے۔ان کے اکلوتے افسانوی مجموعے 'لکشمن ریکھا (1991) میں کل سترہ افسانے ھیں۔باقی رسالوں میں بکھرے پڑے ھیں۔ ان کے یھاں دو طرح کے افسانے دیکھنے کو ملتے ھیں۔ ایك وہ جس میں ھمیں سیاسی، سماجی، اقتصادی، معاشرتی، جنسی اور کھیں کھیں سائنسی ترقی کی گونج سنائی دیتی ھے اور دوسرے طرز کے افسانے وہ ھیں جن میں قرآنی آیات اور اسلامی واقعات کے موتیوں کو نھایت ھی نفاست اور باریکی کے ساتھ افسانوی لڑیوں میں پرویا گیا ھے اور یھی وہ سب سے اھم حصّہ ھے جو دوسروں کے یھاں مفقود ھے۔

''ایک واٹر ٹینک کی تیاری میں ہزاروں گاگریں ٹوٹتی ہیں اور اس ٹینک کو آگے بڑھنے کی علامت سمجھ کر لوگ خوش ہوتے ہیں۔'' (لکشمن ریکھا)

منظر کاظمی نے اپنے افسانوں میں جا بجا طنزیہ جملوں کا بھی استعمال کیا ہے۔ جو بلیڈ کی طرح بے آواز روح میں اتر جاتے ہیں اور آدمی اندر ہی اندر تلملا کر رہ جاتا ہے اور کسی جملے میں ایسی تیزابیت ہوتی ہے جو ریڑھ کی ہڈی کو پگھلا دیتی ہے۔ ایک پل میں تنا ہوا انسان جھک جاتا ہے۔ طنز کا ایسا وار طنز نگاروں کے یہاں تو ملتا ہے لیکن افسانوں میں یہ سب جس طرح سے منظر کے یہاں آیا ہے ان کے ہم عصروں کے یہاں دیکھنے کو کم ملتا ہے:

''کہیں ایسا تو نہیں کہ تعداد ان کے یہاں کوئی جنس بن گئی ہو.... یا زمین کی پستیوں میں آسمان بن کر رہنے کا فن لوگوں نے بھلا دیا ہے۔'' (سیاہ غلاف اور کالے جرنیل)

''نیند اگر تقسیم کرنے کی شے ہوتی تو دنیا میں سب سے قابلِ قدر انسانی کارنامہ اسی کو مانا جاتا۔ لیکن کارنامے تو وہ قرپائے جو نیندیں اُڑا لے گئے۔'' (میرے حصے کی نیند)

اسلوب کی طرح ان کے مکالمے بھی معنویت سے بھرپور ہوتے ہیں۔ ایک ایک جملے میں پوری کہانی چھپی ہوتی ہے۔ تہہ دار جملے کی ان کے یہاں کمی نہیں ہے۔ اور جملے بھی ایسے کہ پڑھنے والا سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ ایسے جملے وہ کیسے گڑھ لیتا ہے۔

منظر کاظمی کی نظر میں زندگی ایک فلسفہ ہے۔ وہ کہانی نہیں بھی لکھتے تو بھی ایک فلاسفر کی طرح اپنی باتوں کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے کوئی نہ کوئی راہ ضرور اختیار کرتے۔ بات سے بات پیدا کرنے میں انھیں بہت مزہ آتا تھا۔ وہ زندگی کو ایک الگ ڈھنگ سے دیکھنا چاہتے تھے۔ یہ دنیا کیا ہے؟ کیوں بنی ہے؟ ہم کون ہیں؟ اور ہمارا کیا کردار ہے؟ کیا صرف ہم اس لیے پیدا ہوئے ہیں کہ ہمیں مرنا ہے اس لیے ہمیں پیدا کیا گیا ہے۔؟ وہ اپنے افسانوں میں بھی فلسفیانہ گفتگو کرتے نظر آتے ہیں۔ جہاں جہاں انھوں نے فلسفیانہ گفتگو کی ہے، وہاں وہاں افسانے کا وہ حصہ اہم ہو گیا ہے جو افسانے کو نئی سمت عطا کرنے میں معاون ہوا ہے اور اس کے حسن کو دوبالا بھی کیا ہے:

''خوراک سے جاندار پیدا ہوتے ہیں۔
.... بارش سے خوراک پیدا ہوتی ہے۔
قربانی سے بارش ہوتی ہے۔
اور قربانی عمل سے ہوتی ہے۔''

(لکشمن ریکھا)

اسلامی موضوعات پر لکھے گئے افسانوں میں 'سیاہ غلاف اور کالے جرنیل'، 'ایک کجلائی ہوئی شام'، 'کانٹوں کا تاج'، 'آسمان سے گرتی ہوئی روٹیاں' قابلِ ذکر ہیں۔ ان افسانوں کا تانا بانا قرآنی آیات اور اسلامی واقعات کی روشنی میں علامتی، تمثیلی، استعاراتی اور تشبیہاتی رنگ برنگے دھاگوں سے بنا گیا ہے۔ جس سے معنویت کی ایک ایسی دنیا آباد ہوتی ہے کہ قاری ہر پل زندگی کے نئے مفاہیم سے لطف اندوز ہوتا ہے اور کہانی کے اندرون میں اتر کر ایک ایسا رشتہ استوار کرتا ہے کہ 'کہانی' اور 'کہانی کار' کے درمیان مثلث کا تیسرا زاویہ بنتا دکھائی دیتا ہے.... حقیقت کو افسانہ بنانا منظر کاظمی کو بخوبی آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی حقائق کو افسانے میں پوری طرح سے ڈھالنے کے باوجود انھوں نے خود کو کہیں expose نہیں کیا ہے۔ ورنہ اقبال کی طرح تبلیغیت کا الزام ان کی تحریر کے بھی سر جاتا۔

منظر کاظمی نے حیات مبارکہ کو موضوع بنا کر 'سیاہ غلاف اور کالے جرنیل' جیسے افسانے لکھے جو اردو ادب میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کی تحقیق کے مطابق حضرت محمدؐ کی سیرت پاک پر یہ اردو کا پہلا افسانہ ہے۔ پریم چند نے اس سے قبل اس موضوع کو بنیاد بنا کر 'نبی کی نیتی' افسانہ رقم کیا ہے۔ لیکن مکمل سیرت پاک منظر کاظمی کی تحریر میں اپنی پوری شگفتگی کے ساتھ نظر آتی ہے۔

آسمان سے گرتی روٹیاں سے اقتباس ملاحظہ ہو:

''یہ ہمیں معلوم ہے کہ پانی کے چوڑے سینے پر بہنے والا چوبی بکس بڑا قیمتی تھا کہ اس میں ایک ایسی زندگی بند تھی جو موت کے منہ سے بچ کے آئی تھی۔ لیکن اس کی پرورش موت کے ہاتھوں ہوئی تھی اور کچھ دنوں بعد اس زندگی نے موت کا خاتمہ کر دیا۔ اب یہ بات عام ہو چکی ہے کہ ہم میں سے بہت سارے لوگ اپنی موت کی پرورش خود اپنے ہاتھوں سے کیا کرتے ہیں اور سب کچھ لٹا دینے کے بعد اپنی نگاہیں آسمان کی طرف اُٹھا لیتے ہیں۔ اپنے چاروں طرف پھیلے اندھیروں کی انہیں کوئی خبر نہیں ہوتی۔ ان کا صرف ایک کام رہ گیا ہے کہ ان کی آنکھیں کھلے ہوئے آسمان کی وسعتوں میں روٹیاں تلاش کرتی ہیں اور ان کے پاؤں کے نیچے گیہوں کے پودے سوکھتے ہیں۔''

(آسمان سے گرتی ہوئی روٹیاں)

'کانٹوں کا تاج' سے اقتباس ملاحظہ ہو:

''یہی وہ تاریک کمرہ ہے جو یہ حوصلہ بخشتا ہے کہ

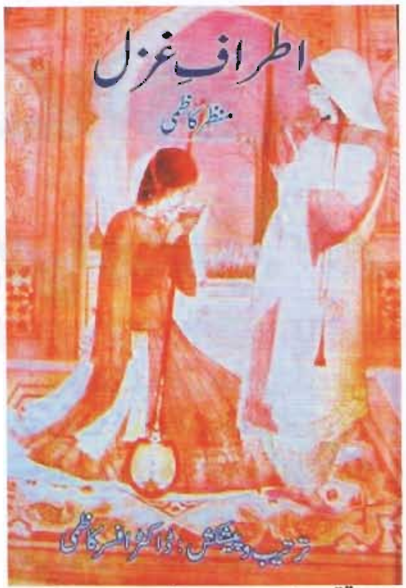

ہم اپنی قتل گاہ کی طرف بڑے فخر کے ساتھ سر اُٹھاتے ہوئے چلے جاتے ہیں اور اسی کمرے کی بصیرت کا کمال ہے کہ دہکتے ہوئے آتش کدے کے درمیان نمو پانے والے ہرے درخت سے گفتگو کرنے کی جرأت عطا کرتی ہے۔ جنگلی جانوروں سے ہم ڈرتے ہیں۔ لیکن صرف اس قدر کہ وہ پشت کی جانب سے نہ آئے۔ میرے ہاتھ کا قلم کیا تمھیں باتیں کرتا ہوا دکھائی نہیں دیتا..... ہمیں معلوم ہے کہ دریائے نیل کی موجوں پر ایک نیل کے کنارے حواؑ کی بیٹی دیوانہ وار بھاگتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ بند کمرے میں روشنی کا

منظر کاظمی نے حیات مبارکہ کو موضوع بنا کر 'سیاہ غلاف اور کالے جرنیل' جیسے افسانے لکھے جو اردو ادب میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کی تحقیق کے مطابق حضرت محمد کی سیرت پاک پر یہ اردو کا پہلا افسانہ ہے۔ پریم چند نے اس سے قبل اس موضوع کو بنیاد بنا کر 'نبی کی نیتی' افسانہ رقم کیا ہے۔ لیکن مکمل سیرت پاک منظر کاظمی کی تحریر میں اپنی پوری شگفتگی کے ساتھ نظر آتی ہے۔

ایک مینار ہے۔'' (کانٹوں کا تاج)

''وہ خیمہ سے سر بلند کیے سامنے کھلے میدان میں اپنی اولادوں کو نیزوں پر لٹکا ہوا دیکھتا ہے اور اطمینان اور سکون کے ساتھ اس کی نگاہیں کبھی اپنے پہلو سے بہنے والی ندی پر پڑتی ہیں، جو اس کی ماں کا حق تھا، اور کبھی دور آسمان کی وسعتوں میں کہ جس کے نیچے حد درجہ روشنی بخشنے والی ایک شئے سیاہ غلاف سے ڈھکی ہوئی ہے۔''

(ایک کجلائی ہوئی شام)

شاعر و ناقد سیّد احمد شمیم نے اسلامی تاریخ اور سیرت کے حوالے سے بات کرتے ہوئے منظر کاظمی کے متعلق اپنے مضمون 'ذکر اس پری وش کا' میں یہ لکھا ہے:

''منظر کاظمی نے اسلامی تاریخ و سیرت کی کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔ اور سورۃ البقر، یوسف، آلِ عمران، نسا، اعراف، بنی اسرائیل، کہف، طٰہٰ، قصص، مزمل، الم نشر اور سورۃ الفیل وغیرہ کی نورانی تجلیوں سے اپنے اسلوب کو چمکایا ہے۔'' (سیّد احمد شمیم)

منظر کاظمی اس قبیل کی افسانوں میں شروعات اور اختتام پر کافی محنت کرتے نظر آتے ہیں۔ بیچ سے ہی افسانے کو شروع کر دیتے ہیں۔ جیسے پہلے کچھ اور بھی ہو چکا ہو ... وہ اکثر 'تب یوں ہوا کہ'، 'اس سے پہلے یہ ہوا تھا کہ' اور 'دیکھا گیا کہ' جیسے فجائیہ فقروں سے اپنی بات کی ابتدا کرتے ہیں اور پڑھنے والا آگے کی بات جاننے کے لیے بے چین ہو جاتا ہے۔ ان کے افسانوں میں جو اسلامی موضوعات ہیں ان میں بھی کافی تنوع پایا جاتا ہے۔ لیکن 'آسمان سے گرتی ہوئی روٹیاں' اور 'کانٹوں کا تاج' میں موضوعات کی تکرار ملتی ہے۔ دونوں میں یوسف، عیسیٰ، موسیٰ اور فرعون کے قصے بیان ہوئے ہیں۔ لیکن یہ منظر کاظمی کا ہی وصف ہے کہ پڑھتے وقت دونوں افسانے ایک دوسرے کی ضد نظر آتے ہیں اور اگر یہ ضد کچھ لوگوں کو نظر نہ بھی آئے تو یہی یکسانیت ایک سیریز کے طور پر آگے بڑھتی ہے جو قاری کے لیے ایک خوشگوار اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔

اردو میں یوں تو کئی افسانہ نگاروں نے اسلامی حقائق وواقعات اور سیرت پاک جیسے موضوعات کو افسانے کے قالب میں فنی چابکدستی سے ڈھالا ہے، لیکن ایک ساتھ پانچ چھ افسانے ان کے عہد میں دوسروں کے یہاں دیکھنے کو کم ملتے ہیں۔ یہی وہ امتیاز ہے جو منظر کاظمی کو ان کے ہم عصروں میں ممتاز بناتا ہے۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ناقدین ادب کی نگاہ ابھی اس امتیازِ خاص پر نہیں گئی ہے۔

□

Dr. Akhtar Azad, House No 38, Road, No1, Azad Nagar, Jamshedpur - 832110 (Jharkhand)

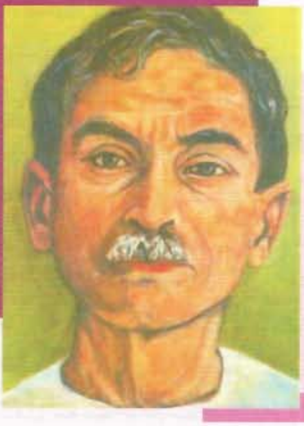

نفیس بانو

پریم چند کے افسانوں میں احتجاجی رویہ اور سماجی شعور

اردو میں افسانوی ادب رومان کے ریشمی آنچل کے زیرِ سایہ پروان چڑھ رہا تھا۔ رومانی رجحانات اور میلانات کے زیرِ اثر افسانوں کی بنیاد محض جذبہ اور تخیل، طرزِ اظہار اور حسنِ ادا پر تھی۔ پریم چند چاہتے تو وہ بھی اپنے گرد و پیش سے بے خبر اسی ریشمی آنچل کے سائے میں سکون سے بیٹھ رہتے۔ مگر وہ تو سنگین حقیقت کی تپتی چٹانوں پر اپنا اشہب قلم دوڑانے کے درپے ہو گئے۔ پریم چند کا کہنا تھا کہ:

''جس ادب سے ہمارا ذوق بیدار نہ ہو، روحانی اور ذہنی تسکین نہ ملے، ہم میں قوت اور حرکت نہ پیدا ہو، ہمارا جذبۂ حسن نہ جاگے، جو ہم میں سچا ارادہ اور مشکلات پر فتح پانے کے لیے سچا استقلال نہ پیدا کرے، وہ آج ہمارے لیے بیکار ہے۔'' (پریم چند: خطبۂ صدارت، ادب کی غرض و غایت)

اقبال نے ایک جگہ کہا تھا:

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ سمجھے وہ نظر کیا

پریم چند کے افسانے اس شعر کی تعبیر و تفسیر پیش کرتے ہیں۔ پریم چند حقیقت کو سمجھنے والی نظر رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے سماج کے درد و دکھ کو شدت سے محسوس کیا اور انھیں اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ تجربوں اور مشاہدوں سے اپنے افسانوں کے لیے مواد حاصل کیے۔ ہمارے معاشرے کے بے جان، لبِ گور اور کمزور افراد ان کے افسانوں کے جاندار اور مضبوط کردار بن کر ابھرے۔ سیاسی سوجھ بوجھ اور سماجی شعور کے تانے بانے سے انھوں نے اپنی کہانیوں کے پیراہن تیار کیے اور انھیں گاندھیائی فکر و فلسفے کے زیور پہنائے۔ ادب سے متعلق پریم چند نے کہا تھا:

''جب ادب پر دنیا کی بے ثباتی غالب ہو، اور ایک ایک لفظ یاس اور شکوۂ روزگار اور معاشقے میں ڈوبا ہوا ہو، تو سمجھ لیجیے کہ قوم جمود اور انحطاط کا شکار ہو چکی ہے اور اس میں سعی اور اجتہاد کی قوت باقی نہیں رہی...'' (پریم چند: خطبۂ صدارت، ادب کی غرض و غایت)

پریم چند نے احتجاجی اور انحرافی رویے اور پوری اجتہادی قوت کے ساتھ مملکتِ افسانہ کو تسخیر کیا ہے۔ ابتدا میں انھوں نے روایتی طرزِ اظہار ضرور اپنایا لیکن موضوع کے انتخاب میں ان کا سیاسی اور سماجی شعور کارفرما رہا۔ انھوں نے اسی شعور کے تحت اپنا پہلا افسانہ 'عشقِ دنیا و حبِ وطن' لکھا۔ جس کی بنیاد ہی جذبۂ حب الوطنی پر تھی۔ برٹش حکومت کے نزدیک دل میں حب الوطنی کا جذبہ رکھنا ہی سب سے بڑا جرم تھا۔ سو پریم چند اس جرم کے مرتکب ٹھہرے۔ 1907 میں جذبۂ حب الوطنی سے سرشار ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'سوزِ وطن' حکومتِ برطانیہ نے ضبط کر لیا۔ 'سوزِ وطن' کا پہلا افسانہ 'دنیا کا انمول رتن' میں انمول رتن وہ قطرۂ خون ہے جو مادرِ وطن پہ جان دینے والے سپاہی کے جسم سے ٹپکا ہے۔ 'سوزِ وطن' کے پہلے افسانے دنیا کا سب سے انمول رتن، میں وطن پرستی کا جذبہ کارفرما ہے۔ اس افسانے کی ہیروئن کہتی ہے:

''وہ قطرۂ خون جو وطن کی حفاظت میں گرے دنیا کی سب سے بیش قیمت شے ہے'' (بحوالہ اردو افسانہ: ترقی پسند تحریک سے قبل، ص 42)

یہاں ہمیں فیض کی ایک نظم یاد آ جاتی ہے جس میں زمین میں گرے قطرۂ خون کو شاعر 'اشرفی' سے تعبیر کرتا ہے۔ ممکن ہے فیض کے تحت الشعور میں کہیں یہ افسانہ رہا ہو:

یہ کون سخی ہیں/ جن کے لہو کی/ اشرفیاں، چھن چھن چھن چھن [ایرانی طلبہ کے نام]

'سوزِ وطن' میں شامل افسانے 'یہی میرا وطن ہے' اور 'لال فیتہ' قوم کو جنگِ آزادی کی تحریک دیتے ہیں اور وطن پرستی کے جذبوں کو سینوں میں بیدار کرتے ہیں۔ مجموعہ 'واردات' میں شامل افسانہ 'قاتل کی ماں' میں قاتل کی ماں اپنی کوکھ سے ایسا سپوت پیدا ہونے پر افسوس کرتی ہے اور اپنے بیٹے کو عدالت کے سامنے اقبالِ جرم کے لیے کہتی ہے۔ ''اگر مرد ہے تو جا کر اپنا قصور تسلیم کر لے ورنہ ان بے گناہوں کا خون تیرے سر پر ہوگا''

مجموعہ 'آخری تحفہ' کے افسانہ 'جیل' میں 'شمبھو' اپنی محبوبہ 'روپ متی' سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

''... سارے ملک کے لیے سوراج۔ اتنے عظیم مقصد کے لیے مر جانا بھی اس زندگی سے کہیں اچھا ہے'' (بحوالہ اردو افسانہ: ترقی پسند تحریک سے قبل، ص 42)

پہلی جنگِ عظیم میں خیر خواہی کے عوض کہانی 'لال فیتہ' کے ایمان دار اور منصف مزاج ڈپٹی مجسٹریٹ ہیر دھری بلاس کو سرکار کی طرف سے رائے بہادر کے خطاب کے ساتھ لال فیتے میں لپٹا ایک سرکاری فرمان بھی دیا جاتا ہے۔ یہ وہ حکم نامہ ہے جس سے اس کے جذبۂ قومی کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ 'لال فیتہ' کا ہیرو اپنے قومی جذبے کی پاس داری کے لیے سرکاری خطاب واپس کر دیتا ہے اور بلا تاخیر اپنے عہدے سے سبکدوش کیے جانے کی سرکار سے استدعا کرتا ہے۔ 1921 میں خود پریم چند نے سرکاری نوکری سے استعفیٰ دے دیا تھا۔

پریم چند نے دیہات کی زندگی کو قریب سے دیکھا، وہ اسی ماحول کے پروردہ تھے۔ پریم چند نے معاشرے میں جفاکش مزدور پسماندہ افراد کی صورتِ حال کا بغور جائزہ لیا۔ دیہی زندگی میں ساہوکاروں مہاجنوں، جاگیرداروں اور زمین داروں کا بول بالا تھا۔ مذہبی رہنما، مذہب کے ٹھیکے دار برہمن بھی ان غریبوں کے ساتھ کچھ کم زیادتیاں نہیں کرتے۔ لگان ادا نہ کرنے کی صورت میں سود چڑھتا چلا جاتا ہے۔ افسانہ 'پوس کی رات' سماج کی اسی صورتِ حال کو آئینہ دکھاتا ہے۔ کھیتوں میں خون پسینہ ایک کر کے فصل اگانے والے جس کسان کو اقبال نے 'دستِ دولت آفریں' کہا ہے، اسی 'دستِ دولت آفریں' کسان کو اپنی محنت کی مزدوری بھی خاطر خواہ نہیں ملتی ہے۔ جاں نثار اختر کے الفاظ میں:

اور کیا مجھ کو ملے گا مری محنت کا صلہ
چند سکے ہیں مرے ہاتھ میں چھالوں کی طرح

رومان تحریک کے علمبردار سید سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتحپوری کی افسانوی مملکت میں عورت کا معشوقانہ اور شاہانہ تصور تھا۔ پریم چند نے عورت کی تصویر کا وہ رخ بھی

دیکھا جس کی طرف کسی نے دیکھنے کی ضرورت ہی نہ محسوس کی۔ پریم چند نے 'بچوں والی غریب بے حسن عورت' 'جو بچے کو کھیت کی مینڈ پر سلائے پسینہ بہا رہی ہے'' الجھے ہوئے بالوں، پپڑیاں پڑے ہوئے ہونٹوں اور کمھلائے ہوئے رخساروں'' والی عورت میں بھی حسن دیکھا ہے۔ 'ایثار، اور عقیدت اور مشکل پسندی' کا حسن دیکھنے کے لیے وہ خود وسعتِ نظر سے کام لیتے ہیں اور ادیبوں کو بھی اس طرف متوجہ کرتے ہیں کہ'' انھیں اب حسن کا معیار بدلنا ہوگا''۔ ان کا کہنا ہے کہ:

'' فاقہ اور عریانی میں بھی حسن کا وجود ہو سکتا ہے۔''

(خطبۂ صدارت)

پریم چند کے افسانے 'روشنی' کی عورت اپنے خاوند کے گزر جانے پر محنت مزدوری کرتی ہے مگر خودداری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔ کفن کی عورت اپنے کام چور سسر اور شوہر سے زیادہ محنت کر کے ان کے لیے دو وقت کی روٹی کا انتظام بھی کر لیتی ہے۔ انھوں نے سماج کی ستائی مظلوم اور بے بس عورت کو ہمدردی کے ساتھ دیکھا۔ انھوں نے بیوہ کی دوسری شادی کی حمایت میں قلم اٹھایا، کمسن لڑکی کی بے جوڑ شادی کی خرابیوں پر گہری نظر ڈالی اور اس کے خلاف آواز بلند کی۔ اسے فرسودہ رسم و رواج کی جکڑ بندیوں سے آزاد کرانے کی کوشش کی۔ پریم چند نے طوائف کے سماجی مرتبے پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ افسانہ 'مزارِ الفت' میں ذلت بھری نگاہ سے دیکھی جانے والی طوائف کے مسائل اٹھائے ہیں۔

پریم چند کے یہاں عورت کم از کم سوچنے اور کوئی فیصلہ لینے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔ 'دنیا کا انمول رتن' قاتل کی ماں' بازیافت، ابھاگن، اور 'بدنصیب ماں' کی عورتیں سوجھ بوجھ رکھتی ہے۔ ان کی کہانیوں میں عورت زندگی کے سرد و گرم سے لڑتی اور جوجھتی دکھائی دیتی ہے۔ ان کا کردار اپنی اصلیت کے ساتھ ابھر کر سامنے آیا ہے۔

یلدرم اور پریم چند ایک ہی زمانے میں دو مختلف رجحانات کے نمائندے ہیں۔ ظاہری واقعات کے نیچے بہنے والے دھاروں کو پریم چند کے حساس دل نے محسوس کیا اور گہری نظر سے دیکھا۔ بیسویں صدی کے آغاز سے ہی مغربی حکمرانوں کے تسلط کے خلاف ہندوستانی سماج میں کشمکش اور اضطراب میں شدت آ رہی تھی۔ حصولِ آزادی کی تڑپ، غلامی کی لعنت کا بڑھتا احساس وطن پرستی کا شدید جذبہ اخلاقی اقدار کی شکست و ریخت، زمیندارانہ و جاگیردارانہ ماحول کی گھٹن، عدم مساوات، ذات و مذہب کی تفریق زندگی کے داخلی و خارجی اثرات، بدلتی ہوئی زندگی کے یہ وہ حقائق تھے جن کا سامنا پریم چند نے کیا ہے۔ انھوں نے ان تمام صورتِ حال سے اغماض نہیں برتا۔ ان کے تخلیقی محرکات میں ان تمام عوامل کی کار فرمائی ہے:

'' رومانی تحریک زندگی کی ٹھوس حقیقتوں سے نظر چراتی ہے اور ہر چیز کو رنگین شیشوں کی عینک سے دیکھنے کی عادی ہوتی ہے اور جب ان خوابوں کی تعبیر اس کی امیدوں کے مطابق نہیں نکلتی تو وہ کسی دوسری دنیا میں پناہ ڈھونڈتی ہے۔'' (ترقی پسند افسانوی ادب، شاہد لطیف (اردو، جولائی 1940)، ص 441، بحوالہ 'اردو افسانہ: ترقی پسند تحریک سے قبل، ص30)

پریم چند نے دیہات کی زندگی کو قریب سے دیکھا، وہ اسی ماحول کے پروردہ تھے۔ پریم چند نے معاشرے میں جفاکش مزدور پسماندہ افراد کی صورتِ حال کا بغور جائزہ لیا۔ دیہی زندگی میں ساہو کاروں مہاجنوں، جاگیرداروں اور زمیں داروں کا بول بالا تھا۔ مذہبی رہنما، مذہب کے ٹھیکے دار برہمن بھی ان غریبوں کے ساتھ کچھ کم زیادتیاں نہیں کرتے۔

پریم چند نے کسی دوسری دنیا میں پناہ نہیں ڈھونڈی بلکہ حالات کے چیلنج کو قبول کرتے ہوئے حقیقت نگاری کو اپنا شعار بنایا۔ وہ معاشی پریشانیوں سے بھی گزرے، سوتیلی ماں سے بھی واسطہ پڑا۔ زندگی کی تلخ سچائیاں بے نقاب ہو کر ان کے سامنے آئیں لیکن انھوں نے ان سے نظر نہیں بچائی بلکہ ان کا بغور مشاہدہ کیا ابتدا میں انھوں نے مثالیت پسندی اور داستانوی طرز سے بھی کام لیا۔ جلد ہی اپنی تحریروں کے لیے سماجی حقیقت نگاری کا انتخاب کیا۔ پروفیسر احتشام حسین لکھتے ہیں:

'' مختلف خیالات اور تصورات میں سے کسی خاص نقطۂ نظر کا انتخاب شعور کی رسائی پر منحصر ہے اور یہیں فرد کی شخصیت اور اس کے انفرادی ذوق کا اظہار ہوتا ہے۔''

(جدید ادب منظر اور پس منظر، ص133)

پروفیسر احتشام حسین کا کہنا ہے:

'' شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ جس ادیب کو عصری رجحانات، قومی تہذیب، قومی افکار کی بنیادوں کا جتنا گہرا شعور ہوگا اتنے ہی منفرد انداز میں وہ حقائق کو پیش کر سکے گا گویا اس کی تخلیقات میں اس کی انفرادیت بھی جلوہ گر ہوگی اور اس کا عہد بھی'' (جدید ادب منظر اور پس منظر، ص134)

بلاشبہ پریم چند کو 'عصری رجحانات، قومی تہذیب' قومی افکار کی بنیادوں کا گہرا شعور تھا۔ انھوں نے اپنی انفرادیت کا لوہا منوایا۔ پریم چند نے انجمنِ ترقی پسند تحریک میں اپنے خطبۂ صدارت میں کہا تھا:

'' ہم ادیب سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنی بیدار مغزی سے، اپنی وسعتِ خیال سے ہمیں بیدار کرے ہم میں وسعت پیدا کرے'' (خطبۂ صدارت)

آگے پریم چند ادیب کے لیے نگاہ کی باریکی اور گہرائی کی صرف بات نہیں کرتے، بلکہ قدم قدم پر خود انھوں نے اپنی باریک بیں اور دوررس نگاہوں سے کام لیا ہے۔ ان کے نزدیک ادب:

'' حیات کے مسائل پر غور کرتا ہے، ان کا محاکمہ کرتا ہے، اور ان کو حل کرتا ہے'' (خطبۂ صدارت)

پریم چند نے اپنے اس خیال کو عملی جامہ بھی پہنایا۔ انھوں نے حیاتِ انسانی کے مسائل پر ہمدردی کے ساتھ غور کیا اور اس کا حل بھی تلاش کیا۔ افسانہ 'کفن' میں گھیسو اور مادھو جیسی ذہنیت رکھنے والوں کی بے حسی، خود غرضی اور ذہنی کج روی کی ذمے داری سماج پر بھی عائد ہوتی ہے۔ اس کہانی میں ان کا نقطۂ نظر اس طرح ابھر کر سامنے آتا ہے۔

'' جس سماج میں رات دن کام کرنے والوں کی حالت ان کی حالت سے کچھ بہت اچھی نہ تھی اور کسانوں کے مقابلے میں وہ لوگ جو کسانوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا جانتے تھے، کہیں زیادہ فارغ البال تھے وہاں اس قسم کی ذہنیت کا پیدا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔''

پریم چند کی زندگی کے آخری دنوں میں ان کا افسانہ 'کفن' 1935 میں منظر عام پر آیا۔ ترقی پسند تحریک 1936 میں شروع ہوتی ہے۔ بلاشبہ یہ شاہکار افسانہ ترقی پسند افسانہ کی تعمیر کو ایک مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے۔ پریم چند نے اپنے عہد کے سلگتے مسائل اور سسکتی زندگی پر نظر رکھی اور گہرے قومی اور سماجی شعور کے ساتھ قلم اٹھایا۔ ان کے کردار اپنے اندر عصری حسیت کی روح رکھتے ہیں۔ اردو افسانہ کی زندہ اور مستحکم روایت کا نام پریم چند ہے۔ پریم چند نے ترقی پسند افسانہ کو ایک زاویۂ نظر دیا۔ ان کا احتجاجی رویہ، اجتہادی رنگ، قومی و سیاسی سوجھ بوجھ ان کے افسانوں اور ان کے ناولوں کو زندگی کی حرارت بخشتے ہیں۔ ان کی تخلیق کی شریانوں میں ان کا گہرا سماجی شعور خون بن کر دوڑ رہا ہے۔

□

Dr. Nafees Bano, Aso. Prof. Dept of Urdu, Vasanta College For Women, Raj Ghat, Varanasi, (Banaras Hindu University)

شاہنواز فیاض

گیان چند جین کی تحقیقی خدمات

اردو کے ممتاز محقق، معتدل نقاد، ماہر علم عروض و لسانیات ڈاکٹر گیان چند جین 19 ستمبر 1923 کو سیوہارہ، ضلع بجنور کے ایک جین گھرانے میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اردو ادب کے جس میدان میں بھی قدم رکھا، وہاں اپنی ایک الگ شناخت بنائی، اور یہی نہیں بلکہ اس صنف کو اس معراج پر پہنچانے کی کوشش کی جس کی وہ مستحق تھی۔

گیان چند جین کا جو تعلیمی سفر جولائی 1929 کو شروع ہوا تو وہ اپنی آخری زندگی تک چلتا رہا۔ الہ آباد یونیورسٹی سے 1943 میں سیکنڈ ڈویژن میں بی اے اور وہیں سے انھوں نے 1945 میں ایم اے اردو فرسٹ ڈویژن کے ساتھ پاس کیا۔ ایم اے کے بعد انھوں نے وہیں اپنا ڈی فل (جو اس زمانے میں پی ایچ ڈی کی ڈگری کے مساوی ڈگری تھی) کا مقالہ پروفیسر ضامن علی کی نگرانی میں پورا کیا۔ ان کا موضوع مقالہ برائے ڈی فل 'شمالی ہند میں اردو کے نثری قصے ابتدا سے 1870 تک' طے پایا۔ اس وقت ڈی فل' کا مقالہ کم سے کم بیس ماہ کی مدت میں داخل کرنے کی اجازت تھی۔ گیان چند جین نے اپنا یہ مقالہ تیئس ماہ سے بھی کم مدت میں داخل کیا۔ اس سے پہلے اردو میں پی ایچ ڈی' چند اشخاص ہی نے کیا تھا۔ یونیورسٹی کی تعلیم ختم ہو جانے کے بعد انھوں نے تین سال روزگار کی تلاش میں صرف کر دیے۔ بالآخر 1950 میں پانیر (Pioneer) لکھنؤ میں بغیر تنخواہ کے سب ایڈیٹر ہو گئے۔ لیکن گیان چند جین کی زندگی ان کو اس مقام پر لے گئی جس کے لیے ہی ان کا ذہن سب سے مناسب تھا۔ یعنی 1950 میں حمیدیہ ڈگری کالج بھوپال میں اردو کی لکچر رشپ مل گئی اور یہیں سے ان کی معلمی کا دور شروع ہوا جو آخری عمر تک جاری رہا۔ گیان چند جین 1952 میں حمیدیہ ڈگری کالج کے صدر شعبہ ہوئے اور وہ وہاں 1965 تک اس عہدے پر فائز رہے۔ اسی بیچ یعنی 1953 میں ان کی شادی ہوئی۔ 'اردو مثنوی شمالی ہند میں' کے موضوع پر 1960 میں آگرہ یونیورسٹی نے انھیں ڈی لٹ کی ڈگری تفویض کی۔ اس کے علاوہ انھوں نے ایم اے سوشالوجی آگرہ یونیورسٹی سے سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔

اگست 1965 میں جموں یونیورسٹی میں بحیثیت پروفیسر تقرر ہوا۔ جہاں وہ 1976 کے نصف تک رہے۔ پھر اکتوبر 1976 میں الہ آباد یونیورسٹی میں پروفیسری کا چارج لیا۔ لیکن وہ یہاں بہت دنوں تک نہیں رہ سکے۔ اس کے بعد 1979 کو حیدرآباد یونیورسٹی میں بحیثیت پروفیسر ان کا تقرر ہوا اور 1987 تک اسی یونیورسٹی سے وابستہ رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انھیں مزید دو سال، دو ماہ کے لیے ملازم رکھ لیا گیا۔ اپریل 1989 کو گرمیوں کی چھٹیوں سے عین قبل سبکدوش ہوئے۔

گیان چند جین نے اپنے ادبی سفر کا آغاز شاعری سے کیا۔ پہلی غزل انھوں نے 1937 کے آخر میں کہی اور ان کا پہلا نثری مضمون جو 'فانی بدایونی کی شاعری' پر رقم کیا تھا، پارکر اسکول کی میگزین میں 39-1938 میں شائع ہوا۔ یہاں سے گیان چند جین کے لکھنے پڑھنے کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ آخر عمر تک جاری رہا جس کا بین ثبوت ان کی کتابیں اور وہ مضامین ہیں جو مختلف رسائل و جرائد کی زینت بنتے رہے۔

گیان چند جین کے دادا فارسی کے شاعر تھے اور خود ان کے بڑے بھائی پرکاش مونس اردو کے مشہور ادیب رہے۔ جس کا بین ثبوت ان کی کتاب 'اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر' ہے۔ جسے اہل ادب نے کافی سراہا۔ گیان چند جین بھی اسی لڑی کی ایک کڑی ہیں اور انھوں نے تحقیق میں اپنا مقام بلند کیا۔ ان کی تصنیف 'تحقیق کا فن' سے ہی ان کی تحقیقی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ کیونکہ اردو میں تحقیق اور اس کے اصول و مسائل پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ اس اعتبار سے گیان چند جین کی مایہ ناز تصنیف 'تحقیق کا فن' کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ انھوں نے اس کتاب کو مختلف عنوانات کے تحت مرتب کیا ہے۔ اس میں انھوں نے تحقیق کے موضوع، خاکہ، مواد کی فراہمی، زبان و بیان، مواد کی پرکھ، حزم و احتیاط اور مقالے کی تسوید جیسے اہم موضوع پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ مواد کی فراہمی کے متعلق انھوں نے لکھا ہے:

''کتابیں ہوں کہ مخطوطات، اردو میں تو انھیں تلاش کر کے فراہم کرنا ہی سب سے بڑی ریسرچ ہے۔ علم کے ہر پیاسے کو کنواں کھودنا ہوتا ہے یا پرانے کنوؤں میں بانس ڈالنے ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے بڑی بڑی لائبریریوں ہی میں جا کر تلاش کی جا سکتی ہیں۔ لیکن بعض اوقات چھوٹی لائبریریاں بھی کچھ پرانی کتابیں اور مخطوطات اپنے دامن میں چھپائے ہوتی ہیں... دلّی، لکھنؤ، حیدرآباد اور بمبئی میں پرانی کتابوں کے تاجروں کے ذخیرے میں تلاش کیجیے۔ ہو سکتا ہے ان کے پاس آپ کی موجودہ ضرورت کی کتاب نہ ملے لیکن کوئی دوسری نادر کتاب مل جائے گی''۔

(تحقیق کا فن، گیان چند جین، اتر پردیش اردو اکادمی، 1990، ص 156-157)

'تحقیق کا فن' محقق کی رہنمائی کرنے کے لیے ایک مفید کتاب ہے۔ گیان چند جین نے اس میں تحقیق سے متعلق تمام اہم موضوعات کا احاطہ کیا ہے اور یہی نہیں بلکہ مثالوں کے ذریعے اس کی وضاحت بھی کی ہے۔

اس طرح سے گیان چند جین اپنے تحقیقی میدان کو وسیع سے وسیع تر کرتے چلے گئے اور انھوں نے اپنی مشہور تصنیف 'اردو مثنوی شمالی ہند میں' میں تحقیقی مواد بڑی محنت، علمی ذوق اور متجسس بصیرت کے ساتھ جمع کیا ہے۔ اس کا اندازہ مذکور بالا کتاب کے باب سے بھی ہوتا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے کل گیارہ باب قائم کیے ہیں۔ انھوں نے اپنی تحقیق سے میر کی تین اور مثنویاں دستیاب کی ہیں جو غیر مطبوعہ ہیں۔ اس کے متعلق گیان چند جین اس طرح رقم طراز ہیں:

''راقم الحروف کو میر کی تین اور غیر مطبوعہ مثنویاں دستیاب ہوئیں۔ جنھیں ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اپنے مرتبہ کلیات میر میں شامل کر لیا ہے''۔

(اردو مثنوی شمالی ہند میں، ڈاکٹر گیان چند جین، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، 1969، ص 200)

گیان چند جین کی تحقیقی خدمات کو چند صفحات میں سمیٹنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ لیکن ان کی تحقیقی خدمات پر بحیثیت مجموعی غور کیا جائے تو انھوں نے ایسے ایسے گوہر تلاش کیے ہیں جو ان کے علاوہ شاید ہی کسی دوسرے سے ممکن ہوتا۔ انھوں نے غالب کا ایک شعر جو نسخۂ عرشی اور نسخۂ مالک رام دونوں میں اس طرح لکھا ہے:

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

اس شعر کو اس طرح مسخ کیا گیا ہے:

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری خوشامد سے

اس کے متعلق گیان چند جین نے لکھا ہے:

''نسخۂ عرشی اور نسخۂ مالک رام دونوں میں پہلا متن چھپا ہے اور دونوں میں 'مری خوشامد سے' کو سہو کاتب ظاہر کیا گیا ہے حالانکہ یہ متن نہ صرف غالب کے تصحیح شدہ نظامی ایڈیشن میں ہے بلکہ 1866 کے قلمی انتخاب میں بھی ہے جو غالب کے قلم کا صحیح کردہ ہے ایسی ترمیم کاتب کا سہو نہیں ہوسکتا مصنف کی شعوری اصلاح ہی ہے۔ اس سے معنی کے حسن میں کمی ہو کر کسی حد تک تعقید پیدا ہوگئی ہے''۔

(رموز غالب، گیان چند جین، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ دہلی، 1976، ص 70)

اسی طرح کے بے شمار ایسے کارنامے ہیں جو گیان چند جین نے انجام دیے۔ اگر ان کی کتابوں پر ایک نظر ڈال لی جائے تو ان کی تحقیقی بصیرت اور ان کا شعور بہت حد تک کھل کر سامنے آجائے گا۔ جیسے 'تحریریں' تفسیرِ غالب، تجزیے، حقائق، وغیرہ وغیرہ۔

اقبالیات کے موضوع پر بھی گیان چند جین کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ انھوں نے علامہ اقبال کا ابتدائی کلام جو 1908 تک کا تھا اسے تحقیق کے بعد تدوین کیا۔ 'ابتدائی کلامِ اقبال بہ ترتیب مہ و سال' کے نام سے 1988 میں حیدرآباد سے شائع کرایا۔ یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ اقبال کی شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے ہوئی ہے اور ایک عرصے تک وہ اپنے استاد داغ کے رنگ میں اشعار کہتے رہے۔ لیکن بیسویں صدی کے شروع ہی میں وہ اس رنگ سے آہستہ آہستہ ہٹنے لگے تھے اور اپنا نیا رنگ بنانے لگے تھے۔ داغ کے رنگ کی غزلیں علامہ اقبال نے بہت حد تک متروک کردی تھیں۔ اسی وجہ سے بانگ درا میں اس رنگ (داغ کے رنگ) کی صرف ایک غزل ملتی ہے۔ ایک شعر ملاحظہ ہو:

تمھارے پیامی نے سب راز کھولا
خطا اس میں بندے کی، سرکار کیا تھی؟

ایک طرف جہاں علامہ اقبال، داغ کا رنگ چھوڑ کر اپنا نیا راستہ بنا رہے تھے۔ ایسے میں اس بات کا تعین کرنا بڑا مشکل امر تھا کہ آیا یہ غزل پہلے رنگ کی ہے یا نئے رنگ کی؟ جب کہ یہ ممکن ہے کہ ابتدائی دور کی غزلیں بھی بعد کے رسالے میں شائع ہوسکتی ہیں۔ علامہ اقبال کی ایسی ہی ایک غزل جو پہلے (داغ کے رنگ) کی تھی رسالہ 'نشتر' دسمبر 1906 میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے متعلق گیان چند جین لکھتے ہیں:

''حیرت پر حیرت ہے کہ رسالہ 'نشتر' دسمبر 1906 میں شائع ہونے والی ان کی ایک غزل میں اس قسم کے اشعار ہیں:

کیوں وصل کے سوال پہ چپ لگ گئی تمھیں
دو چار گالیاں ہی سنا دو جواب میں
آئینہ رکھ کے سامنے زلفیں سنوار تو
تیری بلا سے، کوئی رہے پیچ و تاب میں

یہ داغ کے رنگ کے مضامین ہیں۔ 1906 تک اقبال کا فن پوری طرح بالیدہ ہو چکا تھا۔ یہ غزل اس زمانے کی نہیں ہوسکتی۔ کوئی پرانی غزل چھپوادی ہوگی''۔

(ابتدائی کلام اقبال بہ ترتیب مہ و سال، گیان چند جین، اردو ریسرچ سینٹر حیدرآباد، 1988، ص 33)

گیان چند جین بڑے وثوق سے اس لیے کہہ رہے ہیں کیوں کہ علامہ اقبال نے داغ کے رنگ کی جتنی بھی غزلیں کہی تھیں بعد میں انھیں یکسر منسوخ کردیا۔

گیان چند جین ایک ایسا نام ہے جو تحقیق کے میدان ہی تک محدود نہیں۔ بلکہ وہ ماہر لسانیات کی صف میں بھی قابل اعتبار مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے جہاں ادبی و تحقیقی دنیا میں خاصی مقبولیت و شہرت حاصل کی ہے وہیں ماہر لسانیات کی حیثیت سے ان کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ لسانیات کے موضوع پر پروفیسر جین کی دو کتابیں (1) لسانی مطالعے اور' عام لسانیات' ہیں۔ ان کی شہرہ آفاق کتاب 'لسانی مطالعے' میں ان کے ان مضامین کو یکجا کیا گیا ہے جو خالص لسانیات کے موضوع پر ہیں اور سب کے سب اپنے آپ میں نادر ہیں۔ راقم الحروف کی رائے میں عبدالقادر سروری کی مشہور کتاب 'زبان اور علم زبان' کے بعد اگر کوئی کتاب لسانیات کے زیادہ تر حصے کو محیط ہے تو بے شک وہ گیان چند جین کی کتاب 'لسانی مطالعے' ہے۔

گیان چند جین کو لسانیات سے خاصی دلچسپی تھی اور ان کے لسانیات سے متعلق مضامین، ہندو پاک کے متعدد جرائد و رسائل میں برابر شائع ہوتے رہے۔ گیان چند جین کی لسانی خدمات کو اردو دنیا کبھی بھی نظر انداز نہیں کرسکے گی۔

گیان چند جین نے بعض مصوتوں (vowels) کے ضمن میں ایسی ایسی نادر باتیں پیش کی ہیں کہ قارئین کی معلومات میں قیمتی اضافہ ہوتا ہے۔ مثلاً اے اور او کے بارے میں یہ اختلاف ہے کہ یہ دونوں جڑواں مصوتے ہیں یا واحد مصوتے۔ لیکن ان دونوں موصوتوں کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے:

''جڑواں مصوتے کا تلفظ کرتے وقت اعضائے نطق ایک مصوتے سے ابتدا کرتے ہیں اور پھسل کر دوسرے مصوتے پر پہنچ جاتے ہیں اس طرح دونوں آوازیں ایک ہی کوشش اور ایک ہی جھٹکے میں ادا کی جاتی ہیں۔ جڑواں مصوتے کا تلفظ اگر دیر تک جاری رکھا جائے تو پہلے مصوتے کی آواز ابتدا ہی میں ختم ہوجائے گی اور آخری مصوتے جاری رہے گا مثلاً آئی یا ائی کو اگر دیر تک جاری رکھیں تو محض اس کی آواز سنائی پڑے گی یعنی جڑواں مصوتے سالم حیثیت میں دیر تک ادا نہیں کیا جاسکتا۔ اے اور او کو ہم کتنی ہی دیر تک کھینچ کر بول سکتے ہیں اور ہر موقع پر ان کا پورا تلفظ سنائی دے گا۔ اس طرح یہ طے ہوجاتا ہے کہ اَے اور اَو واحد مصوتیں ہیں''۔

(لسانی مطالعے، گیان چند جین، ترقی اردو بورڈ ہند، 1973، ص 55)

درج بالا اقتباس سے یہ بات اظہر من الشمس ہوگئی کہ گیان چند جین کو لسانیات پر اتنا عبور حاصل تھا کہ وہ اس طرح کے باریک اور مختلف فیہ مسئلے پر بھی اپنی باتیں بڑے مدلل انداز میں کہہ جاتے تھے۔ یہ ان کی تحقیقی کاوش کا ہی نتیجہ ہے کہ جو گوشہ علمائے لسانیات میں اب بھی باعثِ اختلاف ہے اس گوشے کی گتھی کو بھی انھوں نے سلجھانے کی بھرپور سعی کی ہے۔

اردو کلاسیکی تحقیق کی اس روایت کو جو حافظ محمود شیرانی، امتیاز علی خاں عرشی، قاضی عبدالودود، مالک رام اور رشید حسن خاں سے وابستہ تھی گیان چند جین نے اسے آگے بڑھایا۔ یہ بات قابل غور ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو صرف تحقیق ہی تک محدود نہیں رکھا بلکہ لسانیات جیسے اہم ترین موضوع پر بھی خامہ فرسائی کی۔ اردو کی نثری داستانیں، غالب شناسی، پرکھ اور پہچان، اردو مثنوی شمالی ہند میں، شخصیات و مشاہدات جیسی اہم کتابیں لکھیں۔ ان کے علاوہ گیان چند جین نے ایک اہم اور تاریخی نوعیت کا کام بھی انجام دیا ہے۔ انھوں نے سیدہ جعفر کے ساتھ مل کر' اردو ادب کی تاریخ ابتدا تا 1700 تک' لکھی۔ گیان چند جین نے 'ایک بھاشا، دو ادب دو لکھاوٹ' جیسی ایک متنازع کتاب بھی لکھی۔ اردو کے ادبی حلقوں میں اس کتاب نے ہلچل مچا دی اور اس کی مخالفت میں کئی مضامین منظرِ عام پر آئے اور اس سے بھی بحث کا ایک راستہ کھلا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں گیان چند جین کے علمی، ادبی اور تحقیقی سرمائے پر نگاہ رکھنی چاہیے تاکہ ادب میں ان کے صحیح مقام کا تعین کیا جاسکے۔

□

Shahnawaz Faiyaz (Research Scholar)
Dept. of Urdu, Jamia Millia Islamia, New Delhi-110025

محمد اکبر

علامہ راشدالخیری کی نظم نگاری

راشدالخیری کا اصل میدان تو نثر ہے۔ مگر انھوں نے اردو نظم میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی نظموں میں بھی نثر ہی کی طرح دردوغم اور سوزو گداز پایا جاتا ہے۔ انھوں نے عروض وقواعد کی پابندی اور مروجہ بحروں کا اہتمام کیا ہے۔ ان سب کے باوجود انھوں نے کبھی یہ نہ ظاہر ہونے دیا کہ وہ شعر بھی کہتے ہیں۔ انھوں نے اپنی بیشتر نظمیں بغیر نام کے شائع کرائیں اور اگر کسی نظم کے ساتھ ان کا نام شائع ہوا بھی تو انھوں نے نظم سے پہلے ایک نوٹ لکھ دیا کہ وہ شاعر نہیں ہیں۔ جیسا کہ ہمیں ان کی ایک نظم 'صدائے راشد' کی ابتدا میں یہ نوٹ ملتا ہے: جیسا کہ وہ خود بیان کرتے ہیں:

''میں شعر کہنے کا مدعی نہیں ہوں میرے خیالات اتفاق سے اس نظم کی شکل میں ڈھل گئے ہیں کوئی صاحب مہربانی فرما کر اسے شاعری کی کسوٹی پر نہ پرکھیں۔''

(راشدالخیری، روداد قفس، دہلی دفتر عصمت کوچہ چیلان 1927 ص 32)

راشدالخیری کی نظموں کے دو مجموعے 'روداد قفس' اور 'گرفتار قفس' شائع ہو چکے ہیں جن میں انھوں نے انسانی جذبات اور روداد قلب کی تصویر ایسے موثر انداز میں کھینچی ہے کہ انسان بے اختیار رو پڑتا ہے، اور آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ وہ عورتوں کو اسیران قفس سمجھا کرتے تھے جنھیں انسان محض اپنے تفنن طبع کی خاطر کھلی ہوا اور آزادانہ پرواز سے محروم کر کے ایک پنجڑے کے اندر بند کر دیتا ہے اسی لیے انھوں نے اپنے دونوں مجموعے کا نام 'روداد قفس' اور 'گرفتار قفس' رکھا۔

'روداد قفس' راشدالخیری کا پہلا مجموعہ ہے اس میں کل سترہ نظمیں ہیں جب یہ مجموعہ شائع ہوا تو لوگوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کی بہت پذیرائی کی۔ ان نظموں میں قوم کی بچیوں کے نام ایک پیغام ہے جسے انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے۔

'بچپن کی یاد' مولانا کی ایک نظم ہے جو سب سے پہلے 1909 میں رسالہ عصمت میں شائع ہوئی تھی۔ اس نظم میں ایک سہیلی اپنی دوسری سہیلی کے خط کا جواب دیتی ہے کہ اسے بچپن کی یاد ستا رہی ہے، بچپن کے کھیلوں اور معصومانہ حرکات اس کے دل کو بے قرار اور بے چین کر رہی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بچپن کی کھیلی صادقہ میری سہیلی صادقہ
پیاری بھنلیی صادقہ خط کا تمہارے شکریہ
میں دور تھی مجبور تھی رنجوں میں چکنا چور تھی
ورنہ بگڑتی لاکھ تم میں آپ ہی لیتی منا

> راشدالخیری جزئیات نگاری میں کمال رکھتے ہیں ان کی قوت مشاہدہ اس قدر وسیع ہے کہ زندگی سے متعلق چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی ان کی نظر سے بچنے نہیں پاتیں یہ تمام خاصیتیں ان کے اشعار میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ مولانا نے نثر ہی کی طرح شاعری میں بھی محاورے اور روز مرہ کے استعمال کا خاص التزام کیا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ چھوٹے چھوٹے محاورے ان کے شعروں میں اس طرح نظر آتے ہیں جیسے انگوٹھی میں نگینے جڑے ہوں۔

تاروں بھری راتیں گئیں طاقوں بھری گڑیا چھٹی
دن کھیل کے رخصت ہوئے اب وقت ہے کچھ کام کا
پیپل کی چھاؤں یاد ہے دن تیر ہوتا تھا جہاں
مدت ہوئی دیکھا نہیں واں گھونسلہ تھا چیل کا

آخری شعر پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا مطالعہ فطرت کس قدر عمیق تھا۔ بلبل کے آشیانے کا ذکر تو آپ ہر دیوان کے صفحے پر پا جائیں گے مگر چیل کے گھونسلے پر ہر شاعر کی نگاہ نہیں پہنچ سکتی، وہاں اسی کی نگاہ جا سکتی ہے جو قدرتاً بہت حساس اور عقابی نظر لے کر آیا ہو۔ راشدالخیری کو جذبات نگاری اور منظر کشی کا خداداد ملکہ تھا، تخیل کے وہ بادشاہ تھے، عبرت و نصیحت، مقصد حاصل کرنے کی تڑپ، اور درد کی تاثیر سے نثر کی طرح ان کی نظم بھی خالی نہیں۔ ان کی اکثر نظمیں بڑی دردناک ہیں جن کے اشعار تیرونشتر کی طرح کلیجے کے پار ہو جاتے ہیں اور ہم انھیں حقیقی شاعر تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ منظر کشی اور مرقع نگاری کے چند نمونے ملاحظہ کیجیے:

برسات کی یہ رات اور پچھلا پہر سر پر گھٹا
ہے کس قیامت کا اندھیرا ہر طرف چھایا ہوا
ٹھنڈی ہوا برسات کی اور سائیں سائیں رات کی
قانون قدرت کا ہر ہستی پہ جادو چل گیا
گرمی کے سخت ایام میں برکھا کی صبح و شام میں
چولھے سے فارغ ہو کے تم اٹھتی تھی جب روٹی پکا

(صدائے راشد 1918)

یہ موسم تھا جیٹھ بیساکھ کا
برستا تھا مینھ ریت اور خاک کا
وہ لوؤں کا جھکڑ جو چلنے لگا
تو پانی بھی دیدے بدلنے لگا

(سرخاب کا دم واپسیں 1924)

ہلال عید کا مژدہ فضامیں دفعتاً گونجا
لگیں آنے صدائیں راحت وشادی کی گھر گھر سے
انساں درو دیوار پر خوشیوں کا مینھ برسا
مگن شوہر تھا دولت میں تو بیوی شاد بچوں میں

(ہماری عید منوادو 1928)

راشدالخیری کی شاعری میں ہمیں ہر طرح کے جذبات، رنج والم، مسرت وخوشی اور حیرت و غصے کی ساری کیفیتیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ وہ بچیوں کو ساون کی چڑیاں تصور کرتے ہیں جو برسات کے دنوں میں ادھر ادھر پھرتی ہیں اور جیسے ہی ساون ختم ہوتا ہے پھڑ پھڑانا شروع کر دیتی ہیں۔ ساون سے مراد میکا ہے ملاحظہ ہو ان کی ایک نظم جس کا عنوان ہے 'بیٹیوں کی فریاد'۔

سکھ چین کے دن ہو چکے بے فکر نیدیں سو چکے
دن عیش کا شام ہوگیا آنے لگے تارے نظر
نکلا لڑکپن بے وفا میکا فقط تھی اک سرا
آخر جرس بجنے لگا اور آگیا وقت سفر

آ پہنچی در پر پالکی محنت ہے سولہ سال کی
مل کر گلے رخصت کرو ہونے لگی ہے دوپہر

راشدالخیری جزئیات نگاری میں کمال رکھتے ہیں ان کی قوت مشاہدہ اس قدر وسیع ہے کہ زندگی سے متعلق چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی ان کی نظر سے بچنے نہیں پاتیں یہ تمام خاصیتیں ان کے اشعار میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ مولانا نے نثر ہی کی طرح شاعری میں بھی محاورے اور روز مرہ کے استعمال کا خاص التزام کیا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ چھوٹے چھوٹے محاورے ان کے شعروں میں اس طرح نظر آتے ہیں جیسے انگوٹھی میں نگینے جڑے ہوں۔

راشدالخیری کی شاعری میں جو چیز ہمیں سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ ان کے جذبات کی صداقت اور سادگی ہے، تکلف اور تصنع سے انھیں نفرت ہے۔ ان کے اشعار میں نرمی، آہستہ روی اور گھلاوٹ کے ساتھ بلا کی غنائیت، موسیقیت اور ترنم ہے۔ راشدالخیری یہ نغمگی مترنم الفاظ اور چھوٹی بحروں سے پیدا کرتے ہیں یہ شعر دیکھیے:

رسیلی یہ آنکھیں چمک دار سر
یہ نازک کمر اور رنگین پر
زمرد و پکھراج و نیلم ہے تو
نشیمن کی ملکہ ہے بیگم ہے تو

'مظلوم حسینہ' راشدالخیری کی ایک مشہور نظم ہے دیکھیے اس نظم میں کتنی برجستگی اور روانی ہے:

دیار یثرب میں شام غربت سر حسینہ پر آرہی تھی
زمیں پہ ہلکا سا تھا ترشح فلک پہ بدلی سی چھارہی تھی
ہوا کے جھونکے سے کپکپاتی، قدم بڑھائے چلی بدیسن
کہ پہنچوں منزل پہ جلد جاکر کروں سوامی کے اپنے درشن
کیے تھے کانٹوں نے پاؤں زخمی، پھٹی ہوئی سر پہ اک ردا تھی
مگر جمال نبیؐ کی شیدا، خیال محبوب میں فنا تھی

'ماں کا پیام' ایک پرسوز نظم ہے جس میں ایک ایسی ماں کے دلی جذبات کا اظہار کیا گیا ہے جس کا لخت جگر اس سے جدا ہو گیا ہے اور وہ اس کی تلاش میں پریشان ہے:

اس دل کی لگن نے کیا جوگن
گھر بار چھٹا تیرے کارن
نینا ترسیں دکھلا درشن
چھتیاں لگ جا آجا احسن
دن رات ہوئے عمریں بیتیں
کھل کھل کر پھول ہوئی کلیاں
پر دل کی کلی میری نہ کھلی
جنگل دیکھے ڈھونڈیں گلیاں
چلتی ہے ہوا پھولوں میں بسی
کہسار میں جب دن ہوتا ہے
آتی نہیں بو تیری لیکن
دل خون کے آنسو روتا ہے

ایک غم زدہ ماں کے جذبات کتنے سچے اور دل کو چھو لینے والے ہیں اس کا اندازہ مذکورہ اشعار سے لگایا جاسکتا ہے۔

'خالد بن ولید' ان کی وہ نظم ہے جس میں انھوں نے اسلاف کے کارناموں اور ولولوں کا ذکر بڑے موثر انداز میں کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ وہ کس طرح اپنی بہادری سے قیصر و کسریٰ پر حکومت کرتے تھے لیکن جوش ایمانی، خوف خدا اور رحم دلی کے اعتبار سے وہ اس قدر نرم مزاج ہوتے تھے کہ اندھے کے سامنے اپنے عجز و انکساری کا اعتراف کرتے تھے یہاں اس واقعے کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت عمرؓ کا پاؤں اندھیرے کی وجہ سے ایک اندھے فقیر کے پاؤں پر جا پڑا اور آپ نے فوراً معافی مانگی تھی:

آلا اے قوم بدقسمت یہ حالت اور یہ صورت
ہوئے اعلیٰ سے تم ادنیٰ بنے شاہوں سے زندانی
خدا کی شان اب وہ دوسروں کو درس عبرت ہوں
کیا کرتے تھے جو کل تک شہنشاہی جہاں بانی
رگڑ دی قیصر و کسریٰ کی گردن یہ شجاعت تھی
گرے قدموں پہ اک اندھے کے یہ تھا جوش ایمانی
مگر میدان میں جس وقت تیغ خالدی چمکی
تو عالم دنگ تھا حیرت میں تھے رومی و نصرانی
نہ تھی تلوار بجلی تھی قیامت تھی کہ آفت تھی
کہ دو گھنٹے میں پتہ دشمنوں کا ہو گیا پانی

راشدالخیری ایک طنز نگار بھی تھے انھوں نے اپنی نظموں میں اس سے استفادہ کیا ہے اکبر الہ آبادی ہی کی طرح انھوں نے بھی مغربی تہذیب کی پھبتیاں خوب اڑائی ہیں فرماتے ہیں:

چھوڑو لیبری چیتھڑے — پھینکو پرانے لیتڑے
گاؤن بھی ہو اور بوٹ بھی — وقت کا ہے یہ اقتضا
چولھے میں اب برقع رکھو — پردے کو دو لو کا لگا

راشدالخیری فطرتاً مذہبی اور اصلاح پسند تھے۔ اپنی نظموں، ناولوں اور افسانوں میں انھوں نے مسلمان عورتوں کی پریشانیوں اور تکلیفوں کا بیان نہایت واضح انداز میں کیا ہے ان کی کوئی بھی نظم ایسی نہیں جس میں ایک خاص کیفیت یا نصیحت کی وضاحت نہ کی گئی ہو۔ راشدالخیری کی نظمیں فن سے زیادہ فکر و خیال کی ترسیل کرتی ہیں۔ ان کی نظموں کے موضوعات میں کائنات کا ہر رخ اپنے تجزیے اور تحلیل کے تسلسل کے ساتھ آتا ہے۔ ہر نظم اس قدر غم انگیز پیرائے میں ڈوبی ہوئی ہے کہ اس میں زندگی کی معنویت کا اظہار ہوتا ہے۔ راشدالخیری کا قلم جذبات کے متلاطم سمندر کا ایک نہ تھکنے والا پیراک تھا۔

کہا جاتا ہے کہ کامیاب ادیب وہ ہے جس نے اپنی تحریر میں خیالات کے لیے مناسب الفاظ تلاش کیا ہو، اگر اس بات کو تسلیم کرلیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ ہماری زبان کے سیکڑوں الفاظ جنھیں زمانہ بھولتا جارہا تھا۔ راشدالخیری نے اپنے زور قلم سے انھیں سکہ رائج الوقت بنادیا۔

راشدالخیری کا اسلوب اردو ادب میں ایک جداگانہ اہمیت کا حامل ہے۔ اردو کے بیشتر نقادوں نے ان کی سحر نگاری کا اعتراف اور طرز تحریر کی تعریف کی ہے ان کے اسلوب بیان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ قلعہ معلیٰ کی بیگماتی زبان کچھ ایسی لکھ گئے کہ ان کے بعد تو کیا آج تک کسی سے نہ لکھی گئی بلکہ ان کے ساتھ ہی ختم ہو گئی۔ بقول جوش ملیح آبادی:

شمع راتوں کو بہاتی تھی جو آنسو اٹھ گئی
دہر سے وہ کیا اٹھا دہلی سے اردو اٹھ گئی

ڈاکٹر سید عابد حسین لکھتے ہیں:

''راشدالخیری کی کتابوں کی ایک نمایاں صفت ان کی پاکیزہ زبان ہے بیسویں صدی کے انگریزی داں مصنفین کا عجز بیان بڑی حد تک زبان سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ ان کی زبان پر انگریزی ترکیبیں اور محاورے چڑھے ہوتے ہیں اور وہ انھیں اردو کے الفاظ میں ادا کرنا چاہتے ہیں مگر چونکہ وہ اپنی زبان کی ساخت سے ناواقفیت اور اس کی روح سے نا آشنا ہیں اور ان کے الفاظ کا ذخیرہ بہت محدود ہے اس لیے اپنے خیالات کو ادا کرنے کے لیے انوکھی ترکیبیں تراشتے ہیں جو اردو میں کسی طرح نہیں کھپ سکتیں راشدالخیری بھی انگریزی داں تھے مگر ان کے ذہن نے دلی کی اردو کی آغوش میں پرورش پائی تھی اور اپنی خداداد قابلیت کی بدولت اس تربیت سے پورا فائدہ اٹھایا۔ اس دور کے ناول نویسوں میں راشدالخیری کے سوا کوئی اردو پر پوری قدرت نہیں رکھتا اور اسے اہل زبان کی طرح نہیں برت سکتا۔''

(عصمت دہلی، راشدالخیری نمبر اگست 1964ء ص 584)

مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ راشدالخیری اپنی زبان و بیان اور اسلوب نگارش کی بنا پر ہمیشہ یاد کیے جائیں گے اور انھوں نے اردو ادب کی جو خدمت انجام دی ہے اسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

□

Mohd Akbar, 230, Sutlej Hostel, JNU
New Delhi - 110067

عتیق اللہ

شاد کی غزل کے دو رنگ

دبستان عظیم آباد کے عظیم غزل گو شاعر سید علی شاد عظیم آبادی کا شمار جدید غزل کے پیش رو میں ہوتا ہے۔ ان کی مدت حیات 1846 سے 1927 تک محیط ہے۔ شاد کی ابتدائی زندگی پر میر سید محمد کی صحبت اور تربیت کا خاصا اثر دکھائی پڑتا ہے جس نے ان کی شاعری میں فصاحت و بلاغت اور ندرت خیال پیدا کیا۔ انھوں نے ابتدائی کلام پر اصلاح، ناظر وزیری، میر تصدق حسین زخمی سے لی، لیکن انھوں نے شاعری کا استاد الفت حسین فریاد کو تسلیم کیا ہے۔ شاد نے غزل کے علاوہ مثنوی، مرثیہ، قصیدہ میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اردو اصناف نثر ناول، ناولٹ، سوانح، تذکرہ اور تاریخ پر بھی دسترس حاصل ہے۔ انھوں نے نثر میں بھی ایسے نمونے پیش کیے ہیں جو خاصی اہمیت کے حامل ہے۔ ان کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت زبان کی صفائی سادگی اور ندرت بیان ہے۔ غزل کی مقبولیت کو بڑھانے اور روبہ زوال اثر کو روکنے میں شاد عظیم آبادی کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ انھوں نے غزل کو نہ صرف روبہ زول ہونے سے بچایا بلکہ ایک صحت مند زیست اور جہت عطا کی۔ اس میں ایسی دلکشی اور شیرینی بھردی کہ غزل پھر سے پوری آب و تاب سے نمودار ہونے لگی۔ انھوں نے اردو غزل کو ایک منفرد اسلوب اور نیا آہنگ عطا کیا۔ شاد کی تمام تخلیقات ان کی حیات میں ہی منظرعام پر آچکی تھیں۔ تاہم غزلوں کا دیوان 'نغمہ الہام' ان کی وفات کے بعد شائع ہوا۔ اس کے علاوہ خودنوشت و سرگزشت کے کئی مجموعے بھی شائع ہوچکے ہیں۔ شاد کی شاعری کی اہمیت و افادیت کا اعتراف کم و بیش تمام نقادوں نے کیا ہے۔ کچھ جزوی اختلافات رائے رکھنے کے باوجود انھیں عصر حاضر کا عظیم شاعر مانا گیا ہے۔ گوکہ شاد اپنی ذات میں مستقل دبستان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی وفات 6 جنوری 1927 کو عظیم آباد میں ہوئی۔ (ادارہ)

جس طرح تاریخ کی سمت و رفتار کبھی یکساں نہیں ہوتی، ادب کی تاریخ میں بھی کم وبیش اسی طرح اپنی راہ آپ بنانے کا ایک ایسا عمل جاری رہتا ہے جس کے محرکات ہمیشہ واضح نہیں ہوتے۔ تاریخی تبدیلی کے عمل کے پہلو بہ پہلو بعض ادبی اور غیرادبی فلسفیانہ و نیم فلسفیانہ تصورات کے گہرے اور کم گہرے اثر سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن ان اثرات کی بھی ایک مہلت ضرور ہوتی ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بہت سی اتھل پتھل کے بعد بعض چیزیں پھر اپنے معمول پر آنے لگتی ہیں، بعض چیزیں تغیر کے عمل سے گزر کر ایک نیا شائبہ دینے والی ہیئت میں ڈھل جاتی ہیں۔ کچھ بھرم ٹوٹتے ہیں، کچھ دعووں میں شکنیں پڑتی ہیں۔ بعض فن کار اپنے باطن کی قوت کو محفوظ رکھنے کی اہلیت کھودیتے ہیں اور باہر کا دباؤ ان کی آزاد نموپذیری پر قدغن لگا دیتا ہے۔ بعض فن کار باہر کے دباؤ کے خلاف مزاحمانہ جدوجہد بھی کرتے ہیں اور اپنے طور پر اپنی راہ کا تعین کرنے میں ان کی ساری جستجوئیں ایک مرکز پر مجتمع ہوجاتی ہیں۔ ادب میں روایت کا کردار خود گھس پیٹھ کا ہوتا ہے۔ جس کی مزاحمت آسان نہیں ہوتی۔ اگر ایام جاہلیت کی شعری روایات کو بھی ہم شامل کریں تو ہمارا ادبی لاشعور تقریباً ڈیڑھ ہزار برسوں پر محیط سلسلۂ روایت کا ساختیایا ہوا ہے۔ ایک شعورمند فن کار جب اپنی ایک علیحدہ پہچان بنانے کے لیے کوشاں ہوتا ہے تو وہ روایت سے متصادم ہی نہیں ہوتا بلکہ اپنے آپ سے بھی متصادم ہوتا ہے۔

❖

شاد عظیم آبادی بلاشبہ ایک شعورمند اور آگاہ شخصیت کے مالک تھے جن کے لیے روایت ایک اہم سوال تھی کہ اسے قبول کیا جائے تو کس حد تک اور رد کیا جائے تو کس حد تک۔ انھیں یہ بھی بخوبی علم تھا کہ ہر عہد کا ایک عمومی بلکہ حاوی مذاق بھی ہوتا ہے جو اکثر فن کاروں کو بڑے فریب میں مبتلا رکھتا ہے۔ جو فن کار عمومی مذاق کو فوری تحسین و ستائش کے حصول کی غرض سے اخذ کرتے ہیں وقتی شہرتیں ان کے قدم چومتی ہیں جیسے شاہ نصیر، ذوق اور داغ وغیرہ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ بعض ایسے فن کار بھی ہوتے ہیں جو عصری عمومی مذاق کی اضافیت اور عارضیت کے راز سے واقف ہوتے ہیں۔ وہ اس سے متصادم بھی ہوتے ہیں۔ ان کے فن کو پہچاننے اور صحیح معنوں میں اس کی شایان شان قدر و منزلت کرنے والی نسل بعد کے زمانوں سے تعلق رکھتی ہے۔ شاد بھی ان نسلوں پر زیادہ قانع تھے جو پردۂ غیاب میں تھیں۔ ان کا شمار بھی انھیں فن کاروں میں کیا جانا چاہیے جنھیں صرف اور صرف اپنی تلاش سے غرض تھی۔ اپنی خودگزشت کے مقدمے میں انھوں نے لکھا ہے:

''کوئی زمانہ اہل کمال سے خالی نہیں ہوگا مگر افسوس ہے کہ ابنائے زمانہ اکثر اس کے کمال کا اعتراف کرنے میں ہچکچاتے ہیں۔ ہر صاحب کمال کے عہد میں عموماً چار قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک طبقہ ہے جس کو یہ خبر بھی نہیں ہے کہ کمال، فی نفسہ کیا چیز ہے اور اس کا نفع کیا ہے۔ ایسے لوگوں سے کوئی بحث نہیں ہے کیونکہ یہ طبقہ لَا یضرُّ وَلَا یَنفَعُ میں داخل ہے۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جو اس بات کی حس تو رکھتا ہے کہ کمال کے کیا منافع ہیں مگر چشم بصیرت اس کی ایسی بند ہے کہ وہ اپنے زمانے کے

باکمالوں کو پہچان ہی نہیں سکتا۔ تیسرا طبقہ وہ ہے جو دل میں کسی باکمال کے کمال کا معترف ضرور ہے مگر بہ ظاہر اس کا اظہار کرتے ہوئے اس کو سخت ناگوار ہوتا ہے۔''

دراصل محولہ بالا اقتباس میں شاد نے جن طبقات کی طرف نشاندہی کی ہے وہ ہمارے ناقدین کے تین زمرے ہیں۔ شاد کے عہد میں وہ اقلیت میں تھے۔ موجودہ عہد میں ان کی کثرت کی ایک بڑی وجہ ہمارے اکثر تخلیق کاروں کی بے ضمیری اور شعارِ کاسہ لیسی ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اعتراف و انصاف سے باز رہنے کی وجوہ ہر دور اور ہر نسل کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ شاد کا المیہ یہ تھا کہ وہ کسی ایسے بڑے مرکز سے جڑے ہوئے نہیں تھے جہاں ترجیحات کی فصلیں اُگتی ہیں اور تعصبات کی آبیاری ہوتی ہے۔ شاد کو اپنی تخلیقی استعداد اور اپنے زمانے کے حاوی مذاقِ سخن سے ایک علیحدہ تصورِ فن اور تاکیدِ فن پر بھروسہ تھا۔ ان کی بے نیازی اور استغنا نے 'بہ ظاہر' جس طمانیت کے احساس کو جنم دیا وہ احساس ایک سچے اور جینوئن فن کار کا احساسِ طمانیت تھا۔

❖

میں نے اوپر طمانیت کے احساس کے ساتھ 'بہ ظاہر' کا سابقہ بھی لگایا ہے، جس کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ روایت کا شعور جہاں ان کے تخلیقی احساس کو برانگیخت کرنے کا ذریعہ ہے وہیں وہ زنجیرِ پا بھی ہے۔ انھیں اپنے لحن کے تشخص اور امتیاز کی خاص فکر تھی۔ دوسرے لفظوں میں وہ ایک مختلف درجے پر خود کو قائم کرنا چاہتے تھے۔ جس میں وہ بہت زیادہ نہ سہی تھوڑے بہت کامیاب ضرور ہوئے۔ ایک غزل گو کی حیثیت سے یہ تھوڑا بہت بھی یوں نمایاں کہلائے گا کہ حالی اور آزاد کے بعد نظم کے میلان نے ایک فیشن کی صورت اختیار کرلی تھی۔ نظم پڑھے لکھوں کی چیز تھی اور غزل کے لیے طبیعت کا موزوں ہونا ہی کافی تھا۔ حالی اور آزاد نے نظم کا صرف ایک خاکہ مہیا کیا تھا یا یہ کہیے کہ نظم کا تجربہ کیا تھا جس میں وہ کمیاں موجود تھیں جو کسی بھی اولین تجربے میں ممکن ہوسکتی ہیں۔ سب سے بڑی کمی تخلیقی احساس کی تھی جسے پورا کرکے اقبال نے نظم کو قائم کردیا تھا۔ اقبال کی نظم ان کے داخل کی آواز تھی۔ اسی داخل کی آواز نے ان کی غزل کو بھی انفراد بخشا تھا۔ لیکن اقبال کی غزل ان کی نظم ہی کا ضمیمہ ہے۔ ان کی نظم کے لسانی کردار نے غزل میں رچ بس کر ایک ایسے تجربے کی صورت اختیار کرلی جو غزل کے خصوص میں نیا اور نامانوس تھا۔ اقبال کے عہد میں ہی شاد کی ایسی مثال ہے جو فانی، اصغر، حسرت، یگانہ اور فراق سے پہلے غزل کو از سرِ نو قائم کردیتے ہیں۔ نظم کے شور، اقبال کی محیط آواز اور داغ و امیر کے قائم کردہ عمومی اور حاوی مذاق نے شاد کی طرف سنجیدگی کے ساتھ توجہات ہی کو منعطف نہیں ہونے دیا۔

❖

شاد نے اپنی غزل کو غالب اور داغ سے 'انداز جداگانہ اور فلسفہ، الٰہیات اور اخلاقی مضامین کو استعارے کی زبان میں ادا کرنے کے طریقے کو اپنی غزل کے خاص کردار سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن یہاں میں یہ ضرور اشارہ کرنا چاہوں گا کہ غزل میں جس internal frame breaking یا داخلی قالب شکنی کا تجربہ غالب کی غزل کے ذریعے عمل میں آیا تھا اس کی محض بعض رمقیں flashes

> شاد عظیم آبادی بلاشبہ ایک شعور مند اور آگاہ شخصیت کے مالک تھے جن کے لیے روایت ایک اہم سوال تھی کہ اسے قبول کیا جائے تو کس حد تک اور رد کیا جائے تو کس حد تک. انھیں یہ بھی بخوبی علم تھا کہ ہر عہد کا ایک عمومی بلکہ حاوی مذاق بھی ہوتا ہے جو اکثر فن کاروں کو بڑے فریب میں مبتلا رکھتا ہے. جو فن کار عمومی مذاق کو فوری تحسین و ستائش کے حصول کی غرض سے اخذ کرتے ہیں وقتی شہرتیں ان کے قدم چومتی ہیں جیسے شاہ نصیر، ذوق اور داغ وغیرہ کی مثال ہمارے سامنے ہے. بعض ایسے فن کار بھی ہوتے ہیں جو عصری عمومی مذاق کی اضافیت اور عارضیت کے راز سے واقف ہوتے ہیں. وہ اس سے متصادم بھی ہوتے ہیں. ان کے فن کو پہچاننے اور صحیح معنوں میں اس کی شایان شان قدر و منزلت کرنے والی نسل بعد کے زمانوں سے تعلق رکھتی ہے. شاد بھی ان نسلوں پر زیادہ قانع تھے جو پردۂ غیاب میں تھیں.

ہی، سودا، درد اور ناسخ کے کلام میں کارفرما تھیں۔ غالب نے نسبتاً زیادہ صلابت آمیزی اور پُراعتمادی کے ساتھ ان جذبوں کو ترجیح دی جو بلند کوش بھی تھے اور گہری فکر اور گہری سنجیدگی کے مظہر بھی تھے۔ غالب کے اس اقدام کو اپنے دور کی روایتی اقلیمِ غزل کے حدود کو وسیع کرنے کا نام بھی دیا جاسکتا ہے۔ شاد نے روایتی غزل سے بھی بہت کچھ اخذ کیا ہے لیکن غزل میں فکر کی روایت اس سلسلے سے جس کا احیا غالب نے کیا تھا، شاد کے وجودی اور ماورائی تجربوں کو ایک نئی تحریک ملتی ہے۔ (حالانکہ غالب کو انھوں نے کم ہی سراہا ہے) شاد نے مابعد الطبیعیاتی مضامین سے متعلق جس غیر رسمی اندازِ فکر کو اولیت بخشی تھی وہ اصلاً درد سے زیادہ غالب کا مرہون ہے۔ فلسفہ الٰہیات اور وجود کے مسائل کی طرف ان کی رغبتِ خاص کے ایک معنی یہ بھی تھے کہ وہ حقیقت سے پرے اور پرے ان حقائق کو اپنے محسوسات کا حصہ بنانے کے درپے تھے جن کے اسرار کی اپنی ایک الگ دنیا ہے۔ جیسے شاد پر یہ حقیقت منکشف ہوگئی ہو کہ ہر حقیقت کا ایک غیاب ضرور ہوتا ہے۔ انسان کے لیے جس کی اسرار کشائی کا مرحلہ ہمیشہ ناقابلِ تسخیر ہی ثابت ہوا ہے۔ غالب کی لسانی تنظیم میں شعوریت کے شائبے کے باوجود خودروی اور غیر متوقع پن کی جو صورت ہے اور تحت اندر تحت ایک طرح کا ناقابلِ گرفت اور بے نام جوہر ہے، شاد کا مقصد اسے آزمانے کے بجائے تفکر کی اس روش کو بحال کرنا تھا جسے داغ، امیر اور جلال وغیرہ کے سلسلے نے پیچھے دھکیل دیا تھا۔ صحیح معنی میں اقبال اور شاد ہی نے اپنے اپنے طور پر اسے قائم رکھنے کی کوشش کی تھی۔ شاد کا قصد اخفائے خیال سے زیادہ ترسیلِ خیال پر تھا۔ اسے غالب کی روز بروز بڑھتی ہوئی شہرت سے پیدا ہونے والے تشویشِ اثر کے حصار سے نکلنے کی ایک کوشش سے بھی موسوم کیا جاسکتا ہے:

تنِ ضعیف تری راہ میں بہت ہے نزار
مثالِ نقشِ قدم، پائمال ہو کے رہے

———

کدھر خیال ہے دنیا میں، کیسی آزادی
قدم بھی رکھنے نہ پایا تھا میں کہ قید ہوا

———

یہاں تو جا و بے جا بندشیں ہر ہر قدم پر ہیں
وہ کیسی سرزمیں ہوگی، جہاں سب کچھ روا ہوگا

———

دیکھا تو ہوگا ہم نے ازل میں ترا جمال
لیکن وہ کوئی وقت نہ تھا امتیاز کا

———

سحر ہے اس سرا سے وقت آیا شاد جانے کا
کسے باندھوں، نہ بستر ہے نہ تکیہ ہے سرہانے کا

شاد کی غزل پر لکھے ہوئے ایک دوسرے مضمون میں، میں نے وضاحت کے ساتھ یہ لکھا ہے کہ شاد کے وجودی تجربے میں زندگی کی محدودیت اور کم کوشی کا احساس شدید تر ہے۔ شاعر موت کے حوالے سے جس

لامحدودیت میں گم ہونا چاہتا ہے یا عدمیت کے مقابلے پر موجودیت سے روحانی اور مابعد الطبیعیاتی ناآہنگی کے تجربے سے جس طور پر دوچار ہوتا ہے۔ یہ چیز ایک ایسے متشکک ذہن پر دلالت کرتی ہے جو 'ہے' سے کسی طرح مطمئن نہیں ہے۔ شاد عدم کی لامحدودیت میں ضم ہونے کے درپے محض اس لیے ہیں کہ اس میں یک گونہ استقلال، محفوظ یکسوئی اور ایک عافیتِ ہمیش کا امکان مضمر ہے:

اس سرا میں کسی مہمان کی خاطر نہ ہوئی
شاد جی چاہے گا، آنے کو دوبارہ کس کا

عرش پر ہم ہوئے تو کیا، زیرِ زمیں ہوئے تو کیا
ہیں جو یہاں تو کیا ہیں ہم اور جو نہیں ہوئے تو کیا

ابد تلک اگر اس دہر کو بقا ہوتی
تو انتہا کو پہنچ کر پھر ابتدا ہوتی

اب بھی اک عمر پہ جینے کا نہ انداز آیا
زندگی چھوڑ دے پیچھا مرا میں باز آیا

یہ ہے شاد کی غزل کا وہ کردار جس کا ظاہر و باطن ایک ہے، جو سچا اور کھرا بھی ہے اور بےلاگ بھی۔ ان میں سے اکثر مضامین، ہماری روایتی غزل میں روزمرہ کا حکم رکھتے ہیں، لیکن شاد کے اپنے دیکھنے اور سوچنے کے رویے نے ان میں کسی نہ کسی نئی جہت کا اضافہ ضرور کیا ہے۔ شاد کے مضامینِ شعر میں ان اجزا کی بھی کمی نہیں ہے جو ان کے باطنی اضطراب کے مظہر ہیں۔ مابعد الطبیعیاتی نوعیت کے ایسے سوالات ان کی غزل میں بار بار وارد ہوتے ہیں جو 'ذہنِ آگاہ' کے لیے ہمیشہ باطنی کشمکش اور باطنی اضطراب کا باعث بنتے ہیں۔ اس قسم کے مضامین سے روایتی غزل بھی خالی نہیں ہے لیکن روایتی غزل کے مضامین اور شاد کی غزل کے مضامین میں یہ امتیاز ہے کہ روایتی غزل کے مضامین میں ذات اور تجربے کی اس آنچ کا سراغ نہیں ملتا جس کا احساس اپنی پہلی قرأت میں شاد کراتے ہیں۔ اس ضمن میں درج ذیل اشعار پر غور کرنے کی ضرورت ہے:

اسی سوچ میں ہوں پڑا ہوا کہ وجود کے ہیں حدود کیا
مجھے دل ملا بھی تو کیا ملا کہ یہیں سے خوش نہ وہیں سے خوش

پھر تو ادراک کسی چیز کا ممکن ہی نہیں
اپنے ہی علم سے بالا ہے دو عالم اپنا

سفر ضرور ہے اور عذر کی مجال نہیں
مزا تو یہ ہے نہ منزل نہ راستہ معلوم

نہ آرزو ہوئی پوری نہ کوئی کام ہوا
امید و بیم میں دن عمر کا تمام ہوا

جہاں میں ہر جگہ مسکن مرا ہے وہ مکیں ہوں میں
عجب اک گومگو کی جا ہے، ہوں اور پھر نہیں ہوں میں

کہاں سے آیا، کہاں ہے جانا، میں کون ہوں کس دیار میں ہوں
نہ بس میں غیروں کے ہوں نہ بےبس، نہ اپنے آپ اختیار میں ہوں

شاد کی غزل کی کل جمع پونجی یہی درویشانہ سادگی، تفکر آمیز اداسی اور ذہنی اور جذباتی کشاکش نہیں ہے۔

شاد نے اپنی غزل کو غالب اور داغ سے 'انداز جداگانہ اور فلسفہ، الہیات اور اخلاقی مضامین کو استعارے کی زبان میں ادا کرنے کے طریقے کو اپنی غزل کے خاص کردار سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن یہاں میں یہ ضرور اشارہ کرنا چاہوں گا کہ غزل میں جس internal frame breaking یا داخلی قالب شکنی کا تجربہ غالب کی غزل کے ذریعے عمل میں آیا تھا اس کی محض بعض رمقیں flashes ہی، سودا، درد اور ناسخ کے کلام میں کارفرما تھیں۔ غالب نے نسبتاً زیادہ صلابت آمیزی اور پراعتمادی کے ساتھ ان جذبوں کو ترجیح دی جو بلند کوش بھی تھے اور گہری فکر اور گہری سنجیدگی کے مظہر بھی تھے۔

تصویر کے اس دوسرے رخ پر غور کیے بغیر شاد فہمی کا حق ادا نہیں ہوسکتا جس نے معاملاتِ حسن و عشق کے شوخ رنگوں سے تشکیل پائی ہے۔ یہ وہ رخ ہے جو مومن سے زیادہ گہری اور جرأت سے تھوڑی کم رنگ آمیزی کا احساس دلاتا ہے۔ شاد نے حسن کی تمکنت آمیز خودنمائی اور عشوہ گری کو کئی ناموں سے یاد کیا ہے جو فتنہ خو، سنگدل اور آشوب جہاں ہی نہیں سرورِ کج کلہاں بھی ہے، خسروِ اقلیم جفا بھی ہے اور بانیِ مکر و دغا بھی۔ شاد کے محبوب میں نرم خوئی، دردمندی یا دلجوئی کا عنصر کم سے کم ہے۔ اگر ہم استعارتاً محبوب کو ان کے عہدِ پرآشوب سے تعبیر کریں تو پتہ چلے گا کہ یہ سارا عہد ہی جگہ جگہ سے کٹا پھٹا اور بےجوڑ سا ہے۔ جس میں ستم پیشگی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ مزے کی بات یہ کہ شاد نے بڑے لطف کے ساتھ اپنی زخم خوردگی اور حسن کی ناوک اندازی کو نت نئے رنگوں میں ڈھال کر پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ تکرار، تکرار نہیں معلوم ہوتی۔ کوئی ایک نیا لفظ، کوئی ایک نئی بندش کوئی ایک نیا پہلو اسے تکرارِ محض سے بچالیتا ہے۔ وہ ان تمام تجرباتِ حسن و عشق کو اکتسابی طور پر اخذ کرنے کے باوجود اپنے محسوسات کا حصہ بنا کر کچھ اس طور پر پیش کرتے ہیں کہ پور پور سے زندگی جھلکتی اور امڈتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شاد کی مشاہدۂ حق کی گفتگو والی غزلوں میں جس طرح باطن کی شدت در آئی ہے اور ماورائے حقیقت کا تجربہ ایک واردات کے طور پر محسوس ہوتا ہے اسی طرح معاملاتِ حسن و عشق والی غزلوں میں بھی جن جذبوں کو زبان دی گئی ہے۔ وہ شاد کی جمال پرستی اور طبیعت کے چلبلے پن کے مظہر ہونے کے علاوہ واقعیت کا احساس دلاتے ہیں۔ پہلے رنگ کی غزل کی دنیا سے بالکل جدا، جس کی لفظیات الگ، ردیفوں کی تراکیب الگ، بندشیں الگ۔ شاد کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے دوسرے، بہت سے شعرا کی طرح ایک ہی غزل میں دونوں رنگ کے شعروں کو خلط ملط کرنے کی کوشش نہیں کی اور نہ ان غزلوں میں کوئی ایک رنگ دوسرے پر سبقت رکھتا ہے۔

اپنے استدلال کی تصدیق کے لیے دوسرے رنگ کی غزل کے چند اشعار حاضر ہیں:

دل پہ نگہ کا زخم ہے کاری ہو چکا جینا اب نہ جئیں گے
سینے پہ برچھی تان کے ماری ہو چکا جینا اب نہ جئیں گے

اپنی ادا سے آپ کھٹکنا، اپنی ہوا سے آپ جھجکنا
چال میں لغزش، منہ پہ حیائیں اف رے جوانی ہائے زمانہ

دو ان کی ہتھیلی پر تھے نشاں، اک خوں کا مرے، اک قبضے کا
افسوس! کیا کیا تو نے حنا، یہ بھی نہ رہا وہ بھی نہ رہا

وہ نرمی، کج روشی، کج کلہی، کینہ وری، دلبری، عشوہ گری
کون عشق کھا کے گرا کون ہوا پھر کے پھر دیکھا نہ ذرا

اٹھتی جوانی، عضو مناسب سانولی رنگت ہائے ستم
آنکھیں رسیلی، باتیں بھولی، چال قیامت ہائے ستم

چست کمر کا کیا سبب، تنگ قبا کی وجہ کیا
ہم تو ہیں آپ سر بکف ہم سے ادا کی وجہ کیا

■

Prof. Ateequllah, Basera Apts. Johari Farm, Jamia Nagar, New Delhi - 110025

▪ شاد عظیم آبادی

انتخابِ کلام شاد عظیم آبادی

غزلیات

✪

کیوں اے فلک جو ہم سے جوانی جدا ہوئی
اِک خود بخود جو دل میں خوشی تھی وہ کیا ہوئی

گستاخ بلبلوں سے بھی بڑھ کر صبا ہوئی
کچھ جھک کر گوشِ گل میں کہا اور ہوا ہوئی

مایوس دل نے ایک نہ مانی امید کی
کہہ سن کے یہ غریب بھی حق سے ادا ہوئی

دنیا کی فکر ، موت کا ڈر، آبرو کا دھیان
دو دن کی زندگی مرے حق میں بلا ہوئی

موتی تمہارے کان کے تھرّا رہے ہیں کیوں
فریاد کس غریب کی گوش آشنا ہوئی

برسا جو ابرِ رحمتِ خالق بروزِ حشر
سبزہ کی طرح پھر ہری نشو و نما ہوئی

بیماریوں سے چھٹ گئے اے شاد حشر تک
قربان اس علاج کے، اچھی دوا ہوئی

✪

ایک ستم اور لاکھ ادائیں، اف ری جوانی ہائے زمانے
ترچھی نگاہیں، تنگ قبائیں، اف ری جوانی ہائے زمانے

ہجر میں اپنا اور ہی عالم ، ابرِ بہاراں، دیدۂ پر نم
ضد کہ ہمیں وہ آپ بلائیں، اف ری جوانی ہائے زمانے

اپنی ادا سے آپ جھجکنا، اپنی ہوا سے آپ کھٹکنا
چال میں لغزش، منہ میں حیائیں، اف ری جوانی ہائے زمانے

ہاتھ میں آڑی تیغ پکڑنا تاکہ لگے بھی زخم تو اوچھا
قصد کہ پھر جی بھر کے ستائیں، اف ری جوانی ہائے زمانے

کالی گھٹائیں، باغ میں جھولے، دھانی دوپٹے، لٹ جھٹکائے
مجھ پہ یہ قدغن آپ نہ آئیں، اف ری جوانی ہائے زمانے

پچھلے پہر اٹھ اٹھ کے نمازیں، ناک رگڑنی، سجدوں پہ سجدے
جو نہیں جائز، اس کی دعائیں، اف ری جوانی ہائے زمانے

شاد! نہ وہ دیدار پرستی اور نہ وہ بے نشہ کی مستی
تجھ کو کہاں سے ڈھونڈ کے لائیں، اف ری جوانی ہائے زمانے

✪

کالی کالی آنکھیں ہیں، گوری گوری رنگت ہے
لمبے لمبے گیسو ہیں، اور بھولی بھالی صورت ہے

آڑی آڑی چتون ہے اور ٹیڑھے ٹیڑھے ابرو ہیں
نیچی نیچی نظریں ہیں اور کچھ کچھ دل میں الفت ہے

رہ رہ کر گھبراتا ہے دل شام سے اُمڈا آتا ہے
تازہ تازہ عشق ہوا ہے دھیمی دھیمی وحشت ہے

حسن کی خوبی جو کچھ کہیے عیب چھپانا ہے ورنہ
جھوٹے جھوٹے وعدوں میں کچھ ایسی ویسی ذلت ہے

✪

یہ رات بھیانک ہجر کی ہے کاٹیں گے بڑے آلام سے ہم
ٹلنے کی نہیں یہ کالی بلا، سمجھے ہی ہوئے تھے شام سے ہم

جب قیس پہاڑ اس سر سے ٹلے، عید آئی تب آئی جان میں جان
تا دیر عجب عالم میں رہے، ہونٹوں کو ملائے جام سے ہم

تھا موت کا کھٹکا جاں فرسا، صد شکر کہ نکلا وہ کانٹا
گر ہو نہ قیامت کا دھڑکا اب تو ہیں بڑے آرام سے ہم

تا منزل جاناں ساتھ رہا، کم بخت تصور غیروں کا
شوق اپنے قدم کھینچا ہی کیا، پلٹا ہی کیے ہر گام سے ہم

الفت نے انھیں کی حق کی طرف پھیرا مرے دل کو شکر خدا
تعمیر کریں مسجد کوئی، کیوں کرنہ بتاں کے نام سے ہم

اے ہم نفسو دم لینے دو، بھولے ہوئے نغمے یاد آلیں
آئے ہیں چمن میں اڑ کے ابھی چھوٹے ہیں اسی دم، دام سے ہم

باتوں میں گزرتے ہجر کے دن، اے کاش کہ دونوں مل جاتے
ہم سے ہے دل ناکام خفا، آزردہ دلِ ناکام سے ہم

یوں ان کے ادب یا خاطر سے، ہر بات کو لے لیں اپنے سر
جب دل ہے انھیں کے قابو میں، پھر پاک ہیں ہر الزام سے ہم

وہ سمجھے کہ ہم نے مار لیا، ہم سمجھے ملیں گے آخر وہ
ملتے ہی نگہ کے دونوں خوش، آغاز سے وہ انجام سے ہم

دنیا میں تخلص کوئی نہ تھا، کیا نیل کا ٹیکا شاد ہی تھا
تم وجہ نہ پوچھو کچھ اس کی چڑ جاتے ہیں کیوں اس نام سے ہم

✪

اے شبِ غم ہم ہیں اور باتیں دلِ ناکام سے
سوتے ہیں نامِ خدا، سب اپنے گھر آرام سے

جاگنے والوں پہ کیا گزری وہ جانیں کیا بھلا
سو رہے ہیں جا کے بستر پر جو اپنے شام سے

جیتے جی ہم تو غمِ فردی کی دُھن میں مر گئے
کچھ وہی اچھے ہیں جو واقف نہیں انجام سے

نالہ کرنے کے لیے بھی طبعِ خوش درکار ہے
کیا بتاؤں دل ہٹا جاتا ہے کیوں اس کام سے

دیکھتے ہو میکدے میں مے کشو ساقی بغیر
کس غضب کی بے کسی پیدا ہے شکلِ جام سے

رات دن پیتے ہیں بھر بھر کر مئے عشرت کے جام
کچھ وہی اچھے ہیں نا واقف ہیں جو انجام سے

اسم کو اپنے مسمی سے ہے لازم کچھ لگاؤ
شاد آخر کس طرح خوش ہوں میں اپنے نام سے

✪

تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں
کھلونے دے کر بہلایا گیا ہوں

دل مضطر سے پوچھ اے رونق بزم
میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں

لحد میں کیوں نہ جاؤں منہ چھپائے
بھری محفل سے اٹھوایا گیا ہوں

ہوں اس کوچے کے ہر ذرے سے آگاہ
ادھر سے مدتوں آیا گیا ہوں

سویرا ہے بہت اے شور محشر
ابھی بے کار اٹھوایا گیا ہوں

قدم اٹھتے نہیں کیوں جانب دیر
کسی مسجد میں بہکایا گیا ہوں

کجا میں اور کجا اے شاد دنیا
کہاں سے کس جگہ لایا گیا ہوں

کب سے پکارتا ہوں جوانی کدھر گئی
کیا زندگی کی راہ میں کمبخت مر گئی

ناحق ہے دل کو صبح شبِ غم کا انتظار
تھوڑی سی اب ہے رات بہت کچھ گذر گئی

عمر رواں کی تیز روی کا بیان کیا
اک برق کوند کر ادھر آئی اُدھر گئی

اس سے تو تھا مرے لیے بہتر کہیں عدم
دو دن کی زندگی مجھے بدنام کر گئی

اے شاد کیا کہوں تری شیریں بیانیاں
جو بات تو نے کی مرے دل میں اتر گئی

مصیبت جس سے زائل ہو، وہی سامان کر دے گا
نہ گھبرانا، خدا سب مشکلیں آسان کر دے گا

خوشی سے مشکلوں کا سامنا کر، منہ نہ پھیرا دل
ترے عقدوں کا حل، ترا یہی اوسان کر دے گا

بشر پر منحصر کیا، تذکرہ اس کا تو ہے ناحق
یہ عشقِ ذوفنوں، حیواں کو بھی انسان کر دے گا

تری روپوشیاں اے حسن کب بیکار جائیں گی
یہی پردہ عیاں عالم میں تیری شان کر دے گا

دلا گھبرا رہا ہے کیوں، غنیمت ہے کہ عشق آیا
ترے اے میزباں، سب کام یہ مہمان کر دے گا

کوئی گر سلطنت بھی دے تجھے ہرگز نہ لے اے دل
سبک ہر طرح تجھ کو غیر کا احسان کر دے گا

یقیں کر لے کہ خود وہ جلوہ گر پردے میں ہیں ورنہ
یہ ہی ظالم گماں تیرا تجھے حیران کر دے گا

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں، ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے، جس کی حسرت و غم، اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم

میں حیرت و حسرت کا مارا خاموش کھڑا ہوں ساحل پر
دریائے محبت کہتا ہے، آ کچھ بھی نہیں پایاب ہیں ہم

اے دردِ محبت تو ہی بتا، اب تک یہ معمہ حل نہ ہوا
ہم میں ہے دل بیتاب نہاں، یا آپ دلِ بیتاب ہیں ہم

لاکھوں ہی مسافر چلتے ہیں منزل پہ پہنچتے ہیں دو ایک
اے اہلِ زمانہ قدر کرو، نایاب نہ ہوں، کم یاب ہیں ہم

مرغانِ قفس کو پھولوں نے اے شاد یہ کہلا بھیجا ہے
آ جاؤ جو تم کو آنا ہے ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم

دو شعر

نگہ کی برچھیاں جو سہ سکے سینہ اسی کا ہے
ہمارا آپ کا جینا نہیں جینا اسی کا ہے

یہ بزم مئے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

رباعیات

روشن ہے کہ شادِ سخن آرا میں ہوں
سمجھو نہ مجھے غر تمہارا میں ہوں
مغرب میں شعاع بڑھ کے پہنچے گی ضرور
مشرق کا چمکتا ہوا تارا میں ہوں

تعریف بتاؤں شعر کی کیا کیا ہے
نغموں کی صداقت اس سے خود پیدا ہے
اصلیتِ حال جس سے مخفی رہ جائے
ہشیار کہ وہ شعر نہیں دھوکا ہے

ہادی ہوں میں کام ہے ہدایت میرا
دم بھرتے ہیں ارباب بلاغت میرا
میں شہر میں رہتا ہوں سند ہیں میرے شعر
منہ چومتی ہے آب فصاحت میرا

مضموں میرے دل میں بے طلب آتے ہیں
قدسی طبق نور میں دبے جاتے ہیں
کچھ اور نہیں علم مجھے اس کے سوا
کہتا ہوں وہی جو مجھ سے کہلواتے ہیں

اُستاد تھے اس فن کے انیس اور دبیر
جن کا نہیں آج تک زمانے میں نظیر
کیا میری سمجھ شاد پھر انساں ہوں میں
جنت میں ملک کرتے ہیں ان کی توقیر

ہر حال میں آبروئے فن لازم ہے
تقلیدِ فصیحانِ وطن لازم ہے
دریوزہ گری ہے عیب سن لیں احباب
آپ اپنی زبان میں سخن لازم ہے

جس وقت کا ڈر تھا وہ شباب آ پہنچا
ہنگامہ رحیل و پا تراب آ پہنچا
جاگو جاگو حشر تک سونا ہے
چونکو چونکو کہ وقت خواب آ پہنچا

بگڑے ہوئے اس دور کے سب کج دھج ہیں
اعمیٰ ہیں اصم ہیں الکن و اعرج ہیں
نقطے سے محیط تک زاویہ کاواک
پرکار غلط ہے دائرے بھی کج ہیں

چالاک ہیں سب کے سب بڑھتے جاتے ہیں
افلاک ترقی پہ چڑھتے جاتے ہیں
مکتب بدلا کتاب بدلی لیکن
ہم ایک وہی سبق پڑھتے جاتے ہیں

بدلے نہ صداقت کا نشان ایک رہے
ہر حال میں پنہاں و نہاں ایک رہے
انساں ہے وہی جو اس دورنگی سے بچے
لازم ہے کہ دل اور زباں ایک رہے

بحوالہ انتخاب شاد عظیم آبادی وکلیات شاد علی شاد عظیم آبادی

نوشاد منظر

رسالہ 'شاہراہ' کے اداریے

رسائل ذرائع ابلاغ کا نہ صرف ایک اہم وسیلہ ہیں بلکہ کسی عہد کی علمی، تہذیبی اور سماجی صورت حال کے آئینہ دار بھی ہوتے ہیں۔ رسالے کے مزاج کو جاننے کا سب سے اہم وسیلہ اس کا اداریہ ہوتا ہے۔ اداریے سے ہی ہم اس نتیجے پر بھی پہنچتے ہیں کہ رسالے کا مقصد کیا ہے۔ بعض ایسے رسالے بھی ہیں جن کے اداریے کا تعلق مشمولات سے نہیں ہوتا۔ مگر ایسے رسالوں کی تعداد زیادہ ہے جن کے اداریوں سے رسالے کے مزاج اور رفتار کا اندازہ ہوتا ہے۔ شاہراہ کے ابتدائی شمارے میں 'ترقی پسند مصنفین کا ترجمان' درج ہوتا تھا اس لحاظ سے یہ فیصلہ کرنا بہت آسان ہو جاتا ہے کہ 'شاہراہ' ترقی پسندوں کا رسالہ ہے، مگر کسی فیصلے پر پہنچنے سے قبل یہ ضروری ہے کہ شاہراہ کے اداریے پر ایک تنقیدی نظر ڈالی جائے تا کہ اس رسالے کی نوعیت کا صحیح اندازہ کیا جا سکے۔ شاہراہ کے تقریباً سو شمارے شائع ہوئے۔

ترقی پسند ادبی تحریک کی ابتدا 1936 میں ہوئی۔ اس تحریک نے ادب کی تمام اصناف کو متاثر کیا۔ یہ موضوع ایک طویل گفتگو کا متقاضی ہے۔ اس سلسلے میں خلیل الرحمٰن اعظمی کی کتاب 'اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک' ایک مستقل حوالے کی حیثیت رکھتی ہے۔ تمام اہم ادیبوں اور شاعروں نے ترقی پسند تحریک کی خدمات کو کسی نہ کسی طور پر سراہا ہے، لیکن بعض نے یہ بھی شکایت کی ہے کہ اس نے ادبی تقاضوں کو فراموش کر دیا ہے۔ ایک قاری کے طور پر اگر ہمیں ترقی پسند ادب میں ادبی معیار کی کمی کا احساس ہوتا ہے تو اسے بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اس تحریک کا مقصد صرف ادب

> شاہراہ کی اشاعت جس وقت عمل میں آئی ترقی پسند تحریک کے قیام کو تقریباً تیرہ سال ہوچکے تھے اور اس تحریک نے قابل ذکر کام کرلیا تھا۔ فیض، مجاز سلام مچھلی شہری، علی سردار جعفری، معین احسن جذبی، اختر انصاری، کیف اعظمی، جانثار اختر، ساحر لدھیانوی، مجروح سلطان پوری، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی اور احمد ندیم قاسمی وغیرہ کی تخلیقات اس بات کی گواہ ہیں۔

تخلیق کرنا نہیں تھا بلکہ اس کے کچھ سیاسی اور سماجی مسائل بھی تھے۔ اور ان سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی تھی۔

ترقی پسند ادبی تحریک کی حمایت میں کئی رسالے منظر عام پر آئے جن میں نیا ادب، ادب لطیف، نقوش، سنگ میل، سویرا، جاوید اور شاہراہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان رسالوں نے وقت کے اہم تقاضوں کا خیال رکھا اور ان تمام ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی جو ادب کے تقاضوں اور زندگی کی بدلتی ہوئی قدروں نے ان پر عائد کی تھیں۔ بلا شبہ یہ رسالہ ترقی پسندوں کا ترجمان تھا اور اس نے اس بات سے کبھی انکار بھی نہیں کیا بلکہ شاہراہ کے ابتدائی شمارے کے سرورق پر جلی حرفوں میں 'ترقی پسندوں کا دوماہی ترجمان درج ہوتا تھا'، یہ اور بات ہے کہ بعد میں شاہراہ دوماہی کی جگہ ماہنامہ بن گیا اور اس کے سرورق سے ترقی پسندوں کا ترجمان کا فقرہ ہٹا لیا گیا۔

شاہراہ کی اشاعت جس وقت عمل میں آئی ترقی پسند تحریک کے قیام کو تقریباً تیرہ سال ہو چکے تھے اور اس تحریک نے قابل ذکر کام کر لیا تھا۔ فیض، مجاز سلام مچھلی شہری، علی سردار جعفری، معین احسن جذبی، اختر انصاری، کیف اعظمی، جانثار اختر، ساحر لدھیانوی، مجروح سلطان پوری، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی اور احمد ندیم قاسمی وغیرہ کی تخلیقات اس بات کی گواہ ہیں۔

شاہراہ کا پہلا شمارہ جنوری 1949 میں ساحر لدھیانوی کی ادارت میں مکتبہ شاہراہ، نئی دہلی کے ذریعے منظر عام پر آیا۔ اس شمارے میں میراجی، مجروح سلطان پوری خواجہ احمد عباس، اوپندر ناتھ اشک، دیوندر ستیارتھی مہندر ناتھ، کرشن چندر اور عصمت چغتائی وغیرہ کی تخلیقات شائع ہوئیں۔

ساحر لدھیانوی نے اپنے اداریے 'راہ نما' میں شاہراہ کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے اس

رسالے کوترقی پسند ادبی رجحان کوفروغ دینے والا بتایا۔ بقول ساحر:

''ہمارے اغراض و مقاصد وہی ہیں جس کا اعادہ انجمن ترقی پسند مصنفین بار بار کرچکی ہے۔ ہم اپنے تمام ساتھیوں کوسلام کرتے ہیں جنھیں ہماری تحریک کی بارہ سالہ زندگی میں ظلم اور تشدد کا شکار ہونا پڑا... شاہراہ ان کا ترجمان ہے اور یقین دلاتا ہے کہ وہ ہر حالت میں اپنے آپ کوان سے وابستہ رکھے گا''

(اداریہ:'راہ نما': ساحرلدھیانوی، جنوری 1949)

ساحرلدھیانوی نے جن مقاصد کی طرف اشارہ کیا ہے اس کی حصولیابی کے لیے شاہراہ آخرتک کوشاں رہا۔ ساحر کے علاوہ شاہراہ کی ادارت کی ذمہ داری سرلا دیوی، مخمور جالندھری، پرکاش پنڈت، فکر تونسوی، وامق جونپوری، ظ انصاری اور محمد یوسف وغیرہ نے بھی سنبھالی۔ ساحر نے حکومت کی اس غلط پالیسی پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ ایک طرف حکومت یہ کہتی ہے کہ ہرطرح کی آزادی کا حق حاصل ہے دوسری جانب پابندی بھی عائد کی۔ ساحر لکھتے ہیں:

''پنڈت جواہر لال نہرو اپنی تقریر میں بار بار دہراتے ہیں کہ انھوں نے اپنے ملک میں ہرنوع ہرقسم کے خیالات ونظریات کی ہر امن تبلیغ اشاعت کا حق دے رکھا ہے اگر یہ صحیح ہے تو حکومت ان متشدد اقدامات کی وضاحت کیوں نہیں کرتی جن کے بنا پر متذکرہ بالا (سردار جعفری، کیفی اعظمی، اور نیاز حیدر وغیرہ) ادیب اور فنکار گرفتار کیے گئے ہیں اگر مہاتما گاندھی کے قاتلوں کو یہ حق دیا جاسکتا ہے کہ وہ کھلی عدالت میں مقدمہ لڑسکیں تو شاعروں اور ادیبوں کو جو ملک وقوم کے ضمیر کا درجہ رکھتے ہیں یہ حق کیوں نہیں دیا جاتا''

(راہ نما، اداریہ، ساحرلدھیانوی، مارچ اپریل 1949)

ساحر لدھیانوی نے اداریے میں ادیبوں اور فنکاروں پرڈھائے جانے والے مظالم کے خلاف اس وقت آواز بلند کی جب حکومت کے خلاف کچھ بولنا آسان نہیں تھا۔ مگر ساحرلدھیانوی نے بہت بے باکی کے ساتھ ان طاقتوں کی گرفت کی جن سے فرقہ پرستی کوتقویت مل رہی تھی۔ ان حالات میں حکومت شاعر وادیب پر کیوں اور کیسے پابندی لگا سکتی ہے...؟

حکومت وقت نے ان ادیبوں پر جتنی پابندی لگائی ان فنکاروں کے جوش میں اضافہ ہی ہوا۔ 2 نومبر 1948 کو احمد آباد میں خطبہ صدارت پڑھتے ہوئے کرشن چندر ترقی پسند ادب کی حمایت کی اور ان ادیبوں کی حوصلہ افزائی کی جن کے یہاں اقدار آدم کا احترام ہے:

''ترقی پسند ادیب کے ہر منزل ہر انسان کی نئی زندگی کا ساتھ دیا ہے اس نے سقراط بن کر زہر کا پیالہ پیا۔ بائرن بنکر دیس سے جلاوطنی قبول کی ہے اور رالف فاکس اور لورکا بن کر موت کے گھات اترا ہے۔ وہ گورکی بن کر گاؤں گاؤں گھوما ہے۔ اراگاں اور پبلونیرودا بن کرعوام کے گوریلا دستوں میں کام کرتا رہا ہے اور آج بھی ہر جگہ جہاں جہاں جتنا اپنی نئی زندگی، نئی روحانیت، نئی اخلاق کے لیے لڑرہی ہے۔ وہ لہو کی روشنائی سے ادب کی لافانی کتاب لکھ رہا ہے''۔

کرشن چندر مزید کہتے ہیں کہ:

''اور جب بھی آپ دیکھیں کہ سردار جعفری اور ساحرلدھیانوی اور کیفی اعظمی کو جیل کی سلاخوں کے اندر بند کردیا گیا ہے۔ جب آپ یہ سنیں کہ راجندر سنگھ بیدی

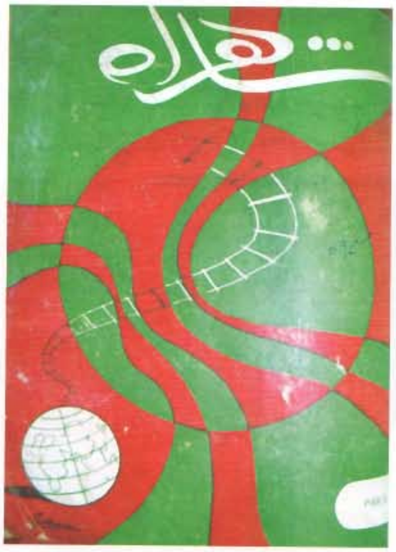

اور عصمت چغتائی کے افسانوں پر پابندی لگادی گئی ہیں ،جب آپ کومعلوم ہو کہ ساغر نظامی اور نیاز حیدر کے گیتوں کے گلے میں پھانسی کی رسی لٹکادی گئی ہے تو سمجھ لیجئے کہ ترقی پسند ادیب اپنا فرض پورا کررہا ہے اور ہم آپ سے اقرار کرتے ہیں اور ہم قسم کھاتے ہیں کہ ہم اپنے فرض کوضرور پورا کریں گے''۔

ان ناسازگار حالت میں شاہراہ کا منظر عام پر آنا اور ناانصافی کے خلاف آواز بلند کرنا کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ مدیران شاہراہ نے وقتاً وقتاً اس بات کا ذکر بھی کیا ہے کہ شاہراہ اور اس سے وابستہ حضرات نے ہمیشہ انصاف کی بات کی اور ظلم کے خلاف آواز بلند کیا محمد یوسف جامعی ایک اداریے میں لکھتے ہیں:

''شاہراہ نے اس دور میں جب حق یا انصاف کی۔ آواز اٹھانا، آندھی میں چراغ جلانے کے مترادف تھا۔ انتہائی بے باکی اور جرأت کے ساتھ رجعت پسند اور غیرصحت مند اور معیاری ادب کی ترویج واشاعت کے اہم ترین کام کو ملک کے طول وعرض میں پھیلانے اور حق وصداقت کی آواز کو ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک لے جانے میں اس نے کبھی کوتاہی نہیں کی۔''

(محمد یوسف جنوری 1959)

سوال یہ ہے کہ محمد یوسف کے نزدیک 'غیر صحتمند' اور 'معیاری ادب' میں کیا فرق ہے؟ دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ محمد یوسف نے جس معیاری ادب کی بات کی ہے وہ کیا ہے؟ رجعت پسند اور غیر صحت مند ادب سے مراد کیا ہے؟ وہ جسے رجعت پسند اور غیر صحت مند ادب کہتے ہیں اس میں بھی زندگی کا کوئی روشن پہلو ہوسکتا ہے، اور جہاں تک معیاری ادب کا تعلق ہے تو معیاری ادب کا پیمانہ صرف عصری حسیّت کو نہیں بنایا جاسکتا۔ معیاری ادب کے بارے میں ایک تصور ہر زمانے میں رہا ہے جسے ہم آفاقی کہہ سکتے ہیں۔ ترقی پسندی کے اس دور میں عام طور پر کلاسیکی سرمائے کے تعلق سے ایک بے اطمینانی تھی جس کی وجہ اس وقت کے سیاسی وسماجی حالات تھے۔ محمد یوسف کا مذکورہ اداریہ ترقی پسند نظریے کی انتہا پسند صورت کو پیش کرتا ہے۔

شاہراہ کے اداریے میں عموماً ان مسائل پر گفتگو ہوتی تھی جس کا تعلق براہ راست ہماری زندگی سے ہے۔ ہمارا سماج دومختلف نظریات میں منقسم تھا مارکسی اور غیر مارکسی۔ شاہراہ چونکہ ترقی پسندوں کا رسالہ تھا لہٰذا اس کا جھکاؤ ترقی پسندی اور مارکسی نظریے کی طرف زیادہ تھا۔

ترقی پسندوں کا سماج کے تئیں جو رویہ تھا وہ بہت واضح ہے، سرمایہ دارانہ نظام جسے ترقی پسند ظلم وجبر اور سماج کو طبقوں میں تقسیم کرنے والا بتاتے ہیں۔ مدیران شاہراہ نے اس سرمایہ دارانہ نظام اور معاشی نظام کے خلاف اپنے اداریے میں گفتگو کی ہے۔ شاہراہ کے شمارہ مئی 1959 کو دیکھیے جس میں یوسف جامعی نے اردو کی زبوں حالی اور سرکار کی بے رخی پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔

''گذشتہ پانچ سالوں میں حکومت نے جو کچھ اردو کے ساتھ کیا ہے وہ اس کی اردو سے بے اعتنائی اور تغافل شعاری پر دلالت نہیں کرتا بلکہ اس کا ثبوت پیش کرتا ہے

کہ حکومت اردو کے ساتھ ضرورت سے زیادہ مہربان ہے۔ لیکن ہمیں کہنے دیجیے کہ صرف امدادی رقم منظور کرنے سے اردو کا مسئلہ حل نہیں ہوتا، ہمیں بتایا گیا ہے کہ ان اداروں نے جن کو یہ امدادی رقم پیش کی گئی ہیں، اس روپیہ کو کتابوں کی تالیف وتصنیف اور ان کی اشاعت پر صرف کیا ہے۔ قدرتاً یہ سوال اٹھ جاتا ہے کہ کتابوں کی اشاعت کے ساتھ کیا یہ ضروری بات نہیں ہے کہ کتابوں کے پڑھنے والے بھی موجود ہوں۔ اگر پڑھنے والے نہیں ہیں تو کتابوں کی اشاعت سے کوئی فائدہ نہیں، کتابیں عجائب گھر یا نمائش گاہوں میں سجانے کے لیے نہیں پڑھنے والوں کے لیے ہوتی ہے اور ہم یہ سوال اٹھانے میں حق بجانب ہیں کہ حکومت نے ان گزشتہ پانچ سالوں میں اردو پڑھنے والوں کا نیا طبقہ وجود میں آیا ہے؟ کیا اردو کو اس کی قانونی اور ضروری حیثیت دی جا چکی ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو امدادی رقوم اوران مہربانیوں کا کیا فائدہ''

(یوسف جامعی، اس انجمن گل میں اداریے، مئی1959)

طوالت کے سبب پورا اقتباس پیش نہیں کیا گیا۔ مگر مندرجہ بالا جملوں سے اصل مسئلے کی جانب اشارہ مل جاتا ہے بہر کیف حکومت کی غلط پالیسی اور اردو کے ساتھ بے اعتنائی اختیار کرنے سے اردو کا بہت نقصان ہوا، خود اردو والوں کا رویہ بھی اچھا نہیں تھا، اول حکومت اردو کے لیے کوئی مالی امداد دینا نہیں چاہتی تھی اور اگر کسی طرح حکومت کی جانب سے کچھ امدادی رقم ملتی بھی تو اسے کتابوں کی اشاعت پر صرف کر دیا جاتا تھا۔

شاہراہ بنیادی طور پر ترقی پسندوں کا ترجمان تھا۔ لہٰذا فکری اور تنظیمی سطح پر ترقی پسند ادبی تحریک میں جو نشیب و فراز آتے اس کا اثر شاہراہ کے اداریوں پر بھی ہوا۔ ترقی پسند تحریک کے ابتدائی پندرہ سولہ برس بہت شاندار اور حوصلہ افزا تھے مگر اس کے بعد تحریک انتشار، بدنظمی اور انحطاط کی کیفیت سے دوچار ہو کے اپنے مقاصد سے بھٹک گئی۔

'شاہراہ' نے اپنے ابتدائی شماروں سے ہی ترقی پسند تحریک کو منظم کرنے پر زور دیا اور ان مقاصد کی ترویج اشاعت پر زور دیا جو ترقی پسندوں کا مقصد خاص تھا۔ لہٰذا ساحر لدھیانوی سے محمد یوسف تک تمام مدیروں نے ان مضامین کو رسالے میں جگہ دی جن سے ترقی پسند تحریک کو ایک نئی سمت مل سکتی تھی مگر کسی ایک نظریے کی پابندی اور اس کی حمایت کرنے میں عموماً شدت آجاتی ہے، اس کے نتیجے میں ایسا ادب تخلیق پاتا ہے جس کی ادبیت ہی مشکوک ہوجاتی ہے۔ شاہراہ کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا، ترقی

پسند ادب کے نام پر بہت سی ایسی چیزیں شائع ہوئیں جن نے ترقی پسند ادبی نظریے کو نقصان تو پہنچایا ہی ساتھ ہی شاہراہ کے ادبی معیار پر ہی سوالیہ نشان لگ گیا۔ مگر مدیران شاہراہ کو اس کا احساس بہت جلد ہوگیا اور انھوں نے اس بات کا اظہار بھی کیا، مارچ اپریل 1953 کا شمارہ جو کانفرنس نمبر بھی تھا میں محمد یوسف نے شاہراہ کے معیار کو برقرار رکھنے پر زور دیتے ہوئے لکھا تھا کہ شاہراہ

'شاھراہ' نے اپنے ابتدائی شماروں سے ھی ترقی پسند تحریک کو منظم کرنے پر زور دیا اور ان مقاصد کی ترویج اشاعت پر زور دیا جو ترقی پسند وں کا مقصد خاص تھا۔ لھٰذا ساحر لدھیانوی سے محمد یوسف تک تمام مدیروں نے ان مضامین کو رسالے میں جگہ دی جن سے ترقی پسند تحریک کو ایک نئی سمت مل سکتی تھی مگر کسی ایک نظریے کی پابندی اور اس کی حمایت کرنے میں عموماً شدت آجاتی ھے، اس کے نتیجے میں ایسا ادب تخلیق پاتاھے جس کی ادبیت ھی مشکوک ھوجاتی ھے۔ شاھراہ کے ساتھ بھی کچھ ایسا ھی ھوا، ترقی پسند ادب کے نام پر بھت سی ایسی چیزیں شائع ھوئیں جن نے ترقی پسند ادبی نظریے کو نقصان تو پھنچایا ھی ساتھ ھی شاھراہ کے ادبی معیار پر ھی سوالیہ نشان لگ گیا۔ مگر مدیران شاھراہ کو اس کا احساس بھت جلد ھوگیا اور انھوں نے اس بات کا اظھار بھی کیا

نے ہمیشہ ادب میں صحت مند رجحانات کی آئینہ داری کی ہے اور ترقی پسندوں کا ساتھ دیا اور اپنے معیار کو برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی ہے مگر اب شاہراہ کا معیار مشکوک ہوگیا ہے اور اس بارے میں مسلسل شکایتیں مل رہی ہیں۔ محمد یوسف لکھتے ہیں:

''شاہراہ کسی فرد یا گروہ کی میراث نہیں اور پھر یہ جس نظریے کا حامل ہے تو تنقید اور خود احتسابی اس کا سب سے بڑا حسن ہے۔''

(بات کہنے کی نہیں، اداریہ محمد یوسف، مارچ اپریل1953)

اس اقتباس سے دو سوالات ذہن میں آتے ہیں اول یہ کہ اگر شاہراہ کسی گروہ کی میراث نہیں تو پھر کسی خاص نظریے کی حمایت کرنے کا کیا مطلب؟ اور دوم محمد یوسف کا یہ کہنا کہ شاہراہ کسی فرد یا گروہ کی میراث نہیں ایسا تو نہیں کہ محمد یوسف شاہراہ پر لگے ترقی پسند رسالے کا لیبل ہٹانا چاہتے تھے؟ یہ سوال اس لیے بھی اہم ہے کیونکہ شاہراہ کے ابتدائی شماروں کو دیکھا جائے تو اس کے سرورق پر 'ترقی پسندوں کا دوماہی ترجمان' درج ہوتا تھا مگر بعد میں یہ فقرہ غائب ہوگیا اور یہاں محمد یوسف کا یہ کہنا کہ شاہراہ کسی گروہ کی میراث نہیں، بدلے ہوئے ذہن کا پتہ دیتا ہے کیونکہ یہ محض اتفاق نہیں کہ پچاس کی دہائی میں ترقی پسند تحریک کو ختم کر دینے کی بات بھی زور شور سے ہو رہی تھی۔ وجہ جو بھی رہی ہو مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ شاہراہ کے معیار کو بلند کرنے کی پوری کوشش کی گئی۔

میں نے اپنے اس مضمون میں شاہراہ کے چند اداریے پر گفتگو کی ہے کیونکہ بعض اداریے بہت سرسری ہیں جس میں مشمولات کا ذکر بھر کیا گیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جہاں تک ادبی رسالے کے معیار کا تعلق ہے تو محض مدیر کے کچھ کرنے سے معیار بلند نہیں ہوسکتا بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ مضمون نگار شاعر اور تنقید نگار بھی اپنی تخلیق کے معیار کو بلند کریں۔ ایک معیاری پرچے کو باقاعدگی کے ساتھ وقت پر شائع کرنا مشکل کام ہے۔ شاہراہ کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا مالی تنگی اور معیاری مضامین کے فقدان نے شاہراہ کی رفتار کو سست کر دیا عمر بڑھنے نہ دی اور 1960 کے آخر میں ذمہ داران شاہراہ نے اس کو بند کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

□

Naushad Manzar, Research Scholar, Jamia Millia Islamia, New Delhi - 110025

مصنف: دیویندر اسر مترجم: شاہد پرویز

ادب، اقدار اور پاپولر کلچر

کسی صبح ہم اٹھیں اور خبر ملے کہ ہومر، کالی داس، فردوسی، شیکسپیئر، غالب، پرساد کے شاہکار کسی زلزلے یا آگ سے فنا ہوگئے ہیں تو شاید چند سنکی لوگوں کے سوا کسی کو غم نہ ہوگا کہ کوئی حادثہ ہوگیا ہے۔ اخباروں میں زلزلے اور آگ اور کسی لیڈر کے دورے اور تقریر اور غم کے اظہار کی خبر ضرور چھپ جائے گی۔ ادب کی ضرورت کسی کو بھی نہیں۔ دھوبی، نائی، کسان، انجینئر، سرکاری ملازم، فوجی، سپاہی، ڈاکٹر، رکشاوالے، مل مزدور، سیاست داں، کسی کے لیے میگھ دوتر، ہیملیٹ، شاہنامہ، اوڈیسی، دیوانِ غالب یا کامائنی کی ضرورت نہیں، سب لوگ اپنے اپنے شعبوں میں ان کے بغیر کام کرسکتے ہیں۔ کاروبار میں کامیاب ہوسکتے ہیں اور آرام دہ زندگی بسر کرسکتے ہیں۔ ادب زندگی کا اہم مسئلہ نہیں۔ عام لوگوں کے لیے جن میں خواص بھی شامل ہیں — امیر، غریب، متوسط طبقہ، تعلیم یافتہ، ناخواندہ، نوعمر اور عمر رسیدہ کسی کے لیے بھی ادب کی کوئی اہمیت نہیں۔

ادب شاید کچھ ادیبوں کو چھوڑ کر موجودہ دور میں شہرت، رتبہ، دولت، قبولیت کچھ بھی نہیں دے سکتا جب تک کہ ادیب ادارہ بندی کا اسیر نہ ہوجائے اور ادب کو تفریح کے عمومی فارمولوں کی سطح پر نہ لے آئے۔ یہی وجہ ہے کہ ادیب اور عوام میں اکثر ہمیشہ سے ایک سماجی اور ذہنی فاصلہ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب کسی قوم کا کلچر فلم، کرکٹ، اور ٹیلی ویژن اور صارفیت تک محدود ہوجائے تو حالات اس سے بہتر نہیں ہوسکتے۔

ادیب اور فن کار عام لوگوں سے اگر برتر نہیں تو الگ ضرور سمجھے جاتے ہیں۔ فن کار اور عوام کے مابین ایک ذہنی فاصلے کے باوجود لوگوں کے ذہن میں اُن کی جداگانہ حیثیت کے ساتھ ساتھ اُن کا ایک رومانی تصور بھی ہوتا ہے کہ وہ سماج کے باشعور اور حساس افراد ہیں جن کے باعث ادب اور فنونِ لطیفہ کو اپنے عہد کی ثقافت میں مرکزی اور ممتاز مقام حاصل ہوتا ہے۔ سامنتی دور میں انھیں راجاؤں، سامنتوں اور اشرافیہ کی سرپرستی حاصل تھی۔ ان کے پاس دولت تھی، تعلیم تھی، فرصت تھی اور وہ باذوق سمجھے جاتے تھے۔ ماس میڈیا کی اشاعت سے قبل ادب اور فن کار شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے سرپرستوں اور اپنے قارئین، ناظرین سامعین سے متاثر ہوتے تھے۔ ان کی فکر اور تحریر پر اس کا اثر پڑنا ناگزیر تھا۔ ادب کا مواد اور موضوع ہی نہیں بلکہ اس کا فارم اور اسلوب بھی اس سے متاثر ہوتے تھے۔

موجودہ دور میں ماس میڈیا کی وسعت اور مقبولیت کے باعث کلچر، درباروں اور محلوں کی دیواروں سے باہر نکل کر عام لوگوں کے گھروں میں داخل ہورہا ہے۔ عام لوگوں کے شعور کے ساتھ ساتھ ان کی سماجی حیثیت میں بھی تبدیلی آئی ہے۔ اب عام لوگ بھی 'سماج' میں شامل ہورہے ہیں۔ اس سے قبل سماج سے مراد ایک مخصوص برسرِ اقتدار طبقہ تھا۔ اس طبقے کے ادب اور فن، کلاسیکی ادب اور فن کو جہاں جدیدیت سے نبرد آزما ہونا پڑا وہاں عوام کی نئی ابھرتی ہوئی تہذیب نے بھی چیلنج کیا ہے۔ لوک سنسکرتی اور ادبی ورثے نے بھی اس کے اثر کو کم کرنے میں کوئی کم رول ادا نہیں کیا۔ جب ماس میڈیا کے وسائل عام ہوگئے اور عام لوگوں کی رسائی ادب اور فن

تک ممکن ہوسکی تو پاپولر کلچر کی نمو تیزی سے ہونے لگی۔

لیکن پاپولر کلچر سے ادیب اور فن کار، مفکر اور دانشور اور کچھ ماہرین نفسیات اور سماجیات بڑے پریشان ہیں۔ انھوں نے بارہا اس خدشے کا اظہار کیا ہے کہ فن اور ادب کی اعلیٰ قدریں ختم یا مسخ ہورہی ہیں۔ شائستہ ادب اور فن کے قارئین، ناظرین اور سامعین کا دائرہ سمٹ کر بہت ہی محدود ہوتا جارہا ہے۔ اس لیے آج زندگی کے بارے میں اہم اور بنیادی سوالات نہیں پوچھے جارہے ہیں اور نہ ان کے جواب کی کوئی سنجیدہ تلاش کی جارہی ہے۔ پاپولر کلچر کی اصطلاح کئی معنوں میں استعمال ہوئی ہے۔ عمومی، عوام پسند، مقبول عام اور عامیانہ۔ یہ اس پر منحصر کرتا ہے کہ ہم کون سا رویہ اپناتے ہیں۔ تعلیم کی اشاعت، جمالیاتی ذوق کی پرورش کرنے میں پوری طرح ناکام نہ سہی بے اثر ضرورت ثابت ہوئی ہے۔ اس لیے تعلیم بھی ادب اور ثقافت کی نشو ونما میں مدد ثابت نہیں ہورہی اور نہ ہی انسان کی حس لطیف، اور نفاست کو تیز کررہی ہے۔ ایک زمانے میں یہ خیال عام تھا کہ عام لوگوں کی تعلیم ہماری ثقافتی پسماندگی کو دور کردے گی۔ اگر تعلیم عام ہوجائے تو تہذیبی احیا اور ادبی اقدار کی اشاعت ممکن ہوسکتی ہے لیکن تعلیم کے عام پرچار سے یہ امید پوری نہیں ہوئی۔

یہ صحیح ہے کہ اب زیادہ لوگ کتابیں اور رسالے پڑھتے ہیں۔ لیکن کیا یہ جمالیاتی ذوق یا روحانی بالیدگی کے لیے ہے یا تفنن طبع اور نفسیاتی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے یا وقت گزارنے اور نیند لانے کے لیے۔ ان میں ادبی کتابیں اور رسالے بہت ہی کم ہیں۔ سائنس، ادب اور کلچر کے شعبوں میں سستی کتابیں بھی شائع ہورہی ہیں لیکن ذوق کی تربیت نہیں ہورہی ہے۔ رچرڈ ہوگرڈ نے اپنی کتاب 'دی یوسس آف لٹریسی' میں اس مسئلے کا گہرا سائنسی تجزیہ کیا ہے۔ اس نے تحریر کیا ہے کہ یہ خیال غلط ثابت ہوگیا ہے کہ جو لوگ معاشی مجبوریوں کے باعث جمالیاتی ذوق سے محروم رہ جاتے ہیں۔ تعلیم ان کے لیے ایسے مواقع مہیا کرے گی جن سے وہ ادبی ذوق کی تسکین کرسکیں گے۔ لیکن اگر آج ہم عام لوگ اور تہذیب یافتہ لوگوں کی زبان کا ذرا غور سے مطالعہ کریں تو ایسا معلوم ہوگا جیسے وہ بگڑے ہوئے شہری لوگوں کی زبان ہے۔ اس لیے جہاں ایک طرف پاپولر کلچر کی نشو ونما کے لیے سماجی اور تکنیکی ماحول سازگار ہورہا ہے تو وہاں دوسری طرف اس کے خلاف ایسی فضا تیار ہوچکی ہے۔

آخر پاپولر کلچر کے خلاف دائر کیس کے بنیادی نقطے کیا ہیں؟

(1) ہر سماج میں معدودے چند لوگ ہی ایسے ہوتے ہیں جو باذوق ہوتے ہیں یا جس میں ادب اور فن کی خلاقانہ صلاحیت ہوتی ہے۔ ایسے لوگ ایک مخصوص مزاج کے حامل ہوتے ہیں اور وہ ادب اور فن کی تخلیق کے لیے سازگار ماحول تیار کرتے ہیں۔ تعلیم کے پرچار کے لیے یہ ضروری نہیں کہ یہ دائرہ وسیع ہوجائے گا۔ تخلیقی قوت اور فنی اُپج ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتی اور نہ ہی ہر کسی کو ادبی پرکھ اور اس کی قدر معین کرنے اور اس سے محظوظ ہونے کی استطاعت حاصل ہوتی ہے۔ ذہنی طور پر نابالغ لوگ انسانیت کی عام قدروں سے الگ ہوکر ایک ایسی تہذیب کی پرورش کرتے ہیں جو عامیانہ اور کرپٹ ہوچکی ہے۔ کیونکہ جب ہر چیز اور ہر فرد کے مصائب و محاسن اور

> موجودہ دور میں ماس میڈیا کی وسعت اور مقبولیت کے باعث کلچر، درباروں اور محلوں کی دیواروں سے باہر نکل کر عام لوگوں کے گھروں میں داخل ہورہا ہے۔ عام لوگوں کے شعور کے ساتھ ساتھ ان کی سماجی حیثیت میں بھی تبدیلی آئی ہے۔ اب عام لوگ بھی 'سماج' میں شامل ہورہے ہیں۔ اس سے قبل سماج سے مراد ایک مخصوص برسرِ اقتدار طبقہ تھا۔ اس طبقے کے ادب اور فن، کلاسیکی ادب اور فن کو جہاں جدیدیت سے نبرد آزما ہونا پڑا وہاں عوام کی نئی ابھرتی ہوئی تہذیب نے بھی چیلنج کیا ہے۔ لوک سنسکرتی اور ادبی ورثے نے بھی اس کے اثر کو کم کرنے میں کوئی کم رول ادا نہیں کیا۔ جب ماس میڈیا کے وسائل عام ہوگئے اور عام لوگوں کی رسائی ادب اور فن تک ممکن ہوسکی تو پاپولر کلچر کی نمو تیزی سے ہونے لگی۔

رویے اور کردار کا پیمانہ حصول دولت اور قوت ہے تو اخلاقی اور جمالیاتی اقدار بے معنی ہوجاتی ہیں اور یہ سب ہماری زندگی میں اس قدر داخل ہوچکی ہیں کہ اس کے باہر کا ماحول ہمیں اجنبی، بے معنی اور بے لذت محسوس ہوتا ہے۔ اگر کسی لمحے یہ سب کچھ رک جائے تو ایسا محسوس ہوگا کہ ہمارے پاس اپنے ذہن اور روح میں کچھ نہیں جو ہماری زندگی کو بھر سکے، زندہ رکھ سکے، سوائے ایک وسیع بھیانک خلا کے۔ اندر بھی اور باہر بھی۔

(2) ماس میڈیا/ پاپولر کلچر (میں نے یہاں ماس میڈیا اور پاپولر کلچر کو ایک ہی اصطلاح کے طور پر استعمال کیا ہے حالانکہ کیمونی کمیشن کی سماجیات کی رو سے یہ صحیح نہیں۔ دونوں میں کئی اجزا کے مشترک ہونے کے باوجود فرق ہے)۔ طبع زاد رنگ کا حامل نہیں ہوتا۔ اس کی فکر اور اظہار منفرد مخصوص نہیں ہوتا، اجتماعی اور عمومی ہوتا ہے۔ اس میں یکسانیت کے باعث جدت، وسعت اور گہرائی ممکن نہیں اور یہ ایک موضوع، مواد اور طرز اظہار کے محدود دائرے میں ہی سمٹ کر رہ جاتا ہے۔ ہم ایک ہی طرح کے گانے سنتے ہیں، ایک ہی طرح کی فلمیں دیکھتے ہیں۔ ایک ہی طرح کے رسالے پڑھتے ہیں۔ مسلسل پرچار، اشتہارات کے باعث ہمارا ذوق یکساں ہوتا جارہا ہے، ہمارا نجی فیصلہ اور پسند اور ذوق دھیرے دھیرے اس کا شکار ہورہے ہیں یا تو وہ ختم ہوجاتے ہیں یا عمل میں نہیں آسکتے۔ اور ہم ایک بے معنی مجہولیت کا شکار بن کررہ جاتے ہیں۔ سلسلہ وار ڈرامے جو ٹیلی ویژن کے ذریعے پیش کیے جاتے ہیں وہ چند بندھے ٹکے فارمولوں پر مبنی ہوتے ہیں، کردار ٹائپ بن جاتے ہیں اور پلاٹ بار بار دہرائے جاتے ہیں۔ ایسے پروگرام 'سوپ اوپرا' اور 'سٹ کام' کے دائرے میں آتے ہیں۔

(3) ماس میڈیا/ پاپولر کلچر ادیبوں، فن کاروں اور دانشوروں کے بجائے شوبزنس کے اداکاروں کو پیش کرتا ہے۔ اگر اہل علم و دانش ان پروگراموں میں پیش ہوتے ہیں تو وہ بھی ایک قسم کا 'رول پلے' کرتے ہیں۔ فلم اور ٹیلی ویژن ہیرو کو مقبول بناتے ہیں، ہیرو کوئی بھی ہوسکتا ہے، فلمی اداکار، سیاست داں یا جرائم پیشہ، جھوٹے واقعات، جھوٹے قصے کہانیاں، جھوٹے آدمی ذہن پر غلبہ پالیتے ہیں۔ یہ دور اس ہیرو کا نہیں جو کوئی معرکہ خیز کام کرتا ہے۔ انسانیت اور انقلاب کی راہ میں شہید ہوجاتا ہے یا زندگی قربان کردیتا ہے۔ اگر کوئی ہیرو ہے تو تفریحی دنیا کا کوئی گلیمر بوائے، ماس میڈیا کسی کو بھی ہیرو بنا سکتا ہے۔ اس کے لیے غیر معمولی ذہن کی ضرورت نہیں، جسم کی کشش کی ضرورت ہے، صلاحیت کی نہیں، نمائش کی ضرورت ہے ذہانت کی نہیں، دولت کی ضرورت ہے۔ کلچر کے زوال کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ آج کوئی عظیم ہستی پیدا نہیں ہوتی۔ سب معمولی آدمی ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ اینٹی ہیرو کا دور ہے جو حالات کو اپنے آدرش کے مطابق موڑنے کے بجائے خود حالات کے مطابق ڈھل جاتا ہے۔ آج کوئی بھگت سنگھ ہیرو نہیں بن سکتا کیونکہ بھگت سنگھ کے پاس جذبہ تھا، نصب العین تھا۔ ماس میڈیا کی

براہ راست اور پوشیدہ طور پر ذہنوں کو متاثر کرنے والی قوت نہیں تھی۔

(4) ادب اور فن کے خلاف سب سے بڑا حربہ جو استعمال میں لایا گیا ہے وہ ماس میڈیا ہے۔ فلم، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور کثیرالاشاعت رسالے (ویسے یہ ادب کے نام پر بہت کچھ شائع اور نشر کرتے رہتے ہیں) ماس میڈیا نے ایک غیراخلاقی، غیر جمالیاتی، لمحاتی لذت پرستانہ، تفریحی ادب کی اشاعت میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔ ہم کیا کھائیں؟ کیا پہنیں، کیا خریدیں، کیا سوچیں، کیا دیکھیں، کس کی سرپرستی کریں، کس سے نفرت کریں، کیا پسند کریں، کیا ناپسند، کیا پڑھیں کیا نہ پڑھیں، یہ سب کچھ ماس میڈیا طے کرتا ہے اور یہ سب کچھ پوشیدہ نفسیاتی طور پر نیم شعوری اور بعض اوقات براہ راست شعوری تحریک کے مطابق ہوتا ہے۔ اس کا ایک گہرا تجزیہ وانس پیکرڈ نے اپنی کتاب 'دی ہڈن پرسویڈرز' میں پیش کیا ہے۔ پاپولر کلچر میں جنس اور عشق، حیات اور موت، انسان اور کائنات، فرد اور سماج کے تصورات بدل گئے ہیں۔ ذہنی اور روحانی زندگی سے عاری یہ لوگ جدید سماج کے ایسے مہاجرین ہیں جن کی جڑیں نہیں، وہ بھیڑ یا ہجوم سے الگ نہیں رہ سکتے، وہ تنہائی کی لذت کے بجائے تنہائی کی دہشت کے دائرے میں رہتے ہیں۔ فرسودہ روایت اور رائج طرز فکر کو ادبی تخلیقات چیلنج کرتی ہیں جس کا خطرہ ماس میڈیا لینے کے لیے تیار نہیں کیونکہ انھیں ہر طبقے کی خوشنودی حاصل کرنی ہوتی ہے۔ بالخصوص برسرِ اقتدار طبقے اور تاجروں کی، جو یا تو ماس میڈیا کے مالک ہیں یا ماس میڈیا ان کے کنٹرول میں ہے یا جن سے ماس میڈیا کو رقم ملتی ہے اور یہ سب کچھ عوام کے نام پر ہوتا ہے اور اس طرح ماس میڈیا موجودہ حالات کو بدستور قائم رکھنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے اور ماس میڈیا کی رسائی دور دور تک پھیلے ہوئے اندرون علاقوں تک، شہروں اور گاؤں اور آدی واسی بستیوں تک ہے۔ ماس میڈیا ان کی روزمرہ کی زندگی کے مسائل کو نظرانداز کرکے انھیں سرکس اور کارنیوال کے روپ میں پیش کرتا ہے۔

(5) پاپولر کلچر لوگوں کی توجہ ان کے پیچیدہ اور سنجیدہ مسائل کی طرف نہیں دلاتا بلکہ ہر چیز کو سطحی طور پر پیش کرتا ہے۔ مسائل کا مطالعہ بھی سطحی اور ان کا حل بھی سطحی۔ اس طرح یہ مسائل اور زیادہ الجھتے جاتے ہیں، ناقابلِ حل ہوتے جاتے ہیں اسی لیے جب تک کسی دیش میں کوئی بحرانی صورت پیدا نہیں ہوتی، عوام فعال نہیں ہوتے۔ اہل علم و دانش لوگوں کی توجہ ان کے روزمرہ کے مسائل اور زندگی کی طرف دلاتے ہیں۔ لیکن ماس میڈیا سے متاثر لوگ حقیقت سے فرار کرتے ہیں۔ وہ حقیقت کو برداشت نہیں کرسکتے۔ جدید دور نے ایک ایسی روحانی خلا کو جنم دیا ہے جس میں تلاش، مسرت اور خام جذبات اور جبلتوں کی بے روک ٹوک تسکین کو زندگی کا مقصد تسلیم کرلیا جاتا ہے۔ بنیادی طور

پر یہ رویہ ایک مادی لذت پرست کلچر کی اشاعت کرتا ہے جو نہ صرف ادب اور فن کی جمالیاتی اقدار اور روحانی ضرورتوں کی نفی کرتا ہے۔ بلکہ اسے تحقیر کی نظر سے دیکھتا ہے۔ درحقیقت پاپولر کلچر نوعمر، نو امیر، نیم تعلیم یافتہ لوگوں کا کلچر بنتا جارہا ہے۔

(6) پاپولر کلچر میں اکثریت کو اقلیت کے طرزفکر پر ترجیح دی جاتی ہے۔ وہ لوگوں کے ذہن میں 'انتشار' پیدا نہیں کرتا بلکہ اس کے برعکس یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ انجام کار سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔ اپنے ذہن، ضمیر اور روح پر بوجھ ڈالنے کی ضرورت نہیں۔

(7) پاپولر کلچر میں واقعات کو کچھ اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ عام لوگ کرپشن، جرم، تشدد، جبر، ناانصافی کی زندگی کے عادی ہوجاتے ہیں۔ وہ احتجاج نہیں کرتے۔ حقائق سے نبردآزما ہونے کی ساری سکت اور عزم مفلوج ہوجاتا ہے۔ وہ ماس میڈیا کے چکرویو میں اس طرح پھنس جاتے ہیں کہ جس میں داخل ہونے کا راستہ تو انھیں مل جاتا ہے لیکن باہر نکلنے کے تمام راستے مسدود ہوچکے ہوتے ہیں۔ علم، ادب اور فن غیرضروری ہوجاتے ہیں۔

(8) ذوق اور پسند میں یکسانیت پیدا ہوجاتی ہے۔ ماس میڈیا ان لوگوں کی کشش کا باعث بن جاتا ہے جو دولت، معاش یا عام مقبولیت کی خاطر اس میں داخل ہوتے ہیں اور اپنی تخلیقی قوتوں کو تاجرانہ ضرورتوں کے تحت استعمال کرتے ہیں۔ مواصلات کے اثرات اتنے ہمہ گیر اور جامع ہوجاتے ہیں کہ لوگ باہمی اشتراک اور ذاتی رشتوں سے کٹ جاتے ہیں یہاں تک کہ اپنے آپ سے بھی۔

یہاں مشہور ماہر نفسیات ڈیوڈ رونالڈ لینگ (جسے 'پاگلوں کا مسیحا' کا خطاب عطا کیا گیا ہے اور جسے ردنفسیات کے مبلغ کے طور پر یاد کیا جاتا ہے) کا ذکر ضروری ہے۔ ایک تیرہ برس کی لڑکی کے والدین نے لینگ سے شکایت کی کہ وہ ان کے ہاتھوں سے نکلی جارہی ہے اور وہ غیرمعمولی عمل کررہی ہے کیونکہ جب ہم ٹیلی ویژن دیکھتے ہیں تو وہ اپنے کمرے میں جاکر خالی دیوار پر نظریں گاڑ دیتی ہے۔ لینگ نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ لڑکی اتنی دیر تک دیوار نہیں دیکھتی جتنی دیر تک اس کے ماں باپ ٹیلی ویژن اسکرین دیکھتے ہیں۔ انھیں اپنی لڑکی کے دیوار دیکھنے پر اعتراض ہے، اپنے ٹی وی دیکھنے پر نہیں۔ یہ محض اپنی اپنی پسند ہے۔ مریض کون ہے وہ لڑکی جو بغیر کچھ بولے خالی دیوار دیکھتی ہے یا اس کے ماں باپ جو گھنٹوں ٹی وی اسکرین پر نظریں جمائے رکھتے ہیں۔ وہ مفصل طور پر پرچھائیاں دیکھتے ہیں جب کہ لڑکی خالی دیوار پر تصویرکشی کے تخیلی اور تخلیقی عمل سے گزرتی ہے۔

(9) سوپ اوپیرا کی یہی خصوصیت ہے کہ وہ زندگی کے تمام مسائل کو بڑی خوش اسلوبی سے سلجھا دیتے ہیں۔ افراد اور خاندان جو مشکلات میں مبتلا ہوجاتے ہیں کسی نہ کسی طرح اپنی مشکلات کا کوئی نہ کوئی حل تلاش

کر لیتے ہیں جو روزمرہ کی زندگی میں ممکن نہیں ہوتا کیونکہ داستان کو جاری رکھنا ہوتا ہے۔ اس لیے نئی مشکلات پیدا ہوتی رہتی ہیں اور حل ہوتی رہتی ہیں اور اس طرح یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ لوگ اشتیاق سے اس زندگی کی حقیقت کو اپنی زندگی کی حقیقت سے جوڑ کر یا پروجیکٹ کرکے دیکھنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ پروگرام ساز یہ دعویٰ کرنے میں حق بجانب ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنے ڈراموں کا مواد لوگوں کی روزمرہ کی زندگی سے اخذ کرتے ہیں اور اسے ایک ایسے فارم اور وسیع پس منظر میں پیش کرتے ہیں جس سے زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے مستفید ہو سکیں۔ وہ لوگوں کو فرار کی جانب نہیں لے جاتے، بلکہ سوچنے کے لیے ان کو ذہنی غذا مہیا کرتے ہیں۔ 'سٹ کام' کے چلانے والے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ لوگوں کو ان کی روزمرہ کی زندگی کی تلخیوں سے دور فرصت اور تفریح کے کچھ لمحات مہیا کرتے ہیں جو ان کی نفسیاتی صحت کے لیے از حد ضروری ہے۔

(10) ماس میڈیا اگر ادب عالیہ کو بھی پیش کرتا ہے تو اس طرح کہ اس سے ادب بھی غائب ہو جاتا ہے اور عالیہ بھی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ادب عالیہ کی جمالیاتی قدر کو مسخ کیے بغیر اسے ماس میڈیا کے ذریعے عام لوگوں تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ کیا اس سے ادب کا معیار اتنا پست نہیں ہو جائے گا کہ اس کی قدر متعین کرنا بھی مشکل ہو جائے گا۔ ماس میڈیا کے دور میں کیا ادبی جمود یا زوال کو روکا جا سکتا ہے؟

(11) ماس پروڈکشن کے باعث پاپولر کلچر اعلیٰ معیار برقرار نہیں رکھ سکتا۔ اس کے پیش نظر سامعین/ قارئین کا ایک وسیع ہجوم ہوتا ہے تاکہ اقدار، معیار اور ذوق۔ پاپولر کلچر تہذیب کی اعلیٰ اقدار پر مبنی مواد کو مستعار لے کر اسے مقبول عام بنانے کے لیے اس کے جوہر، اقدار اور فنی حسن کو ختم کر دیتا ہے، یہاں تک کہ ان لوگوں کو بھی پاپولر کلچر، کی تشکیل کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جن میں فنی صلاحیت، افتاد طبع اور اُپج ہوتی ہے۔ دھیرے دھیرے یہ سب کچھ زنگ آلود ہو جاتا ہے۔ ایک مخصوص سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ جہاں تک سامعین کا سوال ہے وہ منفعل ذہنیت اور منفی تسکین کے حامل ہو جاتے ہیں۔ بائیں بازو کے مفکر ہربرٹ مارکیوز کے خیال میں ماس میڈیا بقراطوں اور آمروں کے ہاتھ میں ایک مہلک حربہ ہے جس کا استعمال لوگوں کے استحصال اور جبر کے لیے کیا جاتا ہے۔

(12) ماس میڈیا سماجی، اخلاقی، ذہنی، جذباتی طور پر مضر ہے۔ وہ لوگ جو ذہنی طور پر 'منتشر' ہوتے ہیں ماس میڈیا ان کو تسکین اور فرار کی راہ مہیا کرتا ہے۔ یہ فرد کو ایٹمی ذرہ میں بدل دیتا ہے۔ یہ بھی ایک نشہ ہے جس سے نجات ممکن نہیں جو انسان کی پہچان کو ہی نہیں اس کے جوہر کو بھی ختم کر دیتا ہے۔

دانش ور بڑے تذبذب کی حالت میں ھیں۔ ایک طرف تو وہ جمھوریت، عوام اور کلچر کی وسعت کی بات کرتے ھیں تو دوسری طرف وہ کلچر جو عوام پسند کرتے ھیں ان کو عامیانہ قرار دے کر اس کی مذمت کرتے ھیں۔ یعنی پاپولر کلچر کی جو جمھوریت اور تعلیم کے پرچار کے دور کا تقاضہ ھے اس کے خواصی کردار اور اس کی جمھوریت پرستی میں کش مکش کے باعث کلچرکے مسائل حل نھیں ھورھے ھیں۔

......اور یہ فہرست بہت طویل ہے۔

ماس میڈیا/ سوسائٹی/ کلچر کے مخالفین میں وہ دانشور زیادہ نمایاں ہیں۔ جو نئی ٹکنالوجی اور الیکٹرانکس کو انسان کی بقا اور اس کے فطری ارتقا اور مستقبل کے لیے مہلک قرار دیتے ہیں۔ نامور اسپینی ماہر سماجیات اورتیگا نے 1832 میں شائع اپنی مشہور کتاب 'ری وولٹ آف دی ماسس' میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ موجودہ دور میں جس تہذیب کی پرورش ہو رہی ہے اس میں انفرادی فکر، احساس اور ذوق کو ایک اجتماعی ڈھانچے میں ڈھالا جا رہا ہے۔ انسانی روح اور کلچر کو مادی زندگی کا شکار بنایا جا رہا ہے۔ عام لوگ اپنی روایات سے محروم ہوتے جا رہے ہیں وہ ماس میڈیا، ٹکنالوجی اور ادارہ بندی کے مشترک عمل کے تحت یکسانیت اور ریجی مینٹیشن — کا شکار بنتے جا رہے ہیں۔ کلچر، فن اور ادب اور زندگی کی آسائشیں جو کل تک ایک مخصوص طبقے تک محدود تھیں۔ اب عام ہوتی جا رہی ہیں، لیکن اس عمل میں ان کی منفرد تخلیقی اہمیت بھی ختم ہوتی جا رہی ہے۔ ان حالات میں سماج میں تناؤ اور کش مکش کی صورت حال پیدا ہو گئی ہے جس کے باعث تشدد آمیز عمل کو تحریک مل رہی ہے اور اس طرح موجودہ تہذیب ایک گہرے بحران کا شکار ہو کر نراج کی طرف بڑھ رہی ہے۔ یاد رہے کہ اس کتاب کی اشاعت کے اگلے دس پندرہ برسوں میں ٹکنالوجی پر خوب وار کیے گئے۔ بقول اورتیگا آج لوگوں کو قدرے زیادہ آزادی، تعلیم اور فراغت نصیب ہے۔ لیکن اس کا صحیح استعمال نہیں ہو سکا۔ آج بھی لوگ یسوع مسیح پر باربس کو ترجیح دیتے ہیں۔ نئے بائیں بازو کی تحریک کے مفسر ہربرٹ مارکوز نے پاپولر کلچر کو ریاست اور سرمایہ پرستوں کا پھیلا ہوا جال قرار دیا ہے جسے تبدیلی اور انقلاب کے خلاف جبر اور تشدد کے لیے استعمال میں لایا جاتا ہے۔ ماس میڈیا، ٹکنالوجی اور پاپولر کلچر لوگوں کے لیے ارتقائی عمل ہے جس کے باعث احتجاج کا جذبہ کمزور پڑ جاتا ہے۔ یہ ایک نشہ ہے جو ان پر طاری ہو جاتا ہے اور انھیں تبدیلی کے عمل سے دور رکھتا ہے۔ زندگی کی حقیقت سے دور انھیں خوابوں کی دنیا میں لے جاتا ہے۔

دانش ور بڑے تذبذب کی حالت میں ہیں۔ ایک طرف تو وہ جمہوریت، عوام اور کلچر کی وسعت کی بات کرتے ہیں تو دوسری طرف وہ کلچر جو عوام پسند کرتے ہیں ان کو عامیانہ قرار دے کر اس کی مذمت کرتے ہیں۔ یعنی پاپولر کلچر کی جو جمہوریت اور تعلیم کے پرچار کے دور کا تقاضہ ہے اس کے خواصی کردار اور اس کی جمہوریت پرستی میں کش مکش کے باعث کلچر کے مسائل حل نہیں ہو رہے ہیں۔

■

ماخذ: عوامی ذرائع ابلاغ، ترسیل اور تعمیر و ترقی: دیویندر اسر، مترجم: شاہد پرویز، سن اشاعت: دسمبر 2002، ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

محمد شجاعت علی راشد

اسلامی فنون کی مختلف شکلیں

(فن موسیقی)

قوموں کے عروج وزوال میں علوم وفنون کی ترقی کا راز مضمر ہوتا ہے گویا کسی ملک یا قوم کی تاریخ وہاں کے علوم وفنون کی بھی تاریخ ہوتی ہے اسی لیے احیائے علوم میں سب سے زیادہ وہی قومیں حصہ لیتی رہی ہیں جن کی تاریخ کے صفحات انقلابات، شورشوں، ہنگاموں اور جنگ وجدل سے بالکل خالی نہیں تو بڑی حد تک خالی ضرور ہیں۔ لیکن تاریخ عالم کے اوراق شاہد ہیں کہ مسلمانوں نے ملک گیریوں اور فتوحات کے باوجود علوم وفنون کے فروغ اور اس کی ترویج و اشاعت میں محیر العقول کارنامے انجام دے کر اقوام عالم کے سامنے ایک فقید المثال علمی وادبی سرمایہ پیش کیا ہے اور اس قسم کے سرمایے کسی بھی قوم کی تہذیب وثقافت کی جان ہوا کرتے ہیں۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے مسلمانوں کو تحصیل علوم کی بار بار تاکید فرمائی ہے۔ لہذا اسی فرمان مبارک کا نتیجہ ہے کہ اسلام کی دوسری صدی ہی سے مسلمان تحصیل علوم وفنون کی طرف متوجہ ہوئے اور مختلف علوم وفنون کی تحصیل وتکمیل میں حصہ لیتے ہوئے اپنی غیر معمولی ایجادات، شاندار فنی کارناموں اور علمی شاہ کاروں سے اقوام عالم کو مستفید کیا۔

ابتداً اسلامی تہذیب سے مراد عربوں کی تہذیب تھی، ان کی شاعری، قبائلی روایات وآثار پر رفتہ رفتہ ایرانی، عراقی، شامی اور مصری تہذیب کے رنگ چڑھتے گئے اور ہر ملک میں اسلامی تہذیب کا رنگ بدلتا گیا۔ بنیادی تصورات تو وہی رہے لیکن علاقائی روایات کی وجہ سے اس کی صورت تبدیل ہوگئی۔ عباسیہ دور کے بغداد میں اس نے علم وحکمت کی صورت اختیار کر لی۔ ایران پہنچ کر یہ نقاشی، مصوری اور شاعری میں ڈھل گئی۔ ہندوستان میں حسین عمارات کا قالب اختیار کرلیا اور ہسپانیہ میں یہ عظیم درسگاہوں کی لائبریریوں میں بدل گئی۔ یہ اختلاف اور تنوع دیگر اقوام میں بھی نظر آتا ہے۔ مصر کی پرانی تہذیب تعمیراتی تھی جس کا اظہار اہرام کی صورت میں ہوا، قدیم ایران کی تہذیب عقلی تھی۔ قدیم چین کی مصورانہ اور ہند کی ہر زمانے میں ضمیاتی تھی۔ اسلام جہاں بھی پہنچا اس نے وہاں کی تہذیب سے کچھ نہ کچھ حاصل کیا۔ آتش پرست کی مقدس آگ چراغ مسجد بن گئی اور ان کا کلس ہمارا مینار۔ یوں رفتہ رفتہ ایک ایسی حسین، عظیم اور طاقتور تہذیب وجود میں آگئی جس نے ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور آج بھی زوال وانحطاط کا شکار ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے مسلمانوں کو تحصیل علوم کی بار بار تاکید فرمائی ہے. لہذا اسی فرمان مبارک کا نتیجہ ہے کہ اسلام کی دوسری صدی ہی سے مسلمان تحصیل علوم و فنون کی طرف متوجہ ہوئے اور مختلف علوم و فنون کی تحصیل و تکمیل میں حصہ لیتے ہوئے اپنی غیر معمولی ایجادات، شاندار فنی کارناموں اور علمی شاہ کاروں سے اقوام عالم کو مستفید کیا.

فلسفہ اور دیگر علوم مابعد الطبیعیات میں مسلمانوں نے بیش قیمت اضافے کیے۔ یورپ میں صدیوں تک اسکندی، ابن رشد، جاحظ، ابن طفیل، ابن غزالی کے علاوہ اور کئی مفکرین کا فلسفہ پڑھایا جاتا رہا ہے۔ ریاضی میں عمر خیام اور موسیٰ بن شاکر جیسے علما کا کوئی جواب نہ تھا۔ الجبرا مثلثات ریاضی اور دیگر کئی علوم مسلمانوں ہی نے ایجاد کیے۔ علم ہیئت میں مسلمانوں کی اہم ایجاد اصطرلاب جس سے ستاروں کا فاصلہ ناپا جاتا ہے۔ علم تاریخ کو پہلی بار مسلمانوں ہی نے صحیح اور سائنسی بنیادوں پر مدون کیا۔ علم لغت، ادب، شاعری، تصوف، حدیث، فقہ، کلام اور ایسے ہی سیکڑوں علوم ہیں جس میں مسلمان بڑی دسترس رکھتے تھے۔ مسلمانوں کو کتب اکٹھا کرنے کا بہت شوق تھا سلاطین اور امرا کے علاوہ عام مسلمان بھی کتابوں کا ذخیرہ کرنا ثقافت وتہذیب کا جز سمجھتے تھے۔

فن موسیقی : موسیقی بطور علم اور بطور فن مسلمانوں میں ہمیشہ موجود رہی ہے۔ کبھی نعت وقوالی میں تو کبھی سماع میں کئی مسلم اکابرین نے اس فن پر کتابیں بھی لکھی ہیں۔ انسانی فطرت موسیقی سے دلی لگاؤ رکھتی ہے ہندوستان میں بھی موسیقی پر خاص توجہ دی جاتی ہے اور اس فن میں ایسے ایسے اساتذہ پیدا ہوئے جن پر ہندوستان ناز کرسکتا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس فن نے وسعت حاصل نہیں کی اس کی کئی وجوہات ہیں۔ فن موسیقی کے ماہرین نے زمانے کی کروٹوں کو شاید اب تک نہیں سمجھا ہے۔ ان میں گھرانے ہیں اور ہر گھرانہ دوسرے گھرانے پر اپنے تفوق کا اظہار کرتا ہے اور اسی طرح ان گھرانوں میں فروعی اختلافات کی کثرت ہے جس کی وجہ سے ترقی مفقود ہے۔ اس کے علاوہ استاد، فن کو اپنے سینے میں محفوظ رکھنا چاہتا ہے اور اسے گوارہ نہیں ہوتا کہ دوسرے بھی اس سے مستفید ہوں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کا فن اس کے ساتھ ہی قبر میں دفن ہو جاتا ہے۔ شاگرد ان سے جو کچھ سیکھتے ہیں وہ ادھورا ہوتا ہے اور اس ادھورے پن میں بھی اختلافات کا وہی عکس نظر آتا ہے جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ فن موسیقی سے ہٹ کر عام پسند موسیقی نے زمانے کی کروٹوں کے ساتھ ساتھ نئی نئی شکلیں اختیار کی ہیں اور اس میں کئی مکاتب بھی پیدا ہوگئے ہیں۔ اس لیے موسیقی میں جدت پیدا کرنے کی کوشش کو ہمیشہ سے سراہا جاتا رہا ہے۔

موسیقی کی شرعی حیثیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے غلام جیلانی برق لکھتے ہیں ''سوال یہ ہے کہ جب فطرت کے ہر ذرے سے امواج موسیقی بلند ہو رہی ہیں تو علمائے اسلام نے اسے حرام کیوں قرار دیا؟ اس سلسلے میں گزارش ہے کہ موسیقی کی کئی قسمیں ہیں اول وہ جو تھیٹروں، سینماؤں اور طوائف خانوں میں ملتی ہے، جس کا مقصد ہے جذبات سفلی کو بھڑکانا اور شباب کو دعوت شراب وگناہ دینا، دوم قوالی یعنی خدا اور رسول کی تعریف، سوم کسی فلسفیانہ غزل، پاکیزہ نظم یا مرثیہ کو خوش الحانی سے پڑھنا، چہارم میٹھی آواز سے تلاوت، قسم اول ہر طبقے کے ہاں

حرام ہے اور قسم چہارم ہر مکتب خیال کے ہاں مستحسن، باقی دو قسموں کے متعلق علما میں اختلاف پایا جاتا ہے محتاط طبقہ اس خیال سے اس کی اجازت نہیں دیتا کہ مبادا اس سے روح جفا طلبی مر جائے اور آدمی سہل انگار بن جائے یا اس کا دل روحانی لذت کے سرچشموں یعنی عبادت وتلاوت سے اچاٹ ہو جائے یا وہ موسیقی کے جائز و ناجائز حدود کو ملا دے۔'' سید محمد جعفر شاہ نے 'اسلام اور موسیقی' کے عنوان سے ایک مفصل کتاب لکھی ہے اور ان تمام صحابہ کرام، تابعین، اولیا اور علما کی فہرست دی ہے جو موسیقی کو جائز یا ناجائز سمجھتے تھے۔ جائز سمجھنے والوں میں آپ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ تعالی عنہ بن عوف، حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ تعالی عنہ بن جراح، عبداللہ بن مبارک، قاضی ابو یوسف، ابوطالب مکی، مولانا رومی، نجم الدین کبریٰ، حضرت بختیار کاکی رضی اللہ تعالی عنہم اور بیشتر علمائے چشت کا نام لیا ہے۔'' موسیقی پر مسلمانوں کی پینتالیس کتابوں کا ذکر آرنلڈ کی کتاب میں بھی موجود ہے، عربوں کے ہاں موسیقی کی قدر و قیمت عربی سازوں کے نام عرب موسیقار، عباسیوں کے دور میں موسیقی، یونانی کتب موسیقی کے تراجم، عربی کتب موسیقی یورپ میں، ہندی موسیقی، پاکستانی موسیقی کے علاوہ شامی موسیقی، مصری موسیقی، عراقی موسیقی، ایرانی موسیقی، ترکی موسیقی وغیرہ کا بھی اس مقالے میں سرسری جائزہ لیا گیا ہے۔

زبور جو حضرت داؤد پر نازل ہوئی تھی اس کے پانچ حصے اور کل ایک سو پچاس ابواب ہیں۔ یہ ساری کتاب نظم میں ہے اس لیے زبور کو مزامیر داؤد بھی کہتے ہیں۔ زمر کے معنی ہیں بانسری وغیرہ پر گانا اور مزامیر داود کا مطلب ہے حضرت داؤد جو اشعار اور دعائیں ترنم سے پڑھا کرتے تھے ان کو مزامیر داؤد اور زبور بھی کہتے ہیں۔

مزمور کے لیے سب سے جامع لفظ 'گیت' ہے چناں چہ زبور کا 66واں باب یوں شروع ہوتا ہے ''میر مغنی کے لیے گیت یعنی مزمور'' اور 67ویں باب کا آغاز یوں ہوتا ہے ''میر مغنی کے لیے تار دار سازوں کے ساتھ مزمور یعنی گیت''۔ گویا مزمور اور گیت ایک ہی چیز ہے لیکن اس کے ضمن میں دو اور چیزیں بھی شامل ہیں ایک ترنم اور دوسرے ساز۔ مزموران گانوں کو کہتے ہیں جو ساز پر الاپے جائیں۔ اور مزمار اس ساز کو کہتے ہیں جس کے ساتھ کوئی گانا گایا جائے۔ جمع دونوں کی مزامیر ہے۔ اور دونوں لازم وملزوم ہیں۔

زبور کے غنائی اشارات: زبور کا انداز یہ ہے کہ تقریباً ہر باب ایک گیت پر مشتمل ہے اور اس کی سرخی غنائی اشارات پر۔ مثلاً باب نمبر 4 کا آغاز یوں ہوتا ہے'' میر مغنی کے لیے تار دار سازوں کے ساتھ داؤد کا مزمور''۔

باب نمبر 95 کی پہلی آیت یوں ہے۔'' آؤ ہم خداوند کے حضور نغمہ سرائی کریں''۔

باب نمبر 96 کی پہلی آیت یوں ہے'' خداوند کے حضور نیا گیت گاؤ''۔

باب 120 سے 134 تک ہر باب کا عنوان اس طرح ہے۔''معلوت یعنی ہیکل کی زیارت کا گیت'' اس میں بیشتر گیت داؤد کے اور بعض حضرت سلیمانؑ کے ہیں۔

باب نمبر 144 کی نویں آیت یوں ہے۔'' اے خدا میں تیرے لیے نیا گیت گاؤں گا' دس تار والی بربط پر میں تیری مدح سرائی کروں گا۔''

ان مثالوں سے جو نتائج اخذ ہوتے ہیں وہ یہ کہ

1. حضرت داؤد کے پاس متعدد مغنی (گانے والے) موجود تھے اور کوئی ایک مغنی ان سب کا افسر تھا جو میر مغنی تھا۔
2. عام طور پر بانسری اور بربط' ستار' دف' اور جھانجھ بطور ساز استعمال کیے جاتے تھے۔
3. صرف حضرت داؤد ہی نہیں بلکہ حضرت سلیمانؑ اور ان کے وزیر آصف بھی یہ گیت گاتے تھے۔
4. قدیم دعائیں مثلاً حضرت موسیٰؑ کی دعا بھی بطور گیت کے گائی جاتی تھی۔
5. ان گیتوں کے مضامین میں حمد' دعا' نغمۂ فتح' زیارت' ہیکل' پیش گوئی وغیرہ سب چیزیں موجود تھیں۔
6. خدا کے حضور گیت گانے اور بجانے کا پیغمبر حکم بھی دیتے ہیں اور خود بھی اس کا اظہار کرتے ہیں۔

ان سب سے زیادہ دلچسپ وہ حکم یا نصیحت ہے جو حضرت داؤد اس طرح کرتے ہیں۔

''نرسنگے کی آواز کے ساتھ اس کی حمد کرو۔ بربط اور ستار پر اس کی حمد کرو۔ دف بجاتے اور ناچتے ہوئے اس کی حمد کرو۔ تار دار سازوں اور بانسری کے ساتھ اس کی حمد کرو۔ بلند آواز جھانجھ کے ساتھ اس کی حمد کرو۔ زور سے جھنجھناتی جھانجھ کے ساتھ اس کی حمد کرو۔''

یہ زبور کے آخری باب نمبر 150 کی آیات ہیں۔

یہ صرف بائبل ہی میں نہیں اس کا اقرار شارح بخاری علامہ بدرالدین یعنی محدث حنفی نے بھی (جلد 9 ص329) میں اور حافظ ابن حجر عسقلانی فتح الباری (جلد 9 ص63) میں بھی فرماتے ہیں۔

عبید بن عمیر سے روایت ہے کہ سیدنا داؤد کے پاس ایک باجا تھا جس پر وہ گایا کرتے تھے' روتے بھی تھے اور رلاتے بھی تھے۔

عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ سیدنا داؤد زبور کو ستر لہجوں میں پڑھتے تھے اور ایسے نئے نئے انداز میں پڑھتے تھے کہ بیمار بھی مست ہو جاتا تھا۔ (ص 38 '37 '35)

موسیقی پر کوئی گفتگو اس وقت تک پوری نہیں ہو سکتی جب تک امام غزالی کا انداز فکر نہ پیش کیا جائے۔ غزالی جب بحث کرتے ہیں تو موضوع بحث کے کسی باریک سے باریک گوشے کو بھی نہیں چھوڑتے۔ انھوں نے فن موسیقی' اس کی اقسام' مزامیر اور ان کی انواع دونوں کی تاثیر اور حدود' حلال اور حرام' غرض ہر پہلو پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ احیاء العلوم سے جستہ جستہ عبارت کے ترجمے نقل ہیں۔

موزوں نغموں کو روح سے جو مناسبت ہے اس میں قدرت کا عجیب راز ہے اس لیے کہ روح پر اس کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ بعض آوازیں فرحت بخشتی ہیں' بعض مغموم بنا دیتی ہیں' بعض سلا دیتی ہیں' بعض ہنسا دیتی ہیں اور بعض جگہ سن کر ہاتھ' پاوں اور سراسی (تال سر) کے مطابق حرکت کرنے لگتے ہیں۔

اس کے بعد غزالی نے ایک طویل واقعہ لکھا ہے جس میں ایک غلام کا ذکر ہے جس کی آواز حدی سے دوڑتے دوڑتے کئی اونٹ مر گئے تھے۔ اس کے بعد غزالی پھر لکھتے ہیں:

''یہاں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سماع کی قلبی تاثیر محسوس ہوتی ہے اور جسے سماع حرکت میں نہ لائے وہ ناقص ہے۔ راہ اعتدال سے ہٹا ہوا ہے۔ روحانیت سے دور ہے۔ طبیعت کی سختی اور کثافت میں اونٹوں اور پرندوں سے بلکہ سارے بہائم سے بھی بڑھ کر ہے۔ اس لیے کہ موزوں ترنم سے سبھی متاثر ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پرندے بھی حضرت داؤد کا نغمہ سننے کے لیے ان کے سر پر آ کر بیٹھ جاتے تھے۔''

موسیقی سے علاج: افلاطون کہتا ہے غم زدہ آدمی کو اچھی آوازیں سننا چاہیے۔ کیوں کہ جب دل پر غم طاری ہوتا ہے تو اس کی روشنی بجھ جاتی ہے۔ لہٰذا جب وہ وجد و کیف پیدا کرنے والی چیزیں سنتا ہے تو بجھا ہوا جذبہ پھر بھڑک اٹھتا ہے۔ القدیم والحدیث کے مولف محمد کرد علی نے صفحہ 224 پر ان امراض کی ایک فہرست دی ہے جن میں موسیقی کی مدد کامیاب ثابت ہوئی۔ وہ امراض یہ ہیں۔ مرگی' سودا' اشتیاق وطن (Home Sickness) وہ جنون جو کسی صدمہ کی وجہ سے ہو، دمہ، کم عقلی، عام جنون، کند ذہنی، نیند میں چلنا اور بولنا، ہسٹریا، سکتہ، فالج، سرسام، مختلف قسم کے بخار' نقرس' عرق النسا، گٹھیا، طاعون، زہر سگ، زخم، زہر باد، سوءِ ہضم، تنفس وغیرہ۔

اس کے بعد صاحب القدیم والحدیث لکھتے ہیں:

''موسیقی طب کا ایک حصہ ہے جس سے امراض دور کیے

جاتے ہیں۔قدیم زمانے میں شاعری، موسیقی، اور طب تینوں فنون کی واقفیت ایک شخص کے اندر ہونا کمال سمجھا جاتا تھا۔''

''خوش آوازی روح میں صفائی اور دل میں کیف پیدا کردیتی ہے۔بعض اوقات اس کے طفیل بزدل میدان جنگ میں شیر دل بن جاتا ہے۔بخیل سخی ہوجاتا ہے، کثیف میں لطافت اور سخت دل میں نرم دلی پیدا ہوتی ہے۔کمزور قوی اور ظالم عادل بن جاتا ہے۔''

خوارزمی نے موسیقی کا شمار ریاضیاتی علوم میں کرتے ہوئے لکھا ہے ''یہ یونانی زبان کا لفظ ہے، موسیقی کے ایرانی اور عربی نظریوں کا ایک قدیم ترین ماخذ سامی نظریہ تھا اس کے یونانی نظریہ موسیقی پر بہت اثرات پڑے تھے۔ پہلی صدی ہجری/ ساتویں صدی عیسوی میں عربوں اور یونانیوں کے نظریہ موسیقی کی واضح جھلکیاں نظر آتی ہیں۔'' عربوں کی موسیقی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ طلوع اسلام کے بعد عربوں کی موسیقی عمومی طور پر زمانہ جاہلیت کی تہذیب کے ورثے کی صورت میں سامنے آئی۔ سقوط بغداد کے بعد جب مسلمانوں نے دوسرے ممالک میں فتوحات حاصل کیں تو دوسری اقوام کے ساتھ میل جول کی وجہ سے عربی موسیقی میں بھی تبدیلی آئی۔ پہلی صدی ہجری میں عربی موسیقی ایرانی اور شامی موسیقی سے اثر پذیر ہوئی اور نئی اصطلاحات پیدا ہوئیں۔ بنو عباس کے دور خلافت کی پہلی صدی میں عربوں نے ثقافتی اعتبار سے علم وفن کے ہر میدان میں بے حد ترقی کی دوسرے عباسی خلفاء بھی موسیقی کے دلدادہ تھے ان کے درباروں میں فن موسیقی کے ماہروں اور مغنیوں کی عزت افزائی کی جاتی تھی۔ مامون کے عہد میں علم موسیقی کے موضوع پر یونانی کتابوں کا ترجمہ عربی زبان میں ہوا۔ موسیقی میں ایک اور انقلاب ترکمانی سلاطین کے نظام حکومت سنبھالنے سے ہوا جو تقریباً ڈیڑھ صدی تک برسراقتدار رہے اسی زمانے میں عربی موسیقی پر ایرانی اثرات بھی خوب پڑے۔

شامی موسیقی: کہا جاتا ہے کہ شام میں اسلام کے طلوع ہونے سے کلیسائی موسیقی پر بھی اثرات پڑنے شروع ہوئے شامی کلیساؤں میں دعائیں بھی عربی زبان میں پڑھی جانے لگیں۔بنوامیہ کی جگہ عباسی خلفا کے حکمران ہونے سے دار الحکومت ایران منتقل ہوگیا۔ یہاں ایرانی تہذیب کے غلبے سے موسیقی اور فنون لطیفہ بھی متاثر ہوئے تاہم شام میں قدیم حجازی استادوں کی موسیقی مقبول رہی۔

مغربی موسیقی: جب مسلمانوں نے مغرب کے علاقوں کو فتح کرنا شروع کیا تو مغرب کے ان علاقوں میں مشرقی موسیقی کے اثرات آتے گئے۔ چھٹی صدی ہجری / بارہویں صدی عیسوی میں مغرب کی موسیقی کو کافی ترقی ملی اس ترقی کی وجہ سقوط قرطبہ کے بعد اندلس کے تارکین وطن کا تلسمان میں آباد ہونا ہے۔ اندلس میں آخری اسلامی حکومت کے خاتمے کے بعد غرناطہ کے پناہ گزینوں کے آنے سے مغرب کی موسیقی کو ترقی ملی۔ مغرب کی موسیقی پر بالخصوص مصری اور ترکی اثرات نمایاں ہیں۔مراکش اور تیونس کے علاقوں میں قدیم کلاسیکی موسیقی کے احیا کی کوششیں آج بھی جاری ہیں۔

مصری موسیقی: اسلام سے قبل بھی یہاں فن موسیقی عروج پر تھا، مسلمانوں کی افواج نے جب مصر فتح کیا تو اس کے بعد یہاں اکثر ایسے لوگ حکمران رہے جو موسیقی کے دلدادہ تھے اس دور میں فن موسیقی کی اساس حجاز کی عملی موسیقی پر قائم تھی مصر کے موجودہ موسیقاروں کے خاندان کے بانی مصطفےٰ العقاد نے مصری موسیقی کو ترقی دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ رفتہ رفتہ مقامی موسیقی میں غیر ملکی فن کے پیوند لگنے شروع ہوئے شاہ نواء اول کے آغاز سے شاہ کے ذوق موسیقی اور سرپرستی سے مصری موسیقی کا زریں دور شروع ہوا اور فن موسیقی سے متعلق کئی ادارے قائم کیے گئے۔

عراقی موسیقی: سقوط بغداد کے بعد موسیقی کا کلاسیکی دور ختم ہوگیا۔ آخری خلیفہ کے دربار کے مغنی صفی الدین عبدالمومن کو ہلاکو کے وزیر شمس الدین جوینی کی ملازمت قبول کرنی پڑی۔ خاندان جوینی ایرانی النسل تھا اور اس کے بھی افراد علم موسیقی کی سرپرستی کرتے تھے۔ سلطان مراد چہارم نے جب عراق کو دوبارہ فتح کیا تو اس نے شاہ قل کو اپنا درباری مغنی بنایا اور اسے اپنے ساتھ استنبول لے گیا۔ اس وقت سے ترکی تہذیب اور اس کے طور طریقے عراق میں داخل ہوگئے اور موسیقی بھی ترکی طرز پر ترقی کرنے لگی۔

ایرانی موسیقی: چوتھی صدی قبل مسیح سے ایران پر یونانی تہذیب وتمدن کے اثرات پڑنا شروع ہوگئے تھے۔ دوسری صدی قبل مسیح کے بعد یونانی زبان وتمدن کو ترک کرکے آرامی زبان وتمدن کو اپنایا گیا مشہور شاعر فردوسی کے شاہ نامے سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ سماجی زندگی میں کسی تقریب کی تکمیل کے لیے گانے بجانے کو لازم سمجھا جاتا تھا۔ صبح اسلام کے طلوع ہوتے ہی سارے عالم میں جو تہذیبی وتمدنی انقلاب آیا اس میں ایرانیوں کا بھی نمایاں حصہ ہے۔ پیانو، گراموفون، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے رواج پانے کی وجہ سے مغربی موسیقی کی زیادہ قدر ہونے لگی اور قدیم طرز موسیقی کو نظر انداز کردیا گیا۔

ترکی موسیقی: ترکی موسیقی کی بنیاد اگرچہ عربی اور ایرانی فن پر قائم ہے تاہم اس کی تہہ میں اوغز تہذیب بھی نظر آتی ہے۔ عثمانی قبیلے کے لوگ بلوتی مملکت کے وارث بنے، عثمانی ترک ہمیشہ سے جنگی موسیقی میں مہارت رکھتے تھے۔اس لیے ترکوں کی موسیقی دوسرے ملکوں پر بھی اثر انداز ہوتی رہی۔ ترکی میں پانچویں صدی ہجری کے اواخر اور چھٹی صدی ہجری کے آغاز میں سلسلۂ درویشیہ کے قیام کی وجہ سے مذہبی موسیقی کو بھی فروغ حاصل ہوا۔گویہ موسیقی صوفی جلال الدین رومی کے سلسلہ درویشیہ جلالیہ سے مستعار لی گئی تھی۔ جب ترکیہ کو جدید سیاسی آئین ملا تو استنبول میں ایک نئے مدرسہ سے جدید ثقافتی دور کا آغاز ہوا۔ جس نے مغربی موسیقی کو مقبول بنانے کے علاوہ مقامی موسیقی کے نہایت قیمتی اور قدیم خزانوں کو محفوظ کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

ترکستانی موسیقی: ازبکستان، قرغزستان اور تاجکستان یعنی قدیم مغربی ترکستان یا ترکمانستان نے موسیقی میں نام پیدا کیا ہے۔ مثلاً چوتھی صدی عیسوی کے رودکی، فارابی، ابوعبداللہ محمد خوارزمی۔ پانچویں صدی ہجری کے ابن سینا۔ آٹھویں صدی ہجری کے محمد بن محمود اور امیر خسرو اور نویں ہجری کے سعید الدین۔ دسویں صدی ہجری کے فخر الدین مجتہدی جنھوں نے موسیقار اعظم صفی الدین عبدالمومن کے نظریوں پر حواشی لکھے اور علی شیر نوائی اور ان کے چچا محمد علی قمر قابی کے علاوہ گیارہویں صدی ہجری میں قاسم بن دوست علی بخاری نے علم موسیقی پر ایک رسالہ شہنشاہ جلال الدین اکبر کے لیے لکھا۔

اندلسی موسیقی: اندلس میں دبستان بغداد کی قدیم عربی موسیقی سقوط بغداد کے بعد کوئی دوسو برس تک قائم رہی۔ اندلس کی فتح کے پچاس سال بعد یہاں فن موسیقی کو فروغ حاصل ہوا زریاب نے اندلسی موسیقی کو پیش کیا اس سے قبل یہاں قدیم موسیقی کا رواج تھا۔ زریاب کی زندگی میں ہی اس سرزمین کی تاریخ میں موسیقی کو بے مثال عروج حاصل ہوا۔ اسپین میں تقریبا آٹھ سو سال تک حکومت کی وجہ سے مسلمانوں کے تہذیبی وتمدنی اثرات کو مٹایا نہ جاسکا اور اندلس کی موسیقی نے اسپین بلکہ یورپ تک اپنے اثرات ڈالے۔

ہند و پاک کی موسیقی: اسلام کے چار بڑے فقہی مذاہب موسیقی کو ایک ممنوع چیز سمجھتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی صوفیوں اور درویشوں کے سلسلہ موسیقی اور رقص دونوں کو اپنے ہاں جائز مانتے تھے۔ سلطان شمس الدین التمش نے اپنے دور حکومت میں فقہا کے دباؤ پر موسیقی کو ممنوع قرار دیا لیکن کچھ عرصے بعد وہ دہلی کے

چشتی درویشوں کے سماع اور وجد سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے موسیقی پر سے پابندی اٹھالی۔ صوفیا کے اس سلسلے کی بنیاد حضرت معین الدین چشتی نے رکھی تھی اور یہ ہندوستان بھر میں مقبول تھا سلطان فیروز شاہ اول رکن الدین نے فن موسیقی کی سرپرستی کی اور پھر پہلے بادشاہ فیروز شاہ ثانی جلال الدین نے بھی فن موسیقی کی سرپرستی کی۔ امیر خسرو، فیروز شاہ ثانی، جلال الدین اور سلطان غیاث الدین کے دربار سے بھی وابستہ رہے ہیں۔ خاندان سادات کے زمانے میں موسیقی کو درباری اور عوام کی زندگی میں بدستور اہمیت حاصل رہی تاریخ مبارک شاہی میں لکھا ہے کہ ''سلطان مبارک شاہ موسیقی کا بہت شیدا تھا۔'' لودھی خاندان کے عہد حکومت میں فقہا کے کہنے پر موسیقی پر کچھ پابندی بھی رہی لیکن سلطان سکندر لودھی نے خصوصی طور پر اپنے لیے چار ایسے غلام رکھے تھے جو اس کے ذوق موسیقی کی تسکین کرتے تھے۔ سوری خاندان کے بادشاہ بھی موسیقی کے دلدادہ تھے اسلام شاہ سوری اور عادل شاہ سوری نے فن موسیقی کی خصوصی طور پر سرپرستی کی سلطان عادل شاہ گانے بجانے کے فن میں اس قدر ماہر تھا کہ موسیقی کا مشہور اور نامور استاد تان سین بھی اس سلطان کا شاگرد ہونے کا فخر سے اظہار کرتا تھا۔ کشمیر راگوں کے لیے مشہور ہے، سلاطین کشمیر کے ایک بادشاہ زین العابدین کے عہد میں موسیقی پر کافی کتابیں لکھی گئیں۔ دکن میں بہمنی خاندان کے بادشاہوں میں سے تاج الدین فیروز شاہ کو موسیقی سے خاص شغف تھا۔ بہمنی خاندان سے احمد شاہ ولی، علاء الدین احمد شاہ ثانی، محمد شاہ ثانی اور محمود شاہ ثانی نے اپنے درباروں میں مستقل معروف مغنیوں اور رقص و موسیقی کی ماہر لڑکیوں کو مامور کیا تھا۔ بیجاپور کی ریاست کے بادشاہ یوسف عادل شاہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ موسیقی میں اس کا ذوق اور کمال اس درجہ کا تھا کہ اس دور کے ماہر فن اس سے مات کھا جاتے۔ کیونکہ وہ کئی ساز نہایت خوبصورتی سے بجاتا تھا۔ ابراہیم عادل شاہ اول اور ثانی کے زمانے میں بھی موسیقی کو کافی فروغ حاصل ہوا ابراہیم عادل شاہ نے فن موسیقی پر ایک کتاب نورس لکھی تھی۔

مغلیہ دور حکومت میں فن موسیقی کو بہت عروج حاصل ہوا۔ اس سلطنت کے بانی اور پہلے شہنشاہ بابر نے موسیقی کی فضا میں پرورش پائی تھی۔ کیونکہ ان کے تایا سلطان احمد مرزا کے دربار میں فن موسیقی کے ماہرین کا جمگھٹا رہتا تھا۔ قیام کابل کے ابتدائی ایام میں بابر کے دربار میں مشہور مطرب علی شیر نوائی کے تعلیم و تربیت یافتہ شاگرد قل محمد عودی، حسین عودی اور شیخ تابی جیسے موسیقار موجود تھے۔ نصیر الدین ہمایوں بھی اپنے باپ کی طرح موسیقی کا حامی اور مربی تھا عہد ہمایوں میں موسیقار اور فن ''اہل مراد'' میں شامل تھے۔ مغل شہنشاہ اکبر کے زمانے کی موسیقی زمانہ ماضی کی موسیقی پر بھی سبقت لے گئی بلکہ اس کے بعد بھی اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ ابوالفضل نے موسیقی کے نظری اور عملی پہلوؤں پر اپنی کتاب 'آئین اکبری' میں سنگیت کے نام سے ایک باب مخصوص کیا ہے۔ آئین اکبری میں موسیقی کے متعلق تفصیلی احوال بھی بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے موسیقار سات زمروں میں منقسم تھے اور ہر ایک کے مظاہرے کے لیے ایک ایک دن مقرر تھا۔ یہ سب موسیقار دنیائے اسلام کے مختلف ممالک سے آئے تھے۔ شہنشاہ جہانگیر بھی ہر قسم کی موسیقی کا دلدادہ تھا شاہ جہاں کے عہد میں موسیقی دربار اور عوامی سطح پر تفریح کا ذریعہ بن چکی تھی۔

شاہجہاں نے گوالیار کے مشہور شاعر بخشو کی تمام تصانیف کا مجموعہ تیار کرنے کا حکم دیا تھا۔ یہ مجموعہ ایک ہزار دھرپدوں پر مشتمل تھا جس میں چار راگ اور چھیالیس راگنیاں شامل تھیں۔ لیکن ان کے فرزند اورنگ زیب نے حکومت سنبھالنے کے بعد موسیقی کے متعلق سخت روش اختیار کی اور موسیقی متروک ہوگئی۔ گو موسیقی کا عمل ممنوع تھا لیکن موسیقی کے علم و فن پر اورنگ زیب کے دور میں بھی کئی کتابیں لکھی گئیں۔ اس کے بعد اورنگ زیب کے جانشین شاہ عالم بہادر شاہ اول نے موسیقی کو دربار اور عوام میں دوبارہ مقبول عام بنایا خانہ جنگی کے ہنگاموں اور مغلیہ سلطنت کے روبہ زوال ہونے کے باوجود موسیقی کو فروغ حاصل ہوتا رہا۔ مشہور فرانسیسی فاضل جو ہندوستانی موسیقی پر ایک مستند مصنف مانا جاتا ہے لکھتا ہے ''بارھویں صدی ہجری / اٹھارویں صدی عیسوی کے آخر سے برطانوی عہد میں ممتاز اور دولتمند خاندانوں کی سرپرستی سے علم موسیقی کے ساتھ ساتھ دوسرے علوم و فنون میں از سر نو جان پڑ گئی۔'' برطانوی دور حکومت میں کلاسیکی موسیقی کے تحفظ کے سلسلے میں عبدالکریم خان، مہربان خان، ولایت خان، امام الدین خان، فیاض خان، عاشق علی خان، اور عبدالوحید خان جیسے معروف مسلمان موسیقاروں کے نام کافی نمایاں تھے۔ کرانا، پٹیالہ اور شام چوراسی کے گھرانوں نے موسیقی کے مختلف اسالیب کو بنانے اور سنوارنے میں قابل ذکر کردار ادا کیا ہے۔

قرآن میں بے شمار جمالیات کا ذکر موجود ہے۔ لیکن سماجی جمالیات یعنی نغمہ و موسیقی کا کوئی ذکر موجود نہیں نہ عتانہ اسماتا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ قرآن نے جہاں جہاں جنت کے انعامات کا ذکر کیا ہے وہاں اس کی نغماتی نعمت کا بھی ذکر آیا ہے ارشاد ہے۔

قران میں موسیقی: پہلی آیت: ادخلوا الجنة انتم و ازواجکم تحبرون. (70:43)

تم اور تمھارے جوڑے جنت میں جاؤ جہاں تمھیں نغمے سنائے جائیں گے۔

دوسری آیت: فاماالذین آمنو و عملو الصلحت فھم فی روضة یحبرون (15:30)

جو لوگ ایمان لائے اور اس کے مطابق عمل کیے وہ چمن میں نغمے سن رہے ہوں گے۔

عربوں کے ہاں بھی موسیقی کی بہت زیادہ قدر و قیمت تھی اس کا اندازہ الف لیلہ اور ابوالفرج اصفہانی کی کتاب الافانی سے ہوسکتا ہے۔ ان کے سازوں کی کثرت سے بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ موسیقی کے رسیا تھے۔ عربی کے چند سازوں کے نام حسب ذیل ہیں (1) عُود (2) بُوق (3) دف (4) اُرغنون (5) نُزھہ (6) زمر (7) جُواق (8) شاہ رُود (9) نفیر (10) طبل (11) رباب (12) مغنی (13) شبابہ (14) صفارہ اور (15) زلامی۔ موسیقی پر ایران اور روم کا اثر بھی پڑا۔ ابن مسجاح پہلا عرب موسیقار تھا جس نے ایرانی و رومی موسیقی کو ملانا چاہا اس کے ڈیڑھ سو برس بعد عربی موسیقی کو فیثا غوری اصولوں کے مطابق ڈھالنے کی کوشش اسحاق موصلی نے کی اور پھر یونانی اور دیگر اثرات پڑتے گئے۔

اوائل اسلام میں عربوں کے ہاں چار قسم کے گیت بہت مقبول تھے عشقیہ گیت جن کو چالیس سال کی عمر تک ہر شخص عموماً خود گاتا اور بعد میں دوسروں سے سنتا تھا، جنگی گیت جنھیں شاعر، مطرب، مجاہد، سب ہی جنگ کے وقت گاتے تھے۔ کاروانی گیت یعنی سفر کے موقع پر گائے جانے والے گیت اور مذہبی گیت جنھیں عہد جاہلیت کے عرب قربانی، دعا اور پرستش اصنام کے وقت گایا کرتے تھے۔ اس زمانے میں گانا صرف عورتوں کا کام تھا۔ شاعر لحن سے کام لیتے تھے اور یہ آج بھی باقی ہے۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد یہ حد بندی ختم ہوگئی اور مرد بھی سر تال کے ساتھ گانے لگے ان میں مدینے کا رہنے والا طویس سب سے پہلا مطرب تھا (مذکورہ بالا تفاصیل نیاز فتح پوری کی علمائے اسلام مطبوعہ 1955 سے ماخوذ ہیں)

■

Dr. Mohd Shujaat Ali Rashid, Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad

منظر کاظمی

عید میلاد النبی پر خاص

سیاہ غلاف اور کالے جرنیل

منظر کاظمی (پیدائش۔ 24 ستمبر 1940 انتقال۔ 12 اکتوبر 2000) کا تعلّق جدید افسانہ نگاروں کی اس نسل سے ھے جنھوں نے اردو کو خوبصورت افسانے عطا کیے۔ انھوں نے اپنے افسانوی سفر کا آغاز 1959 میں کیا ۔ ان کا پہلا فسانہ ' زھر کی پوٹ' جام نو، دھنباد میں شائع ھوا تھا۔ جو بالکل روایتی قسم کا افسانہ تھا۔ اصل پھچان 65-1962 کے درمیان بنی۔ جب انھوں نے روایتی افسانوں سے خود کو الگ کیا ۔افسانہ 'مچکی' (رسالہ، راوی، مارچ اپریل 1963) نے انھیں ایک پھچان دی۔ اسی زمانے میں ان کا ایک افسانہ 'شب رنگ' الہ آباد میں 'سیاہ غلاف اور کالے جر نیل' کے نام سے شائع ھوا، جس نے منظر کاظمی کو وہ وقار عطا کیا کہ آج بھی اس افسانے کو ایک ایسی اھمیت حاصل ھے کہ کئی ناقدین اسے اب تک سیرت پاک پر لکھی کھانیوں میں سب سے بھتر کھانی تسلیم کرتے ھیں۔ منظرکاظمی کی افسانہ نگاری پر پی ایچ ڈی کرنے والے ڈاکٹر اختر آزاد کے مطابق کئی ناقدین نے تو یہ بھی کھا کہ اگر منظر کاظمی صرف یھی افسانہ لکھتے، تب بھی وہ اردو افسانے میں باقی رھتے۔ (ادارہ)

کوئی شے جب ملنے والی ہوتی ہے تو اس طرح ملتی ہے کہ سینہ چاک کر کے اس میں سے کچھ نکال لیا جاتا ہے اور اس کے بعد ایسا ہوتا ہے کہ بہت کچھ مل جاتا ہے۔ اتنی سی بات لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی کہ ہمارے یہاں سب کچھ ہونے کے بعد بھی کچھ نہیں ہوتا اور ایک آدمی ایسا بھی تھا کہ اس کے پاس کچھ نہیں تھا پھر بھی بہت کچھ تھا اسے وہ لوگوں میں تقسیم کرتا تھا اس وقت ایسے لوگ بھی تھے جنھوں نے اس دولت کو حقیر سمجھا اور اپنا منہ پھیر لیا اور ایسے لوگ بھی تھے جنھوں نے اس کی قدر جانی اور گھٹنوں کے بل جھکے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ایک شخص کو دن بھی تاریک نظر آتا ہے اور دوسرے کے لیے رات بھی روشن ہے۔

بہت دنوں پہلے کی بات ہے کہ آسمان تک اُٹھتی ہوئی گرد کے نیچے نیچے چلنے والے قافلے کے ساتھ ایک بچّہ بھی سفر کرتا تھا اور وہ اپنے گھر لوٹا دیا جاتا تھا کہ لوگ اسے مار ڈالیں گے۔ اس واقعہ کی روشنی میں ہم نے جانا کہ بڑے ہو کر ہم کیا کریں گے۔ اس کا پتہ کبھی کبھی بہت پہلے ہو جاتا ہے۔ کیا یہ سچ نہیں کہ ایک شخص بچپن ہی سے اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی دنیا کو حیرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور ہنگاموں سے دور بھاگتا تھا اور کھیل کود سے الگ رہتا تھا اور اپنی آنکھیں نیچی رکھتا تھا اور کھانے پینے کا سامان لے کر شہر سے دور نکل جاتا تھا اور کھلے میدان میں اونچی جگہ کی تلاش کرتا تھا اور اس کے نیچے بیٹھ جاتا تھا اور سوچتا تھا اور یہ کام بڑی پابندی سے کرتا تھا اور ایسے ہی میں ایک دن اس کا پورا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا۔ پھر معلوم ہوا کہ وہ شخص بچپن ہی سے خاموش کیوں رہتا تھا اور اپنے ارد گرد پھیلے ہوئے جال کو حیرت کی نگاہ سے کیوں دیکھتا تھا۔

اس سے پہلے یہ ہوا تھا کہ ایک طرف ہزاروں کی تعداد میں بپھری ہوئی فوج تھی اور دوسری طرف کوئی نہ تھا۔ سب لوگ پہاڑوں میں جا چھپے تھا اور روتے تھے اور ان پر خوف طاری تھا۔ ادھر یہ بپھری ہوئی فوج کالے کالے جرنیلوں کے ساتھ لڑائی پر آمادہ تھی لیکن ان کے مقابلے میں کوئی نہ تھا۔ ایک گھر تھا اور وہاں سیاہ غلاف تھا اور یہ چاہتے تھے کہ اس سیاہ غلاف سے پھوٹنے والی روشنی کو ہمیشہ کے لیے بجھا دیں لیکن ان کے ساتھ ایسا ہوا کہ مقابل میں کوئی نہ تھا پھر بھی ان کے سروں پر کالے کالے بادل امڈ آئے اور وہ جب برسے تو بپھری ہوئی فوج حیران رہ گئی۔ طاقت کے زعم میں ڈولتے ہوئے کالے کالے جرنیل بھی بھاگ کھڑے ہوئے تو دیکھا یہ گیا کہ مقابل میں کوئی بھی ہو پھر بھی فتح ان ہی کی ہوتی ہے جن کو ہونا ہوتی ہے اور یہ بات بھی دیکھی گئی کہ تعداد کوئی جنس نہیں ہوتی اور مقصد سے بڑا کوئی جرنیل نہیں ہوتا۔ ایک طرف ہزاروں کی تعداد میں بپھری ہوئی فوج اور کالے کالے جرنیل اور دوسری طرف کوئی نہیں۔ لیکن فتح ان کو ملی جو اپنے شہر سے دور پہاڑوں میں چھپے بیٹھے تھے اور روتے تھے اور خوف زدہ تھے۔ یہ کتنی عجب بات ہے؟ ہوتا یہ ہے کہ کچھ باتیں آنے والی بہت ساری باتوں کی پیشن گوئی کرتی ہیں۔ اس دن بھی یہی ہوا تھا کہ اس واقعہ کے کچھ دنوں بعد وہ شخص دکھائی دیا جو خاموشی کے ساتھ اپنی حیرت بھری نگاہیں لیے اپنے ہم عمروں کے درمیان بیٹھا رہتا تھا اور اس کے ساتھی کھیلتے تھے۔ ہنگامے کرتے تھے اور شور مچاتے تھے اور ساتھیوں کے درمیان خاموش رہنے والے اس شخص نے جب آنکھ کھولی تو اپنی ماں کو سامنے پایا اور باپ کو زندگی میں کبھی نہیں دیکھا اور شہر سے نکل کر جب وہ اپنے باپ سے ملنے گیا تو ماں نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ پھر وہ بڑی حیرت سے ارد گرد پھیلے ہوئے جال کو دیکھتا رہا۔ کچھ دنوں بعد جب اس لائق ہوا کہ آسمان تک بلند ہوتی ہوئی گرد کے نیچے نیچے چلنے والے قافلے کے ساتھ آگے بڑھے تو راستے سے لوٹا دیا گیا کہ لوگ اسے مار ڈالیں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ پشت پر اگر چاند چمکتا ہو تو لوگ چہرہ دیکھ کر جان لیتے ہیں کہ اسے گھر لوٹ جانا چاہیے۔

تھوڑی سی مدت اور گزر گئی تو وہ شخص آسمان تک بلند ہوتی ہوئی گرد کے نیچے نیچے چلنے والے قافلے کے ساتھ ایک بار پھر آگے بڑھا۔ اس بار بھی یہ ہوا کہ پشت پر چمکنے والے چاند کی وجہ سے اس کا چہرہ پہچان لیا گیا مگر وہ راستے سے لوٹ کر نہیں آیا اور جب لوٹ کر آیا تو وہ عورت بہت خوش ہوئی جو اپنے شہر میں بہت مالدار تھی اور اس کا کوئی نہ تھا اور تب یہ ہوا کہ وہ شخص اس کا سب کچھ بن گیا۔ اونچی زمین کے نیچے بیٹھے بیٹھے جو ایک دن اس کا پورا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا تو یہی عورت تھی جس نے اس کی ہمّت بڑھائی اور اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس کا دل گھبراتا تھا کہ اس نے باپ کو کبھی نہیں دیکھا اور ماں بھی ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ گھر میں ایک شخص تھا جو اس کے جسم کی حفاظت کرتا تھا مگر وہ پسینے میں شرابور ہو گیا تو یہی عورت تھی جس نے اسے سینے سے لگایا اور بھروسہ قائم کرنے کو کہا۔ پھر وہ ایک ایسے آدمی کے پاس گئی جو بڑا علم رکھتا تھا اور پچھلی باتوں کی روشنی میں اگلی باتیں بتایا کرتا تھا۔ ساری باتیں سن کر وہ علم والا بوڑھا شخص بہت خوش ہوا مگر یہ سوچ کر اس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں کہ آنے والے ضرورت مند دنوں میں وہ اس کا ساتھ نہ دے سکے گا اور وہ عورت یہ جاننے کے بعد بھی کہ آنے والا دن بڑا ضرورت مند ہوگا۔ خوش خوش گھر لوٹی اور اسے اپنے سینے سے لگایا اور بھروسہ قائم کرنے کو کہا۔

پھر اس شخص نے ایک بات سیکھی اور ضروری سمجھا کہ اسے دوسروں کو سکھائے لیکن جب اس نے اپنی سیکھی ہوئی بات دوسروں کے سامنے بیان کی تو وہ ہنسنے لگے۔ اس کی

بات سب سے پہلے اس نے مانی جو یہ جانتی تھی کہ آنے والا دن بڑا ضرورت مند ہوگا اور اس شخص نے مانی جو ہر بات کی تصدیق کیا کرتا تھا اور اس شخص نے مانی جو حکم بجا لاتا تھا اور اس شخص نے مانی جو بہت کم عمر تھا اور وہ کہ اس کے جسم کی حفاظت کرتا تھا مجبور تھا بقیہ سارے لوگ ہنستے تھے اور نصیب ان پر روتا تھا۔ شہر کی سب سے اونچی جگہ پر اس شخص کی آواز جو ایک نیچے مکان میں رہتا تھا، ابھری اور ابھرتی ہی چلی گئی تو وہ لوگ جو اونچے مکان میں رہتے تھے۔ ان کی بھنویں تن گئیں اور ایسے ہی میں ایک واقعہ یہ ہوا کہ وہ شخص مر گیا جو اس کے جسم کی حفاظت کرتا تھا اور وہ بھی مر گئی جو اسے بھروسہ قائم کرنے کو کہتی تھی پھر جو اس شخص نے چاروں طرف دیکھا تو اپنے آپ کو بالکل تنہا پایا۔ لیکن ایک بات جو اس نے سیکھی تھی اسے دوسروں کو سکھانا ضروری تھا اور وہ جانتا تھا کہ تعداد کوئی جنس نہیں اور مقصد سے بڑا کوئی جرنیل نہیں۔

تب اس نے گھر چھوڑ دیا۔ اس بار کوئی گرد آسمان تک بلند نہیں ہوئی۔ لیکن اپنے ایک جاں نثار کے ساتھ وہ اپنے شہر سے باہر نکلا اور اپنا سر جھکائے ہوئے تھا کہ ایک دن اسے لوٹ کر آنا تھا اور اپنے سر کو بلند رکھنا تھا۔

پھر لوگوں نے دیکھا کہ ایک دن وہ شخص وہاں آکر ٹھہرا جہاں کوئی کنواں نہ تھا اور کچھ لوگوں نے اس کی باتیں سیکھ لی تھیں۔ سیاہ غلاف سے پھوٹنے والی روشنی کو دیکھنے کی تمنا نے انہیں بے چین کر رکھا تھا۔ لیکن وہ کیا کرتے کہ وہاں تک جانے والے راستوں پر اونچے مکان والوں نے تاریکی پھیلا رکھی تھی اور یہ بڑھتی ہی جا رہی تھی، اور وہی تاریکی جب اس جگہ پہنچ گئی جہاں کوئی کنواں نہ تھا تو پھر ایسا ہوا کہ وہ شخص بھی جس کی ٹانگیں کمزور تھیں اس نے مقابلے میں اپنے بڑے بھائی کو دیکھا اور وہ شخص جو تصدیق کیا کرتا تھا اس کے مقابلے میں اس کا جوان بیٹا تھا اور وہ شخص کہ جس نے باپ کو زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا اس کے سامنے اس کا چچا تھا لیکن اس دن بھی یہی ہوا کہ کوئی جنس باقی نہیں رہی اور مقصد سب سے بڑا جرنیل ثابت ہوا۔

پھر ایک دن ایسا ہوا کہ وہ شخص اپنی باتیں بہت سارے لوگوں کو سکھا چکا تھا اور سیاہ غلاف سے پھوٹنے والی روشنی کو دیکھنے کی تمنا نے انہیں اور بھی بے تاب کر رکھا تھا لیکن راستے کی سیاہی اور بھی گہری ہوتی جا رہی تھی تب یہ ہوا کہ وہ شخص اور وہ لوگ جو اس کی باتیں سیکھ چکے تھے گھر سے نکل پڑے اور ایک اونچی زمین کے نیچے دور دور تک پھیل گئے۔ اپنی پشت پر چاند لے کر چلنے والے نے سب سے پہلے اپنی نگاہیں آسمان کی طرف اُٹھائیں۔ پھر اپنے چند ساتھیوں سے کہا کہ وہ ہر حال میں اپنی جگہ پر قائم رہیں اور اپنے دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ سیاہ جھیل میں کود پڑا کہ وہاں روشنی کی سخت ضرورت تھی۔ یہ سیاہ جھیل اس دن خشک ہوجاتی مگر وہ لوگ جن کو ہر حال میں اپنی جگہ پر قائم رہنے کو کہا گیا تھا انھوں نے ایسا نہیں کیا اور ایک زبردست موج جو سیاہی اس راہ میں داخل ہوگئی اور اونچی زمین کے نیچے دور دور تک پھیلے ہوئے بہت سارے چراغ کا سارا تیل اپنے اندر انڈیل لیا اور دوسرے کئی چراغوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور ان ٹکڑوں کو اپنے گلے کا ہار بنایا تو دیکھا یہ گیا کہ نتیجہ برآمد ہونے تک اپنی جگہ پر ہر حال میں قائم رہنا چاہیے۔ بدلتے ہوئے حالات کا رخ چاہے جتنا بھی روشن ہو۔ اس واقعہ کے بعد وہ شخص جو اپنی پشت پر چاند لے کر چلتا تھا بہت مغموم ہوا۔ شہر میں سارے لوگ روتے تھے مگر اس کے گھر میں کوئی رونے والا نہ تھا۔ حالانکہ وہ چراغ اس کے گھر کا تھا جس کا سارا تیل سیاہ جھیل کے رکھوالے کی بیوی نے اپنے اندر انڈیل لیا تھا۔ پھر اس کے ساتھیوں نے اپنی عورتوں کو اس کے یہاں بھیجا کہ جا کر روئیں اور اس کا دل رکھیں مگر یہ بات اسے ناپسند ہوئی۔ وہ ان باتوں کا علم رکھتا تھا کہ اندھیرے اور گہرے کنویں سے چاند کس طرح برآمد ہوتا ہے اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ بپھری ہوئی فوج کے مقابلے میں کوئی نہیں ہوتا۔ پھر بھی فتح ان کی ہوتی ہے جو پہاڑوں میں جا چھپتے ہیں اور اسے اس بات کی بھی خبر تھی کہ بصارت کھو دینے سے کچھ نہیں ہوتا کہ بصیرت زیادہ ضروری ہے۔ نتیجے کے طور پر دور دور تک پھیلی ہوئی گرد ایک بار پھر سے آسمان تک بلند ہوگئی۔

سیاہ غلاف سے پھوٹنے والی روشنی انھیں اپنی طرف بلاتی تھی اور یہ چاہتے تھے کہ اور کچھ نہیں تو کم از کم ایک نگاہ اس روشنی کے مینار پر ڈالیں اور واپس ہو جائیں لیکن سیاہ جھیل کے رکھوالے کو یہ بات بھی گوارا نہ تھی۔ اس نے راستہ روک دیا تو روشنی کے دیوانے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے حالانکہ وہ شخص جس کی پشت پر چاند چمکتا تھا اگر چاہتا تو سیاہ جھیل کو پار کرسکتا تھا لیکن یہ بات اسے کبھی اچھی نہیں لگی کہ گھر میں آگ لگا کر اس سے اُٹھنے والے شعلوں کو حسین کہا جائے اور جب روشنی کے مینار کو دیکھے بغیر وہ واپس ہوا تو اس کے ساتھی مغموم ہوگئے اور اپنے آپ کو شکست خوردہ کہنے لگے لیکن اس شخص نے بتایا کہ اپنی آنکھیں کھلی رکھو اور دیکھو کہ وہ چیز جو بظاہر تمہیں شکست معلوم ہوتی ہے اپنے اندر فتح کی زبردست صلاحیت رکھتی ہے۔

قافلے جب بھی گذرتے ہیں گرد آسمان تک اُٹھتی ہے لیکن اس بار جو روشنی کے دیوانے آگے بڑھے تو اس طرح بڑھے کہ سارا آسمان کھلا گیا۔ سیاہ جھیل سمٹ کر نقطہ بن گئی اور اس کے رکھوالے کی آنکھیں چندھیا گئیں پھر بھی کثیر تعداد میں ہونے کے باوجود وہ شخص اس بات کو نہیں بھولا کہ تعداد کوئی جنس نہیں ہوتی اور یہ بات بھی اسے یاد رہی کہ مقصد سے بڑا کوئی جرنیل نہیں۔ بہت دنوں پہلے وہ شخص اس شہر سے سر جھکائے ہوئے نکلا تھا کہ اسے اپنا وطن چھوڑنا پڑا تھا اور آج بھی کہ اس کا سر اتنا جھکا ہوا تھا کہ اونٹ کے کوہان سے جا لگا تھا اور فتح مندی اس کے قدموں کی ٹھوکر میں تھی۔ مگر وہ جانتا تھا کہ گھر میں لگی ہوئی آگ سے اُٹھنے والے شعلے کبھی حسین نہیں ہوتے۔

اس نے اعلان کر دیا کہ وہ سارے لوگ اس کے دوست ہیں جو سیاہ غلاف کے اردگرد جمع ہو گئے ہیں اور وہ بھی اس کا دوست ہے جس نے سیاہ جھیل کی رکھوالی چھوڑنے والے کو اپنا دوست بنا لیا ہے۔ اتنے سارے واقعات اور یہ ڈھیر ساری باتیں تم بھی جانتے ہو ہم بھی جانتے ہیں، سارے لوگ جانتے ہیں۔ مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اتنا کچھ جان لینے کے بعد بھی روشنی کے دیوانے کالے کالے جرنیلوں سے خوف زدہ کیوں ہیں؟

کہیں ایسا تو نہیں کہ تعداد ان کے یہاں کوئی جنس بن گئی؟

یا زمیں کی پستیوں میں آسمان بن کر رہنے کا فن لوگوں نے بھلا دیا!!

□

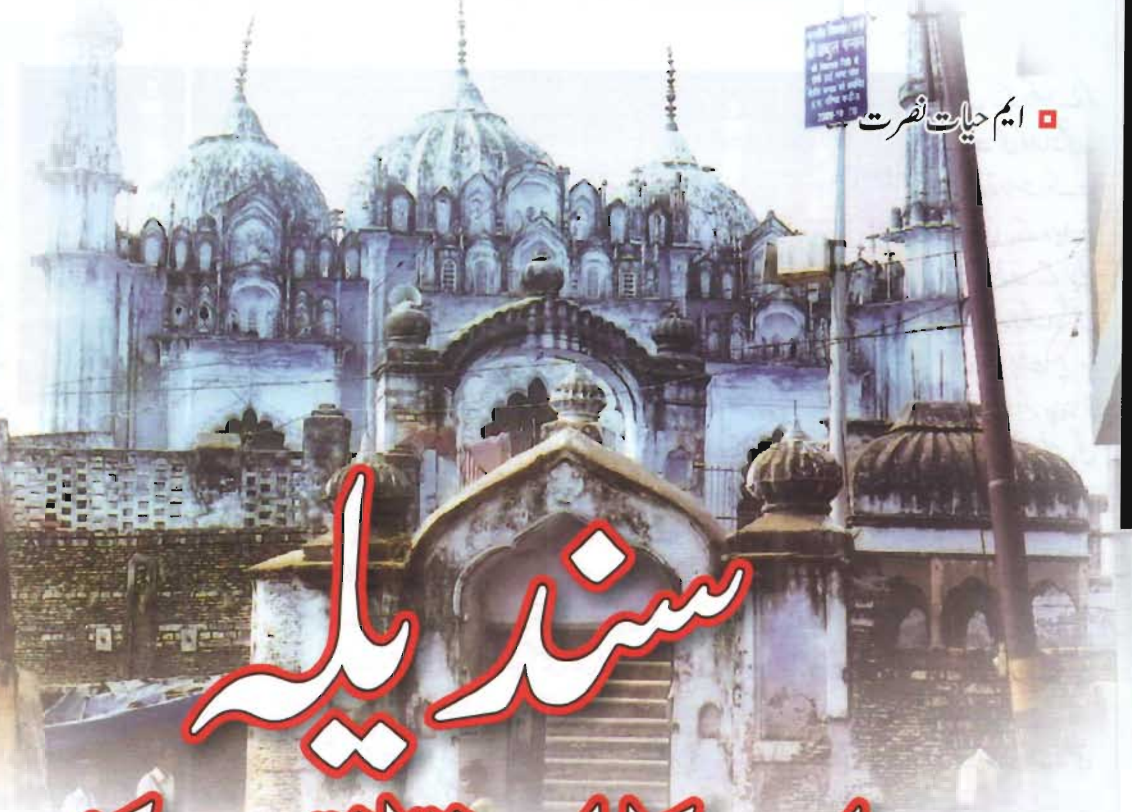

جامع مسجد چودھری حشمت علی محلہ مولوانہ سندیلہ

▫ ایم حیات نصرت

سندیلہ
اردو کا اہم ثقافتی مرکز

شہر علاقے کا تعارف: اتر پردیش کے ضلع ہردوئی کا شہر سندیلہ اپنے آپ میں ایک ادبی و ثقافتی مرکز ہے جو لکھنؤ سے تقریباً 50 کلومیٹر پچھم میں مراد آباد روڈ پر آباد ہے۔ پرانے زمانے میں سندیلہ کا تعلق رشی سانڈلیہ سے رہا ہے یہاں 8 ہجری تا 10 ہجری میں قوم آرکھ کا دور اقتدار رہا۔ اس وقت سندیلہ کا نام شیتل پوروا تھا۔

بادشاہ فیروز شاہ تغلق کے دور حکومت میں 1351 تا 1388 میں حضرت مخدوم علاء الدین نے نائب سپہ سالار کی حیثیت سے شاہی سند لے کر آرکھوں سے جنگ کرنے کے لیے سندیلہ کی طرف کوچ کیا۔ دلی سے آتے وقت راستے میں جمنا ندی پڑنے کی وجہ سے شاہی سند کو چاک کر کے جمنا ندی میں پھینک دیا۔ کہنے لگے کہ میرے لیے اللہ کی سند کافی ہے سندیلہ پہنچ کر آرکھوں کو معزول کر کے فیروز شاہی حکومت قائم کی اور اس کا نام سند اللہ رکھا۔ جو دھیرے دھیرے ترمیم ہو کر سندیلہ بن گیا۔

حضرت مخدوم علاء الدین کا مزار مخدوم پوروا (محلّہ درگاہ شریف) نچلی منڈئی سندیلہ میں موجود ہے۔ ہزاروں عقیدت مند، ہندو مسلم درگاہ پر حاضری دے کر منتوں، مرادوں سے فیضیاب ہوتے ہیں مزار کی برابر مرمت ہوتی رہتی ہے اور اچھی حالت میں موجود ہے۔ عالی شان مسجد میں پانچ گنبد ہیں جس کی دیواریں لگ بھگ ایک میٹر چوڑی ہیں مسجد اچھی حالت میں ہے اور درگاہ مخدوم شاہ کے نام سے مشہور ہے۔

سندیلہ شمال میں 27.08 ڈگری اور پورب میں 80.05 ڈگری میں آباد ہے۔ موجودہ وقت میں سندیلہ لگ بھگ 5 کلومیٹر پچھم میں لگ بھگ 25 کلومیٹر۔ اتر میں 28 کلومیٹر دکھن میں لگ بھگ 22 کلومیٹر میں پھیلا ہوا ہے۔

پورے سندیلہ کی آبادی لگ بھگ ایک لاکھ پچھتر ہزار (1,75000) اور سندیلہ تحصیل کی آبادی لگ بھگ پانچ لاکھ کے قریب ہے۔

تاریخی اہمیت: سندیلہ قرونِ وسطیٰ میں جنگلی علاقے کی شکل میں تھا یہاں سانڈلیہ رشی بھی رہے ہیں محمد غوری کے دور اقتدار میں دو بھائی سلہی ملہی تھے۔ کہاوت مشہور ہے کہ سندیلہ کو سلہی نے اور ملیح آباد کو ملہی نے آباد کیا تھا۔

حضرت مخدوم علاء الدین کی بدولت سندیلہ دہلی حکومت کے زیر اثر آ گیا۔ مخدوم علاء الدین نے شہنجانہ ٹیلہ، صد کھیڑا، مسلمانان گڑھی، دلکی نورنگ گڑھی، نزونہ، سندیلہ قلعہ اور بہت سے علاقوں پر اپنی حکومت قائم کی۔

سندیلہ کا ہندوستان کے خاص شہروں میں اہم مقام ہے۔ شہر کے باہر عالمگیران میدان ہے جو کہ چھوٹی نہر کے کنارے اتر پچھم میں سیتاپور روڈ پر موجود ہے لوگوں کا ماننا ہے کہ کشمیر سے واپسی پر اورنگ زیب عالمگیر اس جگہ پر ٹھہرے تھے۔

صنعت و حرفت: سندیلہ میں کھادی ادیوگ، مٹھائی میں بوندی، لڈو، زردوزی، کشیدہ کاری، اور بیڑی کے کارخانے ہیں جن سے عام طور پر عوام روزی روٹی سے جڑے ہوئے ہیں۔

جہاں تک جدید تعلیم کا تعلق ہے تو سندیلہ میں سب سے پرانا کالج التفات رسول انٹر کالج ہے جو انگریزی اسکول کے نام سے مشہور تھا۔ لگ بھگ 150 سال پرانا ہے اس کے بعد گورنمنٹ گرلس انٹر کالج وجود میں آیا اور اس کے بعد بھگوان بدھ انٹر کالج قائم ہوا۔

لڑکیوں کا سائنسی تعلیم کی کمی کو دیکھتے ہوئے سندیلہ میں کوئی بھی گرلس انٹر کالج نہیں تھا۔ ان کی پریشانیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے چودھری خاندان کے چشم و چراغ ڈاکٹر چودھری محمد حیات نصرت نے سندیلہ گرلس انٹر کالج کی بنیاد 1994 میں ڈالی۔

اس کالج میں اردو اور سائنس کو ضروری مضمون کی حیثیت سے پڑھنے کے ساتھ ساتھ دیگر مضامین کی تعلیم

حضرت مخدوم علاء الدین صاحب محلہ درگاہ شریف نچلی منڈئی سندیلہ ضلع ہردوئی یوپی انڈیا

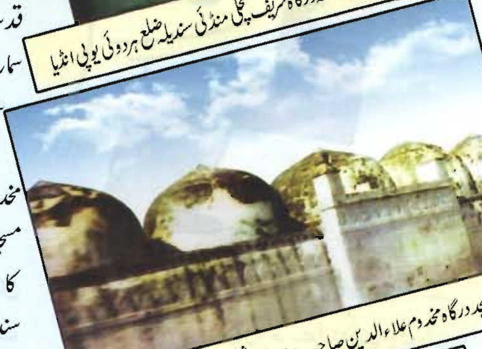
مسجد درگاہ مخدوم علاء الدین صاحب سندیلہ، نچلی منڈئی سندیلہ محلہ درگاہ شریف

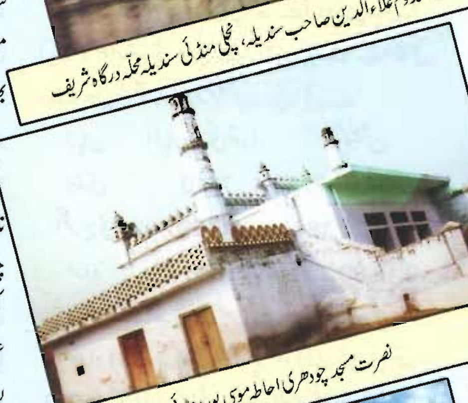
نصرت مسجد چودھری احاطہ موسی پور منڈئی سندیلہ

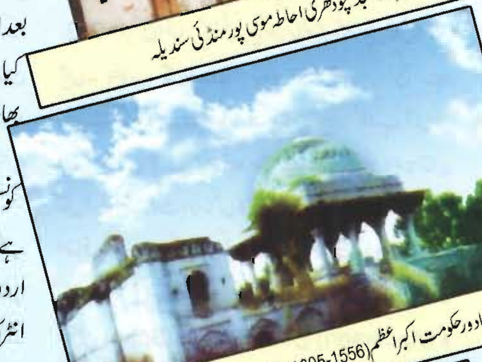
کھمبا دورحکومت اکبر اعظم (1605-1556)، میں 971 ہجری مطابق 1564 میں تعمیر ہوئی۔

ہتیا ہرن کا تیرتھ کلیان من سندیلہ

بھی دی جاتی ہے۔

راجہ درگا پرساد کا خاندان سندیلہ کا مشہور و معروف خاندان رہا ہے۔ جنھوں نے رانی کا شوالہ کی تعمیر کرائی تھی جو آج بھی اچھی حالت میں ہے۔ ان تینوں خاندانوں کا آج بھی سندیلہ کی معروف ہستیوں میں اہم مقام ہے۔

سندیلہ میں مختلف سیاسی پارٹیوں کے ایم ایل اے ہوتے رہے ہیں۔ جن میں کانگریس کی بیگم اعزاز رسول قدسیہ بیگم، بھارتیہ جنتا پارٹی کے راجہ مہاویر سنگھ اور بہوجن سماج پارٹی سے عبدالمنان ایم ایل اے موجودہ دور میں سائنس اور ٹکنالوجی کے وزیر بھی ہیں۔

شہر کی تاریخی عمارتوں میں نچلی منڈئی میں درگاہ مخدوم علاء الدین، مسجد درگاہ، جامع مسجد مہتوانہ، ہمایوں مسجد نچلی منڈئی سندیلہ، نصرت مسجد موسیٰ پور سندیلہ، رانی کا شوالہ سندیلہ، سندیلہ، بارہ کھمبا سندیلہ، سرائے حوض سندیلہ شیتلا مندر کا کنڈ کربلا شریف میں معزالدینؒ کا مقبرہ (بڑے پیر عبدالقادر جیلانی بغداد) شریف کے بھانجے وان کی والدہ محترمہ مدفون ہیں جو کربلا میں وسیع تالاب کے کنارے واقع ہے۔ ہتیا ہرن ایک قدیم تاریخی مقام ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس تاریخی مقام کا پرانا نام رتھولی تھا۔ روایت ہے کہ اس جگہ ایودھیا کے راجہ رام چندر جی کا رتھ آکر رکا تھا۔ کلیان من گرام سے ڈیڑھ کلومیٹر دکھن میں ہتیا ہرن تیرتھ کا تالاب ہے۔ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ راجہ رام چندر جی نے راون کو مارنے کے بعد اس ''پاپ'' سے 'مکتی' کے لیے اسی تالاب میں اسنان کیا تھا۔ اسی سے تالاب کا نام ہتیا ہرن پڑا۔ دسہرہ، اماوسیہ، بھادوں ماہ میں ہر اتوار کو یہاں پر بڑا میلہ لگتا ہے۔

سندیلہ میں اردو تعلیم و تدریس کے تعلق سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کا بہت اہم رول ہے جن کی کاوشوں سے آج سندیلہ کی طالبات بطور خاص اردو کی تعلیم سے فیضیاب ہو رہی ہیں۔ سندیلہ گرلس انٹر کالج اپنے پورے شباب پر غریب نادار طالبات کی خدمت انجام دے رہا ہے۔

کالج میں اردو عربی سینٹر، کمپیوٹر سینٹر، سلائی کڑھائی ڈپلومہ کورسز، فوڈ پریزرویشن اینڈ ٹریننگ سینٹر اور اردو پبلک لائبریری اس کے اہم حصے ہیں جو بیگم حضرت محل ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیرِ نگرانی ہیں۔ کالج بلڈنگ کے تعاون میں مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن نئی دہلی نے بھی اہم رول ادا کیا ہے۔

گزشتہ صدی میں نواب اعزاز رسول، اور راجہ درگا پرشاد نے اپنے دور میں سماج کی بہتری کے لیے اپنی تمام عمر وقف کر دی تھی۔ چودھری نصرت علی نے نصرت مسجد 1899 میں تعمیر کرائی جو آج بھی اچھی حالت میں موجود ہے اور چودھری محمد حیات نصرت اور چودھری، وجیہ نصرت کی نگرانی میں ہے۔

چودھری حشمت علی نے 1849 میں جامع مسجد تعمیر کرائی جو نقش و نگار کے لحاظ سے اہم عمارت ہے۔

نواب اور چودھری خاندان یہاں کے مشہور خاندان ہیں۔ نواب اعزاز رسول سندیلہ کے چیئرمین اور ان کی اہلیہ قدسیہ بیگم سندیلہ کی ایم ایل اے اور مائینارٹی کمیشن کی چیئرمین رہی ہیں سندیلہ میں ہینڈلوم و یونگ سوسائٹی انھیں کی کاوشوں سے قائم ہوئی۔

اردو کی صورت حال: سندیلہ میں اردو بولنے والوں کی آبادی تقریباً 60% ہے۔ کل آبادی تقریباً 75 ہزار ہے۔

سندیلہ میں اردو کی مشہور و معروف ہستیوں میں ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ہیڈ آف ڈپارٹمنٹ اردو شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، ہیڈ آف ڈپارٹمنٹ اردو شعبہ اردو گورکھپور یونیورسٹی، ڈاکٹر شکیل احمد صدیقی، پروفیسر فارسی لکھنؤ یونیورسٹی، ڈاکٹر صبیحہ انور سابق پرنسپل کرامت گرلس ڈگری کالج، موجودہ ممبر اردو اکادمی لکھنؤ اتر پردیش چودھری وجاہت علی ایڈوکیٹ سابق صدر اردو اکادمی لکھنؤ اینڈ فری ڈم فائیٹر، ماسٹر نفیس سندیلوی ادیب، چودھری مسلم سندیلوی ادیب، مولانا حیدر علی، منطق و فلسفی (جن کے شاگرد سمرقند، بخارا میں پھیلے ہوئے ہیں)

راجہ درگا پرساد مہر سندیلوی، خاں بہادر نواب سید التفات رسول ہاشمی، مولانا منظور احمد کوثر سندیلوی ثم جے پوری مسکین سندیلوی، سعید احمد ادیب سندیلوی جیسی معروف ہستیاں سندیلہ کی شان رہی ہیں۔

قومی اردو کونسل نے یہاں فروغ اردو کے سلسلے میں اہم کام کیا ہے۔ اردو کونسل کے ذریعے چلائے جانے والے اردو پروگرام میں طلبا ایک سالہ ڈپلومہ، دو سالہ ڈپلومہ سے مستفید ہو رہے ہیں جس سے سندیلہ میں اردو جاننے والوں کی تعداد ہر سال بڑھتی جا رہی ہے۔ امید ہے کہ اردو کے فروغ اور ترقی کے لیے اس طرح مرکز اپنا اہم رول ادا کرتے رہیں گے اور سندیلہ و دیگر جگہوں کے عوام اردو زبان سے فیضیاب ہوتے رہیں گے۔ شہر میں اردو زبان کے فروغ کے روشن امکان ہیں۔

■

Dr. Ch. M. Hayat Nusrat, Centre Incharge Diploma in Urdu Language & Modern Arabic Centre, Sandila Girls Intermediate College, Sandila Distt. Hardoi (U.P)

امان اللہ

اردو سند یافتہ نوجوانوں کے روزگار کے مسائل

ایک عمومی جائزہ

اردو سند یافتہ نوجوانوں کو اپنے مستقبل سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ دنیا میں سب سے بڑی تعداد چینی زبان بولنے والوں کی ہے، اردو وبولنے والے دوسرے نمبر پر ہیں اور اس کے بعد ہی انگریزی اور دوسری زبانوں کا نمبرآتا ہے۔اردو نے ایک عالمی زبان یا بین الاقوامی زبان کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ بین الاقوامی سطح پر اردو درس و تدریس کو فروغ حاصل ہو رہا ہے۔غیرملکوں میں خصوصاً جہاں اسلامی تعلیمات کو جاننے میں دلچسپی کا رحجان بڑھا ہے وہیں مشرق وسطیٰ اور جنوبی ایشیائی ممالک کی زبانوں سے دلچسپی میں اضافہ ہوا ہے جس میں اردو زبان کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ ورلڈ ٹریڈ سینٹر (World Trade Centre, USA) کی جانب دس سے زائد اردو رسائل شائع ہوتے ہیں۔ امریکہ کے بہت سے یونی ورسٹیوں میں اردو زبان کی تعلیم کی جانب توجہ دی گئی ہے۔ ان میں انڈیانا یونی ورسٹی، لویلا یونی ورسٹی، شکاگو یونی ورسٹی، پرسٹن انسٹی ٹیوٹ فار انٹرنیشنل اینڈ ریجنل اسٹڈیز، اسٹیٹ یونی ورسٹی آف نیو یارک، یونی ورسٹی آف کیلی فورنیا، لاس اینجلس، یونی ورسٹی آف ہوائے اور کولمبیا یونی ورسٹی کے نام نمایاں ہیں۔

اردو پہلے بھی اس ملک کی Lingua Franca یعنی رابطے کی زبان تھی اور آج بھی ہے۔ فلمیں ہوں یا ٹی وی، پارلیمنٹ ہو یا کوئی عام جلسہ اپنی بات کو پر اثر انداز میں پیش کرنے کے لیے اردو کا استعمال ناگزیر ہے۔فلموں کی 90 فیصد زبان اردو ہے۔ اردو ہی کی وجہ سے آج بالی وڈ یعنی ہندی فلم انڈسٹری کو قبول عام حاصل ہے۔

آج صحافت کے میدان میں اردو صحافیوں کی ضرورت کا شدت سے احساس کیا جارہا ہے۔ اردو صحافت میں کارپوریٹ سیکٹر کی آمد سے اردو اخباروں میں ایک تہلکہ مچ گیا ہے۔ اردو صحافت میں سہارا گروپ کے آنے کے بعد ایک دہائی سے بھی زیادہ وقفے تک کسی دوسرے ادارہ نے اس میدان میں داخل ہونے کی جرأت نہیں کی اور ان دنوں میں سہارا واحد ادارہ ہے جو اردو روزنامہ نکالتا ہے اور اس کے بعد کلکتہ سے 'شاردا گروپ آف پبلی کیشنز' کی جانب سے ایک تاریخی اخبار روزنامہ 'آزاد ہند' بھی نکلتا ہے۔ اس طرح کارپوریٹ سیکٹر کے ذریعے اردو اخبار نکالنے سے اردو صحافت کا افق وسیع ہوا ہے اور اس کی وجہ سے اردو صحافت کا کاروبار یا روزگار کا پہلو وسیع اور مستحکم ہوا ہے اور اس میں تجارت کے امکانات بڑھے ہیں۔ آزادی سے قبل صرف ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں سے ہی اردو اخبارات، رسائل و جرائد شائع ہوتے تھے لیکن آج دنیا کے تقریباً چالیس ملکوں سے اردو رسائل اخبار و جرائد شائع ہو رہے ہیں۔

اردو کے سند یافتہ نوجوانوں کے لیے صحافت میں روزگار کے اچھے مواقع حاصل ہیں۔ جس قدر تحریر میں شستگی اور روانی ہوگی اخبار و رسائل میں اسی قدر مانگ ہوگی۔ تحریری صلاحیتوں کے ساتھ اگر عصر حاضر پر گہری نظر ہوگی اور تجزیہ کا ملکہ حاصل ہوگا تو اس شعبہ میں اور ترقی ہوسکتی ہے۔ اگر ہمارے طالب علم ترجمہ نگاری پر بھی دسترس حاصل کرلیں تو اخبار و رسائل میں کافی مانگ ہوسکتی ہے۔ ترجمے کی عام ضرورتوں کے لیے بھی لوگ اخباروں کے دفتروں سے رجوع کرتے ہیں۔ اس طرح ترجمے کا کام اخباروں میں بہت دستیاب رہتا ہے۔

آراین آئی (RNI) کی رپورٹ کے مطابق سال 2010-2011 میں ہندوستان میں شائع ہونے والے اخباروں میں اردو اخبارات تعداد کے اعتبار سے تیسرے نمبر پر ہیں۔ آفسیٹ پریس کی آمد سے اردو کی چھپائی میں ایک خوشگوار تبدیلی ہوئی ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق روزناموں کی تعداد اور سرکولیشن درج ذیل ہے

زبان	اخباروں کی تعداد	سرکولیشن
ہندی	7910	15,54,94,770
انگریزی	1406	5,53,17,184
اردو	938	2,16,39,230

اس کے بعد چوتھے نمبر پر گجراتی اخبارات ہیں جن کی تعداد 761، پانچویں نمبر پر تلگو اخبار جن کی تعداد 603، مراٹھی اخبار چھٹے نمبر پر اور ساتویں نمبر پر بنگالی اخبار ہیں۔ پنجاب میں اردو عام زبان کے طور پر رائج ہے، پنجاب کے دو بڑے اخبارات 'پرتاپ' اور 'ملاپ' اس کی واضح مثالیں ہیں۔ نامساعد حالات کے باوجود ہندوستان میں اردو اخبارات، رسائل و جرائد اور کتب کی اشاعت میں اضافہ ہوا ہے اور یہی اس کی سلامتی کی ضمانت بھی ہے۔

امریکی سفارت خانے سے شائع ہونے والے رسالے اسپین (Span) کے ایڈیٹر اینڈرسن (Anderson) کا کہنا ہے کہ ہندوستان کی اٹھارہ منظور شدہ سرکاری زبانوں میں اردو اور ہندی کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے اور یہی زبانیں ہندوستان بھر میں بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ اس لیے اس امریکی رسالے کا اردو ایڈیشن بھی شروع کیا گیا ہے۔

آزادی کے بعد ہندوستان میں جب آئین یا دستور کا نفاذ ہوا تو اردو زبان کو آٹھویں شیڈول میں شامل کرلیا گیا یہ آئین کے آٹھویں شیڈول میں قومی زبانوں کی فہرست میں تو رکھی گئی لیکن اس کے لیے کوئی علاقہ مقرر نہیں کیا گیا۔ اس کو کشمیر اور ہماچل پردیش کی سرکاری

زبان قرار دیا گیا لیکن کشمیر میں بول چال کی سطح پر ڈوگری، کشمیری اور لداخ میں لداخی زبانیں رائج ہیں۔ ایک رپورٹ کے بموجب اردو زبان میں O-Level اور A-Level کے امتحان دینے والے امیدواروں کی تعداد آٹھ ہزار سے نو ہزار تک پہنچ گئی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بیرونی ممالک میں اردو کی ایک نئی پود تیار ہو رہی ہے۔ امریکہ کے علاوہ برطانیہ، افریقہ، آسٹریلیا اور کناڈا میں بھی اردو کو فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ اردو کے اندر غیر ملکی خیالات، ایجادات اور دریافتوں کو بیان کرنے کے لیے ان کے الفاظ کی جو طلب پائی جاتی ہے وہ اسے دنیا کی دیگر ترقی پذیر زبانوں پر فوقیت دیتی ہے۔ اردو زبان دوسری زبانوں کے الفاظ کو اپنانے میں ذرا بھی جھجک محسوس نہیں کرتی۔ جس صفائی اور ملائمت کے ساتھ انگریزی اور دیگر یوروپی زبانوں کے تکنیکی اور صنعتی الفاظ اردو میں جذب ہو رہے ہیں وہ نہایت حیرت انگیز ہے۔ ایک انگریزی ماہر لسانیات نے اپنی کتاب 'دنیا کی زبان' میں لکھا ہے کہ دو زبانیں دنیا کی معجزاتی زبانیں کہلانے کی مستحق ہیں وہ ہیں ایک اردو دوسری سوہالی۔

اردو کی جہاں لسانی، ادبی اور سماجی اہمیت ہے وہاں اس کی تاریخی اہمیت بھی ہے۔ برصغیر کی بہت سی تاریخی دستاویزات مغلیہ عہد کی ہیں بیشتر فارسی یا اردو میں لکھی گئی ہیں۔ ان دستاویزات کا ترجمہ کرنے اور ان پر تحقیق کرنے کے لیے اس زبان پر مہارت رکھنے والوں کی ضرورت ہے۔ اردو میں اسلامی معلومات کا جو خزانہ ہے وہ عربی زبان کے بعد شاید ہی کسی اور زبان میں ہو۔ اردو میں قرآن مجید کے جتنے ترجمے کیے گئے اور تفسیریں لکھی گئی اتنی دنیا کی کسی اور زبان میں موجود نہیں ہیں۔ دور حاضر میں اردو زبان میں ترجمے کے فن سے واقفیت رکھنے والوں کی ضرورت ہے۔

اردو سے انگریزی، انگریزی سے اردو یا علاقائی زبانوں سے اردو میں اور اردو سے علاقائی زبانوں میں ترجمے کا کام سرکاری ملازمتوں میں بھی حاصل رہتا ہے۔ بعض ریاستوں میں ترجمے کا محکمہ ہی الگ رہتا ہے۔ عدالتوں میں بھی Urdu Interpreter کا عہدہ رہتا ہے جس کے لیے بنیادی ڈگری اردو میں پوسٹ گریجویشن ہوتا ہے۔ اس طرح ترجمہ نگاری ایک ایسا میدان ہے جہاں روزگار کے مواقع زیادہ فراہم ہو سکتے ہیں۔

کسی بھی زبان کے زندہ ہونے کی پہچان یہ ہے کہ وہ دور حاضر کے تقاضوں کو کہاں تک پورا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس سے پہلے ہمیں یہ جاننا ضروری ہوگا کہ عصر حاضر کی نوعیت کیا ہے؟ یعنی موجودہ دور کی پہچان کیا ہے؟ دور حاضر کو دوسرے الفاظ میں مادیت پسند دور سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آج انسان مادی آسائشوں کا متلاشی ہے۔ اس سے قبل کا انسان بھی اس کا قائل تھا لیکن آج کچھ زیادہ ہی ہے کیونکہ سائنس کی ایجادوں نے اس کو ان آسائشوں کا عادی بنا دیا ہے۔ اس لحاظ سے انسان معاشی فکر میں کچھ زیادہ ہی مبتلا ہے اور وہ ہر چیز کو نفع اور نقصان کے پیمانے پر تولتا ہے۔ چنانچہ جب زبان کی تعلیم کا سوال آتا ہے تو وہ یہ دیکھتا ہے کہ اس کے پڑھنے سے اس کے روزگار کے حصول کے مواقع بڑھیں گے یا نہیں۔ آج کئی مسلمان عربی زبان کی تعلیم بھی اس لیے حاصل کرتے ہیں کہ اس کی مانگ مشرقِ وسطیٰ کے ممالک میں ہے۔ لہٰذا ایسے ماحول میں ہم اردو زبان کی تعلیم کو روزگار سے جوڑ کر نہیں دیکھیں گے تو اس کی مارکیٹ ویلو کم ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

آج یہ شکایت عام ہے کہ اردو پڑھنے سے نوکری نہیں ملتی۔ اردو ہی کیا؟ آج کوئی بھی زبان اس بات کی ضمانت نہیں دے سکتی کہ اس کے پڑھنے سے نوکری مل جائے گی۔ موجودہ دور سائنس اور ٹکنالوجی کا دور ہے۔ آج دنیا میں انفارمیشن ٹکنالوجی کی وجہ سے انقلاب برپا ہو چکا ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں انفارمیشن ٹکنالوجی لازم و ملزوم ہے۔ انفارمیشن ٹکنالوجی سے جوڑے جانے سے آج اردو زبان بھی ایک اہم زبان کی حیثیت سے بین الاقوامی سطح پر ابھر رہی ہے۔ یہ زبان صرف شعر و ادب کی زبان نہیں ہے بلکہ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی زبان بن چکی ہے۔ سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کی جانب سے انٹرنیٹ پر بہت سے اردو ویب سائٹس شروع ہو چکے ہیں۔ جن میں چند اہم ویب سائٹس درج ذیل ہیں:

www.urdulife.com,
www.mahnamaurdu.com,
www.urdunet.com,
www.urdukasafha.com,
www.urdukiduniya.com,
www.roznamarashtriyasahara.com,
www.urducouncil.nic.in,
www.urdustan.com,
www.hallagulla.com,
www.urdupoint.com,
www.urdughar.com,

قومی زبان میں انفارمیشن ٹکنالوجی کی تعلیم کی جانب پہلا ویب www.urdupages.com، مشاعروں کو ویب میں پیش کرنے کی ضمن میں www.mushaira.org کا نام سرفہرست ہے۔ www.mushaira.org کو دسواں بڑا ویب سائٹ مانا گیا ہے۔ جسے 2001-2002 کا گولڈن ویب ایوارڈ (Golden Web Award) بھی حاصل ہوا ہے۔

اردو سافٹ ویر کی ایجاد نے اردو کے بیشتر اخباروں کو بھی انٹرنیٹ پر فراہم کر دیا ہے۔ جیسے روزنامہ 'منصف'، 'سیاست' (حیدرآباد) روزنامہ راشٹریہ سہارا' (بنگلور، پٹنہ، دہلی، ممبئی، وغیرہ...)، 'جنگ اور نوائے وقت' (پاکستان)، 'انقلاب'، 'اردو ٹائمز' (ممبئی) وغیرہ اخبارات انٹرنیٹ پر دستیاب ہیں۔

انفارمیشن ٹکنالوجی کی اس حیرت انگیز ترقی کے دور میں اردو داں طبقہ بھی اس سے بہت فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اردو کو domain بنا کر بہت سارے پروگرام ترتیب دیے جا سکتے ہیں اور اس سے خوب مالی منفعت بھی ہو سکتی ہے۔ IT کی دنیا اس قدر وسیع ہے کہ اس میں اردو domain کے ساتھ نئے نئے جزیرے کھوجے جا سکتے ہیں اور نئے نئے راستے دریافت کیے جا سکتے ہیں اور ایک نئی دنیا آباد کی جا سکتی ہے۔ روزگار کا جہاں تک تعلق ہے اردو سند یافتہ نوجوانوں کے لیے انفارمیشن ٹکنالوجی ایک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں۔

زبانوں کی تعلیم اور تدریس سے یہ سچ ہے کہ روزگار کمانے کا علم حاصل نہیں ہوتا۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ ذہن کی ایک خاص نہج پر تربیت ہوتی ہے۔ معاشرہ کے لیے ایک اچھا فرد ملتا ہے ایک ایسا Mindset مہیا ہوتا ہے جو ایک اچھی زندگی گزارنے کے قابل ہوتا ہے دیگر زبانوں کے متعلق تو ہمارا تجربہ نہیں ہے لیکن اردو پڑھنے والا کوئی شخص بیکار نہیں ہے۔ فارسی کے بارے میں یہ مثل مشہور تھی 'پڑھیں فارسی بیچیں تیل' میں یہ عرض کرتا ہوں کہ تیل بیچنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ اعلیٰ عہدے فوراً نہ ملیں تو روزگار کے ارزاں وسیلے بھی اختیار کیے جا سکتے ہیں۔ کام کچھ بھی ہو آدمی اپنی محنت اور شوق سے ترقی کرتا ہے۔

یہاں یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ اردو سند یافتہ نوجوان اگر ملازمتیں حاصل بھی کر لیتے ہیں تو انھیں سماج کو جواب دہ ہونا پڑتا ہے۔ وہ بات بات پر 'اردو کی روٹی' کا حوالہ دیتے ہیں۔ کوئی کامرس کی روٹی، فزکس کی روٹی، یا انگلش کی روٹی نہیں بولتا۔ ایسا لگتا ہے کہ روٹی صرف اردو کی پکتی ہے۔ ایسے میں میرا صرف ایک مشورہ ہے:

آلام روزگار سے گھبرا رہا ہے کیا
دل میں خیال یار کو مہماں بنا کے دیکھ

(یہ مقالہ آمبور ضلع ویلور کے مظہر العلوم کالج میں قومی کونسل کے معالی تعاون سے منعقدہ دو روزہ قومی سیمینار میں پیش کیا گیا تھا۔)

Dr. Amanullah (M.B.), Lecturer Dept of Arabic, Arabi, Persian and Urdu, Madras University (Chennai)

اردو فکشن میں خواتین کے مسائل اور موضوعات

محمد مرتضیٰ

اردو میں ناول کے آغاز کا سہرا ڈپٹی نذیر احمد کے سر ہے ان کے ناولوں کا تعلق جس نوعیت کے مسائل سے ہے وہ سارے کے سارے خواتین سے متعلق ہیں۔ مثلاً خواتین کی تعلیم وتربیت اور ان کا حسن انتظام اور خاندان میں ان کی حیثیت وغیرہ۔ چونکہ ہندوستان کی اولین خواتین تخلیق کاروں کے پیش نظر نذیر احمد ہی تھے۔ اس لیے انیسویں صدی کے اوائل کی خواتین کے جو ناول دستیاب ہیں وہ اصلاح ومعاشرے کے نقطۂ نظر سے سماج میں پیدا ہونے والے مسائل کی عکاسی کرتے ہیں۔ خاص طور سے عورت کی سماجی حیثیت، تعلیم، پردہ، توہم پرستی، سوتیلی ماؤں کی بدسلوکی، ساس نندوں کے مظالم، شوہروں کا دوسری عورتوں یا طوائفوں میں دلچسپی لینا اور ایسی دوسری باتیں زیر بحث ہیں۔

مختصر اردو افسانے کے بانی منشی پریم چند کے ناولوں اور افسانوں میں دیکھا جائے تو عورت کو ایک طرح سے مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ ان کی تخلیقات میں اگر اعلیٰ طبقے کی عورتیں ہیں تو متوسط نچلے طبقے کی خواتین کے ساتھ ساتھ گھریلو عورتیں بھی ہیں۔ حتیٰ کہ کھیتوں پر کام کرنے والی عورتیں، سیاست میں عملی طور پر حصہ لینے والی عورتوں کے ساتھ ساتھ پڑھی لکھی خوددار عورتیں بھی ہیں۔ 'بیوہ' افسانے میں پریم چند نے ایک ہندو بیوہ کو مرکزی کردار بنایا ہے جس کے حوالے سے بیوہ خواتین کے مسائل کو اجاگر کرنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ اس کے مستقبل کی طرف بھی قاری کو متوجہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

نذر سجاد حیدر نے خواتین کی تعلیم اور ان کی آزادی کی حمایت کے علاوہ سماج میں ان کی بہتر حیثیت کے مطالبے کے ساتھ ساتھ مغربی کلچر کی پروردہ خواتین کو تنقید کا بھی نشانہ بنایا ہے۔ عورت پر سماج میں ہونے والے مظالم اور اس کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کے مسائل کو علامہ راشد الخیری نے پوری فنی چابکدستی کے ساتھ استعمال کرتے ہوئے جذبات سے مغلوب عکاسی کی ہے۔ ان کی جذباتیت اس حد تک المیہ کے قریب ہے کہ انھیں مصورِ غم بھی کہا جاتا ہے۔ راشد الخیری کے بعد مرزا رسوا کا دور شروع ہوتا ہے، جنھوں نے ایک بالکل نئے موضوع پر قلم اٹھایا۔ انھوں نے ان حالات کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی جن کے تحت ایک عورت طوائف بنتی ہے۔ اسی موضوع کے تحت تخلیق ہونے والے دیگر ناول یعنی 'شاہد رعنا'، 'بازار حسن' اور 'لیلیٰ کے خطوط' بھی بے حد اہم ہیں۔

سعادت حسن منٹو نے طوائفوں کے ساتھ ساتھ عصمت فروش عورت کو اپنے افسانوں کا موضوع بنا کر گویا ایک طرح سے افسانے میں ایک نئی جان پھونک دی۔ کیونکہ منٹو سے پہلے کے مصنفین کی طوائف بے حد مہذب اور نستعلیق قسم کی تھی۔ جبکہ منٹو کی طوائف کو اگرچہ بالکل مختلف تو نہیں کہا جاسکتا لیکن اس کی حیثیت ایسی بھی نہیں ہے کہ اپنے دور کے 'شرفا' کے ساتھ بیٹھتی داد عیش دیتی یا پھر نغموں کی محفلیں سجاتی۔ اس کے برعکس اس کا موضوع ایسی عورتیں ہیں جنھیں اپنے طوائف ہونے پر بظاہر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ منٹو کے بعد ترقی پسند افسانہ نگاروں نے خواتین کی مساوی حیثیت پر زور دیا، اس میں محترمہ رشید جہاں خاص طور سے پیش پیش تھیں۔ انھوں نے خواتین کی سماجی نابرابری معاشرے میں ان کی کمتر حیثیت اور اس کی جہالت کو اپنا موضوع بنایا۔ ترقی پسند مصنفین نے بنا مرضی کی شادی، بے جوڑ شادی، جنسی آسودگی، گھروں میں ہی عورت کا جنسی استحصال اور پھر اس کے اوپر لعنت ملامت وغیرہ جیسے موضوعات کو بھی اپنی تخلیقات کا محور بنایا۔ اس کے علاوہ عصمت نے ابتدائی دور کی افسانہ نگاری کے دوران متوسط طبقے کی عورتوں کے مسائل کو اپنا موضوع بنانے کے علاوہ ان کی جنسی ناآسودگی اور مردوں کے مقابلے میں ان کی کمتر حیثیت پر احتجاج بھی کیا۔ صالحہ عابد حسین، رضیہ سجاد ظہیر، صدیقہ بیگم، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور اور پھر جیلانی بانو نے خواتین کے دوسرے مسائل مثلاً بانجھ عورت کے مسائل، بیوہ، مطلقہ اور بڑی عمر کی کنواری لڑکیوں اور گھر سے باہر کام کرنے والی خواتین کے مختلف النوع مسائل کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا۔ اس کے علاوہ افسانوی ادب کا

ایک بڑا حصہ فسادات کے موضوع کے تحت تخلیق ہوا ہے۔ ان میں بھی خواتین سے متعلق کئی مسائل تھے۔ مثلاً مغویہ عورتیں، مسلم لڑکوں کے دوسرے ملک چلے جانے کی بنا پر مسلم لڑکیوں کے لیے مناسب رشتہ نہ مل پانا، اپنا وطن، اپنا گھر، اپنی زمین اور اپنا خاندان چھوٹنے کا کرب جیسے موضوعات بھی افسانے میں استعمال ہوئے۔ فسادات کے حوالے سے عصمت چغتائی کا افسانہ 'جڑیں'، رضیہ سجاد ظہیر کا 'نمک'، صالحہ عابد حسین کا 'نراس میں آس' بہترین افسانے ہیں۔ اس کے علاوہ منٹو کا 'کھول دو' اور بیدی کا 'لاجونتی' بہترین افسانے ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی نے اپنے ناولٹ 'ایک چادر میلی سی' میں سکھ معاشرے میں رائج رسوم اور قید کی شکار عورت کے مسئلے کو بہت خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ بیدی نے خواتین کے مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے چاہے وہ 'گرم کوٹ' ہو یا 'اپنے دکھ مجھے دے دو' اور چاہے 'لمبی لڑکی' ہو یہ سبھی افسانے خواتین کے کسی نہ کسی مسائل جیسے موضوع ہی کے تحت تخلیق ہوئے ہیں۔

عصمت چغتائی نے اپنے افسانوں میں خواتین کے ہم جنسی میلان کو موضوع بنایا ہے۔ مثال کے طور پر 'لحاف' کا نام پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے دوسرے محبوب موضوعات، بچوں کے مسائل، کثرت اولاد اور تعدد ازدواج وغیرہ ہیں۔ اس سلسلے میں عصمت چغتائی کو مردوں سے یہ شکایت رہی ہے کہ اس نے عورت کو یا تو ساتویں آسمان پر پہنچادیا یا پھر تحت الثریٰ میں دھکیل دیا۔ لیکن اس کے تئیں معتدل رویہ کبھی اختیار نہیں کیا۔ نہ ہی اس نے کبھی عورت کو اپنے برابر جانا اور نہ ہی کبھی ایک ہی صف میں شانہ بہ شانہ کھڑے ہونے کا موقع دیا۔ اپنی نظر میں وہ خود کو عورت سے بدتر ہی مانتا ہے وہ عورت کو پیار و محبت دے سکتا ہے لیکن اسے برابری کا درجہ نہیں دے سکتا ہے۔ عورت مرد کی نظروں میں ہمیشہ ساری صلاحیتوں سے بہرہ ور ہونے کے باوجود اس سے نیچے ہی رہی اور پھر اسے سراسر مجسمہ بوفا بنادیا گیا۔ اور اگر وہ صراط مستقیم سے کہیں ادھر اُدھر ہوئی تو اسے گردن زدنی قرار دے دیا گیا۔ لیکن مرد بہرحال آزاد رہا۔ حتیٰ کہ بڑی سے بڑی لغزش بھی اس کی نظر کبھی نیچی نہیں کرسکی۔ جب کہ ایک معمولی سی لغزش سے عورت شرم وحیا سے مرجاتی ہے۔ زنا کاری میں اگرچہ عورت اور مرد دونوں شریک ہوتے ہیں لیکن اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والا بچہ حرامی کہلاتا ہے اور عورت اس حرامی بچے کو گود میں لیے زندگی کے چوراہے پر کھڑی رہ جاتی ہے۔ یہاں تک کہ عورت کا بوقت ضرورت مرد کے لیے جان پر کھیل جانا ایک فطری بات مانی گئی ہے۔ جب کہ اس کے برخلاف مرد کا عورت پر نچھاور ہونا ضروری نہیں۔ یہ تضادات عصمت چغتائی کے ذہن کو ہمیشہ سوچنے پر مجبور کرتے رہے اور بار بار اسی استدلال اور تضادات کو اپنا موضوع بناکر افسانے تخلیق کرتی رہیں۔ عصمت چغتائی کا عقیدہ تھا کہ عورت کی زبوں حالی کے دو بنیادی اسباب ہیں۔ اول یہ کہ وہ ناخواندہ ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ اپنے حقوق سے واقف نہیں ہیں اور نہ ہی اپنے تحفظ کا احساس ہے اب اگر کوئی خاتون آواز اُٹھاتی ہے تو اس کی آواز صدائے صحرا ثابت ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ عورت اقتصادی طور پر مرد کی غلام ہے اس لیے جب تک وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی صلاحیت حاصل نہیں کرلیتی تب تک اس کی حالت میں کسی بہتری کا کوئی امکان نہیں ہے۔ غرض کہ عصمت چغتائی کا

> مختصر اردو افسانے کے بانی منشی پریم چند کے ناولوں اور افسانوں میں دیکھا جائے تو عورت کو ایک طرح سے مرکزی حیثیت حاصل ھے۔ ان کی تخلیقات میں اگر اعلیٰ طبقے کی عورتیں ھیں تو متوسط نچلے طبقے کی خواتین کے ساتھ ساتھ گھریلو عورتیں بھی ھیں۔ حتیٰ کہ کھیتوں پر کام کرنے والی عورتیں، سیاست میں عملی طور پر حصہ لینے والی عورتوں کے ساتھ ساتھ پڑھی لکھی خوددار عورتیں بھی ھیں۔ 'بیوہ' افسانے میں پریم چند نے ایک ھندو بیوہ کو مرکزی کردار بنایا ھے جس کے حوالے سے بیوہ خواتین کے مسائل کو اجاگر کرنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ اس کے مستقبل کی طرف بھی قاری کو متوجہ کرنے کی کوشش کی ھے۔

جارحانہ انداز تمام عمر جاری رہا۔ اس کے علاوہ انھوں نے پسماندہ طبقے کی فلاح و بہبود، حقوقِ نسواں، تعلیم نسواں اور پردہ وغیرہ جیسے موضوعات کو اپنے افسانوں کا محور بنایا۔ ان کے سلسلے میں کہا جاتا ہے کہ بسا اوقات وہ جذبات سے مغلوب ہوکر حد مناسب یا زبان شرفا کی حدود سے باہر نکل جاتی تھیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ ناسور جتنا گہرا ہو طبیب کو نشتر بھی اتنا ہی گہرا لگانا پڑتا ہے۔ پھر عصمت نے تو صدیوں سے طاری جمود کو توڑنے کی کوشش کی تھی۔ اب چونکہ ان کی کوشش میں خلوص بھی شامل تھا۔ اس لیے ان کی آواز کی بازگشت آج بھی سنائی دیتی ہے۔

عصمت چغتائی کے بعد اردو افسانوی ادب میں خواتین کے مسائل کو اپنا موضوع بنانے کے علاوہ خاتون افسانہ نگار کی حیثیت سے جس شخصیت کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہوئی وہ ہیں قرۃ العین حیدر، ان کے علاوہ ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، رفیعہ منظور الامین اور شکیلہ اختر وغیرہ جیسی اہم افسانہ نگار بھی اردو ادب میں درخشاں ستارے کے مانند چمک دمک رکھتی ہیں۔ لیکن ان میں قرۃ العین حیدر کو اس لیے زیادہ اہمیت حاصل ہے کہ انھوں نے بھی بیشتر افسانے خواتین سے متعلق لکھے ہیں۔ ان کے یہاں خواتین کے لیے سماج کی پیدا کی ہوئی پیچیدگیوں کے ساتھ ساتھ اس کے ازلی اور بنیادی مسائل کو بھی چھیڑا گیا ہے یعنی ان کا استحصال کس کس طرح ہوتا ہے۔ طبقوں، ملکوں اور مختلف تہذیبوں کی پروردہ خواتین کی زندگی اور ان کی زندگی کا پیدا ہونے والے بیشتر مسائل کو بھی اپنے افسانوں میں موضوع بناکر پیش کیا ہے۔ مثلاً 'سیتاہرن' محض ایک واقعہ ہی نہیں جو دورِ قدیم میں پیش آیا تھا۔ بلکہ اس دورِ جدید میں ان کے سامنے یہ واقعہ انداز دگر ہے۔ کہنے کا مطلب یہ واقعہ تو وہی ہے لیکن کردار بدل گئے ہیں۔ اس طرح اگر دیکھا جائے تو اردو کے افسانوی ادب میں خواتین کے مسائل کو خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے حتیٰ کہ آج کے اس دورِ جدید میں بھی اس کی سماجی حیثیت زیر بحث ہے۔ افسانہ نگار زندگی کے ہر پہلو کو اپنے افسانے کا موضوع نہیں بناتا۔ بلکہ اس کا موضوع عام طور سے خصوصی ہوتا ہے۔ چونکہ عوام مختلف طبقوں میں منقسم ہیں اور ہر طبقے کے اپنے اپنے مسائل ہیں اور ہر فرد کی الگ فطرت اور ذہنیت ہے۔ جس کی وجہ سے ہر ایک کی جذباتیت بھی مختلف ہے، ہر نئے جذبے یا عمل کے بطن میں نفسیات اور تحلیل نفسی کا کوئی نہ کوئی نقطہ بہرحال کارفرما ہے۔ انسان کی اپنی بنائی ہوئی تعمیرات اور اپنا بنایا ہوا ماحول اور اس ماحول میں رہنے والوں پر ان کا اثر اور اس اثر کا ردِعمل اور اس ردِعمل کے پیدا کیے ہوئے طبعی ذہنی اور جذباتی نتائج غرض کہ دورِ جدید کے افسانہ نگاروں کی نظر زندگی کی ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز پر رہی ہے۔ غالباً اسی بنا پر کچھ افسانہ نگاروں کے یہاں سماج کے مختلف طبقوں کی عکاسی ملتی ہے۔ مثلاً اگر بیدی کے افسانوں میں متوسط گھرانوں کے مطالعے کی عکاسی ملتی ہے تو منٹو، حسن عسکری اور عصمت چغتائی کا بنیادی موضوع جنس کے جذبے کا ایک غیر حسی عمل ہے۔ لیکن ہر ایک نے اپنے ذاتی مشاہدے سے موضوع میں زندگی کے رنگ بھرے ہیں۔ ان سے ہر ایک فن دوسرے سے

بالکل جدا نظر آتا ہے۔

چونکہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے رشتے ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح مربوط ہیں کہ ایک دوسرے کو جدا نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے اس دور کے افسانوں کا موضوع چاہے پنجاب کے دیہات سے متعلق ہو، یا کشمیر کی وادیوں سے یا پھر اس کا تعلق کسی بھکاری سے ہو، کلرک سے ہو، یا طوائف سے یا متوسط گھرانے سے، یا پھر اس کا موضوع تحلیل نفسی ہو یا فلسفے کا باریک نکتہ، ہر جگہ ملک اور دنیا کے مجموعی حالات منعکس ہوئے ہیں اور یہ سب زندگی کے مختلف شعبے میں گھل مل گئے ہیں کہ انھیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا اس لیے یہ کہنا درست نہیں معلوم ہوتا کہ جس افسانہ نگار کا جو خاص رنگ موضوع ہے اس کے علاوہ باقی تمام چیزوں سے بے خبر و بے نیاز ہے کیونکہ بے خبر یا بے نیاز رہنا ایسا کسی کے لیے ممکن ہی نہیں رہ گیا ہے۔ ایک دور ایسا تھا کہ جب ادب میں حقیقت نگاری کا رجحان غالب تھا۔ حقیقت کی عکاسی کو فن کی معراج سمجھا جاتا تھا لیکن بیشتر حقیقت سے مراد وہ ٹھوس حقائق تھے جو عام طور پر انسانی ذہن سے آزادانہ وجود رکھتے تھے۔ کیونکہ حقیقت تو وہی ہوسکتی ہے جس کا تجربہ یا مشاہدہ کیا جاسکے۔ ادیب اپنی ذاتی بصیرت کے بجائے غیر ذاتی معروضیت پر زیادہ یقین کرتا تھا۔ عام طور سے اس نوع کے مصنفین مادیت پرستی کے فلسفے کے قائل تھے انھوں نے انسان کو ماحول کا پروردہ اور فطرت سے مجبور وجود کی شکل میں پیش کرنا شروع کر دیا اور حیات و کائنات کے سلسلے میں میکانکی اور مادی طرزِ فکر اور نظریہ جبر قبول کرلیا اور اس طرح ادب اور فن میں واقعیت نگاری اور فطرت نگاری کا رجحان پروان چڑھنے لگا۔ فطرت نگاری کے اس رجحان سے کچھ ادیبوں کو اختلاف تھا۔ اس لیے انھوں نے اس کے خلاف بغاوت کی ان باغی ادیبوں کا خیال تھا کہ رومان اور حقیقت کی کشمکش ایک ادبی کشمکش ہے ہر دور میں انسان حقیقت سے دور ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ درحقیقت جس شے کا خارجی مشاہدہ کیا جاسکتا ہے وہ مستند نہیں سمجھی جاتی اس وجہ سے ادب میں رومانیت پسندی کا رجحان غالب رہا۔ لیکن حقیقت پرستی ساتھ چلتے ہوئے بھی رومانیت سے متصادم رہی۔ حقیقت اور رومانیت کی اس کشمکش میں ادب نے کئی مختلف قسم کے رجحانات قبول کیے۔

درحقیقت دورِ جدید میں اردو ادب میں دوسری اصناف کے مقابلے میں اردو افسانہ جن خاص نظریات سے متاثر ہوا ہے اس کا گہرا اور دیرپا اثر پڑا ہے وہ ہیں

مارکس اور فرائڈ کے نظریات۔ لاشعوری اور جنسی اردو افسانہ ان دونوں نظریات سے ایک ہی دور میں تقریباً برابر متاثر ہوا ہے۔ جس کے نتیجے میں نئے اور ترقی پسند ادب کی ابتدائی نگارشات میں اثر نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر 'انگارے' میں شامل تخلیقات کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس کے باوجود کچھ ادیب ایسے بھی تھے جو مادیت اور جبر کے تو قائل تھے لیکن میکانکی نقطۂ نظر کے خلاف جدلیاتی

چونکہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے رشتے ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح مربوط ہیں کہ ایک دوسرے کو جدا نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے اس دور کے افسانوں کا موضوع چاہے پنجاب کے دیہات سے متعلق ہو، یاکشمیر کی وادیوں سے یا پھر اس کا تعلق کسی بھکاری سے ہو، کلرک سے ہو، یا طوائف سے یا متوسط گھرانے سے، یا پھر اس کا موضوع تحلیل نفسی ہویا فلسفے کا باریک نکتہ، ہر جگہ ملک اوردنیا کے مجموعی حالات منعکس ہوئے ہیں اور یہ سب زندگی کے مختلف شعبے میں گھل مل گئے ہیں

عمل میں یقین رکھتے تھے۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ ترقی پسند مصنفین کے نزدیک ادب کے لیے افادیت بنیادی شرط ہے۔ آزادی سے قبل جو افسانہ نگار فرائڈ کے نظریات سے متاثر تھے ان کے سامنے فرائڈ کی ابتدائی تحریریں تھیں۔ جن میں تین پہلو زیادہ اہم تھے۔ جنسی لاشعور اور تحلیل نفسی۔ اس کے باعث انھوں نے انسانی ذہن کی گہری اور اندرونی تہوں میں داخل ہوکر اور لاشعور کی گہرائیوں میں اتر کر کردار نگاری کی عمیق عکاسی کرنے کی کوشش کی۔ ظاہر ہے کہ کوئی بھی شخص تحلیل نفسی سے گزرنے کے بعد ہیرو نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ اس کا ہیرو ین یا اولوالعزمانہ عمل اس کے کسی ذہنی مرض کا دفاعی عمل ہے۔

افسانے کے حوالے سے ایک اور جو اہم بات سمجھ میں آتی ہے وہ ہے فن۔ اس سلسلے میں بیشتر افسانہ نگاروں کے یہاں کچھ چیزیں بہرحال مشترک معلوم ہوتی ہیں۔ اول تو یہ آج کا افسانہ نگار فن کے حسن اور نزاکت کو اپنے جذبات اور احساسات پر قربان نہیں ہونے دیتا، اس کے جذبات اور احساسات میں اب پہلے سے زیادہ وسعت اور گہرائی ہے۔ پہلے سے زیادہ تیزی، تندی، تلخی اور خلوص ہے لیکن یہ شدت ہر ایک کے یہاں فن کے تابع ہے اب کسی افسانہ نگار کو کسی سیاسی نوعیت کے موضوع پر بھی لکھنے میں کوئی تامل نہیں ہے، بلکہ وہ طنز کے نشتروں سے کام لیتا ہے اور بے باک اور نڈر ہوکر ہر ایک پر تنقید کرتا ہے، دورِ جدید کے افسانہ نگار کو صرف مصور اور مترجم محض نہیں بلکہ مبصر اور نقاد کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

پریم چند اصلاح معاشرت اور حقوق کے علمبردار بھی تھے۔ انھوں نے خواتین کے مسائل پر خصوصی توجہ دی۔ بیوہ کی شادی اور ضعیف العمر خواتین کے مسائل کو بھی موضوع تخلیق بنایا ہے۔ بے میل شادیوں پر انھیں سخت اعتراض تھا۔ ان کی زبان میں وطن کی مٹی کی مہک سمائی ہوئی تھی۔ اس لیے وہ جب کوئی مسئلہ اُٹھاتے ہیں تو وہ دیرپا ہوتا ہے کسان اور مزدور کا استحصال اور جاگیردارانہ نظام کی جبریت کے خلاف بھی ان کے یہاں سخت احتجاج پایا جاتا ہے۔ انھوں نے خواتین کی زبان میں مقامی لب و لہجے کو شامل کر کے بیان کو حقیقت سے قریب تر کر دیا ہے

اردو ادب میں جدیدیت کے آغاز سے تقریباً سبھی اصناف ادب میں ایک نئے قسم کے تجرباتی ادب کو فروغ حاصل ہوا۔ مختصر افسانے میں تجربے کی روایت کا آغاز حسن عسکری کی کہانی 'چائے کی پیالی' اور منٹو کی کہانی 'پھندنے' کو قرار دیا جاتا ہے۔

■

Dr. Mohd Murtaza, F 11/13, Second Floor
Gali No. 6, Joga Bai Ext., Jamia Nagar
Okhla, New Delhi- 110025

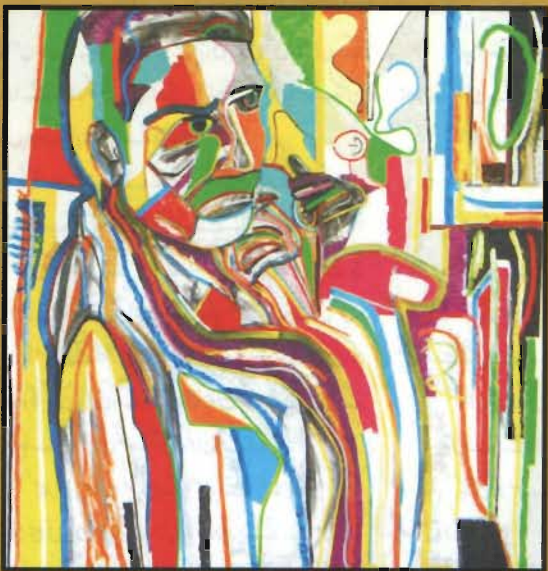

مصنف: کملا داس

مترجم: احمد نسیم صدیقی

(ملیالم افسانہ)

پیاسم

(یہ افسانہ محترمہ کملا داس کی تخلیق ہے۔ محترمہ کملا داس صفِ اول کی ادیبہ اور شاعرہ ہیں۔ وہ مادھوی کٹی کے قلمی نام سے ملیالم میں، اور کملا داس کے نام سے انگریزی میں لکھتی رہی ہیں۔ اب ان کا نام کملا ثریا ہوگیا ہے۔ وہ نیشنل اکادمی ایوارڈ حاصل کرچکی ہیں۔)

ایک شخص جو آخری رسومات ادا کرکے گھر واپس ہورہا ہے اور جس نے ہر شخص کا شکریہ ادا کیا ہے، ہم اسے صرف اُکن کی حیثیت سے پہچان سکتے ہیں۔ شہر میں محض تین بچے ہیں جو اس شخص کی قدر جانتے ہیں۔ یہ بچے اس شخص کو اکا کہہ کر پکارتے ہیں۔

بس میں اجنبی مسافروں کے درمیان بیٹھے بیٹھے اُس نے پورے دن کے ہر لمحے پر دوبارہ نظر ڈالی۔

صبح وہ اس کی آواز سے بیدار ہوا تھا:

''اپنے! اس طرح خود کو لپیٹ کر سوتے مت رہو۔ آج دوشنبہ ہے۔'' وہ اپنے سب سے بڑے بیٹے کو جگا رہی تھی۔ پھر وہ باورچی خانے کی طرف چلی گئی تھی، اس کی سفید ساری ملگجی ہورہی تھی۔ میرے لیے ایک بڑا گلاس کافی کا لائی تھی۔ اس کے بعد؟ اس کے بعد کیا ہوا؟ کیا اس نے کچھ ایسا کہا تھا جسے فراموش نہیں کیا جانا چاہیے؟ اس نے بہت کوشش کی مگر وہ کچھ یاد نہیں کرسکا۔

''اس طرح لپیٹ کر سوتے مت رہو، آج دوشنبہ ہے۔''

صرف یہی جملہ بازگشت کررہا تھا۔ اس نے اس جملے کو کئی بار دہرایا۔ گویا کہ وہ کوئی دعائیہ کلمہ ہو اور اگر وہ اس جملے کو یاد نہ رکھ سکا تو ناقابلِ تلافی نقصان ہوجائے گا۔

جب صبح کو آٹھ بجے وہ اپنے کام پر نکلا تو بچے اس کے پاس ہی تھے۔ وہ المونیم کے چھوٹے ٹفن میں ان کے لیے ناشتہ لائی تھی اور اس وقت اس کے دائیں ہاتھ پر ہلدی لگی ہوئی تھی۔

اپنا کام کرنے کے دوران اسے اس کا قطعی خیال نہیں آیا۔ انھوں نے ایک یا دو برس کی کورٹ شپ کے بعد اپنے والدین کی مرضی کے خلاف جاکر شادی کی تھی۔ انھیں اپنے اس فعل پر کبھی پچھتاوا نہیں ہوا۔ آمدنی کی کمی اور بچوں کی طویل بیماریوں نے آکر انھیں پریشان کیا۔ وہ اپنی جانب سے لاپروا ہوگئی تھی اور کچھ حد تک اس کی بھی ہنسنے کی قوت متاثر ہوئی تھی۔

اس کے باوجود وہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ ان کے تینوں بچے بھی ان سے محبت کرتے تھے۔ وہ تینوں لڑکے تھے جن میں اُنّی دس برس کا، بالن سات برس کا اور راجن پانچ برس کا تھا۔ تینوں لڑکے جن کے چہرے ہمیشہ گندگی سے آلودہ رہتے اور جو نہ تو خوبصورت تھے اور نہ ہی غیر معمولی طور پر ذہین۔ لیکن ان کے ماں باپ ایک دوسرے سے اس انداز میں گفتگو کرتے۔

''اُنّی ہر وقت کچھ نہ کچھ بنایا کرتا ہے۔ وہ انجینئرنگ میں دلچسپی رکھتا ہے۔''

''ہم بالن کو ڈاکٹر بنائیں گے۔ اس کی پیشانی دیکھو، اتنی کشادہ پیشانی ذہانت کی غمازی کرتی ہے۔''

''راجن کو اندھیرے سے خوف نہیں محسوس ہوتا ہے۔ وہ ہوشیار بھی ہے۔ وہ فوج میں جاسکتا ہے۔''

وہ لوگ شہر کی ایک تنگ گلی میں متوسط طبقے کے لوگوں کی ایک بستی میں رہتے تھے۔ پہلی منزل پر بنے ان کے مکان میں تین کمرے اور ایک برآمدہ شامل تھا جس میں دو افراد آسانی سے گزر سکتے تھے۔ ماں نے ایک برتن میں پینیر کا پودا لگایا ہوا تھا جس میں ابھی پھول نہیں آئے تھے۔

باورچی خانے میں دیوار میں لگی کھونٹیوں میں مختلف ظروف لٹکے رہتے۔ اسٹوو کے قریب لکڑی کا ایک تختہ پڑا تھا۔ ماں اکثر اسی پر بیٹھا کرتی اور باپ کے کام سے واپس آنے پر ان کے لیے چپاتیاں بنایا کرتی۔

بس کے رُکنے پر وہ اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اُسے اپنے گھٹنے میں درد کی ایک لہر اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''گٹھیا کی شروعات؟ اگر میں بستر کا ہوگیا تو بچوں کی فکر کون کرے گا؟'' اچانک اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے ایک گندے سے رومال سے اپنا چہرہ صاف کیا اور اپنی رفتار تیز کردی۔

کیا بچے سونے چلے گئے؟ انھوں نے کچھ کھایا یا وہ روتے روتے سوگئے تھے، وہ ابھی بہت چھوٹے ہیں۔ اُنّی وہاں کھڑے کھڑے بس مجھے دکھتا رہا تھا جب میں نے اسے گاڑی میں رکھا تھا۔ صرف سب سے چھوٹا بچہ رویا تھا۔ لیکن وہ بھی اس وجہ سے کہ وہ گاڑی میں بیٹھنا چاہتا تھا۔ یقیناً وہ موت کا مفہوم نہیں سمجھتے ہیں۔

کیا میں نے سمجھا تھا؟ نہیں۔ کیا میں نے یہ کبھی تصور بھی کیا تھا کہ اچانک ایک شام وہ گر پڑے گی اور مرجائے گی، کسی سے کچھ کہنے کا موقع بھی اسے نہیں ملے گا؟

جب وہ کام پر سے واپس آیا تھا تو اس نے باورچی خانے کی کھڑکی میں سے اندر دیکھا تھا۔ وہ وہاں نہیں تھی۔ اس نے سامنے کے حصے میں کھیلتے ہوئے بچوں کی آوازیں سنی تھیں: ''فرسٹ کلاس شاٹ۔'' یہ اُنّی کی آواز تھی۔

اس نے اپنی چابی سے سامنے کا دروازہ کھولا، اور تب اس نے دیکھا، وہ فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کے لب وا تھے۔ وہ پھسل گئی ہوگی۔ اس نے سوچا تھا۔ لیکن اسپتال جانے پر ڈاکٹر نے بتایا تھا:

''اسے مرے ہوئے ایک، ڈیڑھ گھنٹہ ہو چکا ہے۔ یہ حرکت قلب بند ہونے کا معاملہ ہے۔''

وہ جذبات سے مغلوب ہوگیا تھا۔ وہ اس سے بلا کسی وجہ کے ناراض تھا۔ وہ کچھ کہے بغیر کیسے جا سکتی تھی، مجھ پر تمام ذمے داریوں کا بار ڈال کر۔ اب بچوں کو نہلائے گا کون؟ ان کے لیے کھانا کون پکائے گا؟ ان کے بیمار ہو جانے پر ان کی نگہداشت کون کرے گا؟

''میری بیوی مرگئی۔'' اس نے خود کلامی کی۔

''میری بیوی آج اچانک دل کا دورہ پڑنے سے مرگئی۔ مجھے دو دنوں کی رخصت چاہیے۔''

''رخصت کی ایک شان دار درخواست۔ رخصت، اس لیے نہیں کہ بیوی بیمار ہے۔ رخصت اس لیے کہ بیوی مرگئی ہے۔ صاحب اسے اپنے کمرے میں بلا سکتے ہیں۔ وہ اظہار افسوس و تعزیت بھی کر سکتے ہیں۔ اس کے ذریعے اظہار افسوس! کون چاہتا ہے؟ وہ اسے جانتا نہیں۔ وہ اس کی زلفوں کے بارے میں بھی نہیں جانتا جو حلقے بناتی تھیں۔ اس کی تھکی تھکی مسکراہٹ، اس کی آہستہ روی۔ یہ سب تو اس کے اپنے نقصانات ہیں۔

جب اس نے مکان کا دروازہ کھولا، اس کا چھوٹا بیٹا دوڑتا ہوا اس کے پاس آیا۔ ''ماں اب تک واپس نہیں آئی۔'' اس نے شکایت کی۔

کتنی جلد وہ بھول گیا ہے! کیا اس نے واقعی ایسا سوچا تھا کہ جو جسم ٹیکسی میں لے جایا گیا تھا، وہ واپس بھی آئے گا اور وہ بھی بذات خود، وہ بیٹے کو لے کر باورچی خانے کی طرف چلا گیا۔

'اُنی!'' اس نے آواز دی۔

''کیا بات ہے اکا؟''

اُنی باورچی خانہ میں آگیا۔

''بالن سو رہا ہے؟''

''کیا تم لوگوں نے کچھ کھایا ہے؟''

''نہیں۔''

اس نے کھڑکی پر رکھے برتنوں پر سے پلیٹیں ہٹائیں۔ وہاں چپاتیاں، چاول، آلو، چپس اور دہی سمیت وہ کھانا رکھا تھا جو وہ پکا گئی تھی۔ ایک گلاس میں نی پیاسم (کھیر جیسی چیز) بھی موجود تھی جو وہ اکثر بچوں کے لیے بناتی تھی— نہیں! انھیں یہ کھانا نہیں چاہیے۔ اس پر موت کا سایہ ہے۔

''یہ سب ٹھنڈا ہو گیا ہے میں ''اوپما'' تیار کرتا ہوں۔'' اس نے بچوں سے کہا۔

''اکا ...!'' یہ اُنی کی آواز تھی۔

''اوں؟''

''ماں کب واپس آئے گی؟ کیا وہ اب بہتر نہیں ہے؟''

سچ کے لیے مزید ایک دن انتظار کر لینا چاہیے۔ اس نے سوچا۔ آج ہی رات کو بچوں کو غم زدہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

''ماں آئے گی۔'' اس نے تسلی دی۔

اس نے دھلے ہوئے پیالے فرش پر رکھے۔ دو پیالے۔

''بالن کو سونے دو۔'' اس نے دوسرے بچوں کو صلاح دی۔

''اکا! نی پیاسم۔'' راجن نے ''پر جوش آواز میں کہا۔ اس نے گلاس میں ایک انگلی ڈبولی۔

وہ اسی تختے پر بیٹھ گیا جہاں عام طور سے اس کی بیوی بیٹھا کرتی تھی۔

''اُنی! کیا تم سب کو دو گے؟ اُکن کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اس کے سر میں درد ہے۔''

انھیں کھانے دیا جائے۔ وہ آئندہ پھر کبھی اپنی ماں کا پکایا ہوا کھانا نہیں کھا پائیں گے۔ انھوں نے 'پیاسم' کھانا شروع کیا۔ وہ انھیں دیکھتا ہوا ساکت بیٹھا رہا۔

''کیا تم چاول نہیں لوگے اُنی؟''

''نہیں، ہم صرف پیاسم کھائیں گے۔ یہ بہت لذیذ ہے۔''

''ہاں۔ ماں نے بہت ذائقہ دار پیاسم تیار کیا ہے۔'' راجن نے بھی اپنی خوشی کا اظہار کیا۔

وہ اُٹھ کھڑا ہوا، اور تیزی سے باتھ روم کی جانب چل پڑا۔

(ماہنامہ 'نیا دور' لکھنؤ میں فروری 2003 میں شائع)

(مختصر فارسی افسانہ، مصنف: محمد حجازی)

پرند جو پرواز کر گیا

تمھیں میں نے متعدد مرتبہ دیکھا، مہمانوں کے درمیان ہم دونوں ساتھ طعام و شراب میں مصروف رہے اور آپس میں متعارف ہوئے۔ ممکن ہے چند مرتبہ ہم نے گفتگو بھی کی ہو۔ ان ملاقاتوں کے دوران تم نے جو کچھ سنا وہ فراموش ہوتا جا رہا ہے۔

درحقیقت تم کوئی دلکش اور دلفریب جسم کے مالک و صبار فتار نہیں تھے کہ میری نگاہوں اور دل کو اپنا اسیر کر لو، تم تو ان ساختہ و پرداختہ پھولوں میں سے ایک پھول تھے کہ جسے کوئی دیکھتا ہے اور گزر جاتا ہے۔

اس کے بعد ایک شب میں نے تمھیں جم غفیر میں دیکھا کہ تم اپنی نگاہوں کا مرکز مجھے بنائے ہو، میں نے بھی ان نگاہوں کا اپنی نگاہوں سے جواب دے دیا گویا کہ تمھارے سوا سب چلے گئے۔ میں نے جس طرف دیکھا وہاں تم موجود تھے۔ تمھاری آنکھوں کی جھیل کے پانی نے پورے عالم کو گرفتار کر لیا تھا۔ اس جھیل کے درمیان میں ایک خوبصورت پھول جان بخش اور عشق آفریں کھلا اور مجھ سے خندہ لب گویا ہوا۔ وہ جس کی تمھارا دل ایک زمانہ سے آرزو کرتا رہا ہے وہ میں ہی تھا لہٰذا اس اپنے دل کو میری آغوش میں ڈال دو، اپنی آرزو کو حاصل کرو، اپنے اس بیمار دل کو چھوڑ دو کہ میں دوا کروں۔

میرے دل نے سینے کے اندر فریاد کی چھوڑ دو، چھوڑ دو......

اس کے بعد تم نے ناز و انداز دکھائے اور مجھ پر ہر طرح کا جور و ستم کیا۔ بہانے کرتے رہے۔ قہر برپا کیے، میری دل شکنی کی اور دلدہی کی۔ نتیجہ کار میرے لیے ایک رقیب پیدا کر دیا اور میرے بے گناہ و معصوم دل کا رقیب کے ہاتھوں خون کرا دیا۔

تمھیں یہ حق تھا جو تم نے یہ خواہش کی ہے مجھے اپنا زیادہ اسیر، مزید عاشق اور شیدا کرو، تمھاری خواہش تھی کہ رنج دو، مجھے سوز میں مبتلا کرو، خاکستر کر دو یہاں تک کہ میں تمھیں زیادہ دوست رکھوں۔ تمھیں یہ حق حاصل تھا کہ عاشق کو ختم کر دو۔

مگر تم یہ نہیں جانتے تھے کہ میرا عشق آفاقی ہے، اس نے دام کو دانے کے ساتھ دیکھا، اپنے پنکھ وا کیے اور تمھاری آنکھوں کی جھیل سے آسمان کی جانب پرواز کر گیا۔ فضول کی آہ و زاری نہ کرو، ستم دیدہ پرند ہرگز واپس نہ آئے گا۔

(روزنامہ 'قومی آواز' میں 25 دسمبر 1994 کو شائع)

■

ماخذ: افسانے دیگر زبانوں سے، **ترجمہ و ترتیب:** ڈاکٹر احمد نسیم صدیقی، **سنہ اشاعت:** جولائی 2010

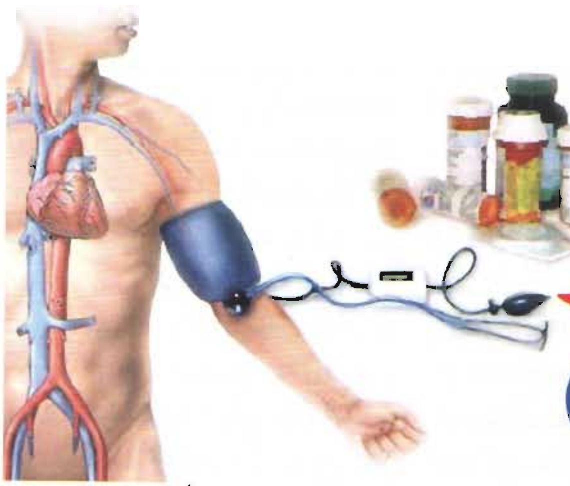

مشرف علی

بلڈ پریشر

(Blood Pressure)

ہم اکثر قلبی امراض میں مبتلا اشخاص کو دیکھتے ہیں جن میں سے زیادہ تر ضغط الدم قوی High Blood Pressure کے شکار ہوتے ہیں اس کے برخلاف ضغط الدم ضعف Low Blood Pressure کے مریض بھی کم نہیں ہیں اور یہ دونوں ہی کیفیات مریض کے لیے انتہائی پریشان کن ثابت ہوتی ہیں جن میں سے ضغط الدم قوی کچھ زیادہ ہی اضطراب کا باعث بنتا ہے۔ بہرحال ہم اس جگہ دونوں ہی کیفیات پر گفتگو کریں گے لیکن ضغط الدم کی شدت وکثرت کے مدنظر پہلے اسی کا جائزہ لیتے ہیں۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ ضغط الدم قوی دن بہ دن کثیر تعداد میں لوگوں کو متاثر کررہا ہے اور ایک بار یہ روگ لگ جانے کے بعد عرصۂ دراز تک مریض کا پیچھا چھوڑنے کا نام نہیں لیتا اور بے چارے مریض کو ایک کلینک سے دوسرے کلینک تک بھٹکتے رہنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں بلکہ طب جدید سے متعلق دوائیں وقتی سکون پہنچانے کے سوا مرض کی کیفیت کو دفع کرنے سے قاصر رہتی ہیں یہاں تک کہ درستگی سے علاج نہ ہو پانے یا نیم حکیموں کے جال میں پھنس کر مزید دیگر امراض گلے لگ جاتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وقت رہتے یونانی طریقہ علاج میں اسرول نامی جڑی بوٹی کے استعمال سے ضغط الدم قوی (High Blood Pressure) پر قابو پایا جاسکتا ہے جو کہ اپنے ملک ہندوستان ہی میں پیدا ہوتی ہے۔ اس کے طریقہ استعمال کی تفصیلی معلومات فراہم کرنے سے قبل بہتر ہوگا کہ پہلے ہمیں ضغط الدم قوی کے بارے میں مفصل واقفیت ہونا لازمی ہے۔

ضغط الدم Blood Pressure وہ کنڈیشن کہلاتی ہے جس میں قلب Heart کو پورے جسم میں دوران خون Blood Circulation کے لیے اپنی جو طاقت صرف کرنی پڑتی ہے اور اس کے نتیجے میں قلب پر جو دباؤ Pressure پڑتا ہے اس کو ضغط الدم کہتے ہیں۔ قلب پر یہ دباؤ دو قسم کا پڑتا ہے۔ ایک تو یہ کہ جب قلب پھیل کر اپنے اندر خون کو کھینچ کر بھرتا ہے تو اس کو انبساطی دباؤ یا Diastolic Pressure کہتے ہیں جو کہ نارمل 70 سے 90 ایم، ایم، ایچ، جی تک ہوتا ہے اور دوسرا وہ ہے کہ جب قلب پورے جسم میں بہاؤ کے لیے خون کو

> ہائی بلڈ پریشر کے کو مریض کی بعض علامات کو مدنظر رکھتے ہوئے بآسانی تشخیص کیا جاسکتا ھے۔ جب بلڈ پریشر بڑھا ہوا ہوتا ھے تو بعض مریضوں کو دردسر، چکر، چلنے، پھرنے پر ہلکی سانس پھولنا، بار بار پیشاب آنا، نیند ڈسٹرب ہوجانا، تکان جیسی علامات رونما ہونے لگتی ھیں۔ لیکن کسی کسی مریض میں اس طرح کی علامات محسوس نہ ہوتے ہوئے بھی اتفاقاً بلڈ پریشر کا معائنہ کرنے پر بڑھا ہوا ملتا ھے تو ا پنے مریضوں کی مکمل روداد اور گردوں کے طبی افعال انجام دینے جیسی پیتھالوجی جانچیں نیز ای سی جی وغیرہ کرانا چاھیے تاکہ وقت رھتے اسباب مرض کا پتہ چل سکے اور وقت پر اس کا علاج کیا جاسکے۔

اپنے اندر باہر کو نکالتا ہے تو اس کو انقباضی دباؤ یا Systolic Pressure کہتے ہیں جو کہ نارمل 110 ایم ایم ایچ.جی سے 130 ایم ایم ایچ.جی تک ہوتا ہے۔

بلڈ پریشر کو کم یا زیادہ ہونے کی صحیح معلومات حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ مریض کی نصف عمر کے ساتھ 100 کا عدد جوڑ دیا جائے جیسے ایک چالیس سال کی عمر کے مریض کی نصف عمر 20 ہوئی اور اس میں 100 کا عدد جوڑ کر 120 ہوا تو اس چالیس سال کے عمر کے مریض کا نارمل بلڈ پریشر 120 ہوا۔ اسی طرح عمر کے ہر ایک سال کے اضافہ کے ساتھ بلڈ پریشر میں 1/2 ملی میٹر کا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اسی فارمولے کے لحاظ سے مختلف عمروں کے اشخاص کا بلڈ پریشر طے کیا جاتا ہے۔ یعنی ایک چالیس سال کی عمر کے شخص کا بلڈ پریشر 120/80 mm hg. نارمل شمار کیا جاتا ہے جب کہ خواتین میں 110/70 mm hg. نارمل شمار کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات کسی عارضہ کے تحت وقتی طور پر بلڈ پریشر میں اضافہ ہوجاتا ہے یا کبھی کبھی عوارض نفسانیہ کی وجہ سے بلڈ پریشر میں اضافہ ہوجاتا ہے جو کہ آرام کرنے سے کچھ عرصہ کے بعد طبعی ہوجاتا ہے تو اس کو کیفیت مرض میں شمار نہیں کیا جاتا۔ کیفیت مرض اس وقت تسلیم کرتے ہیں جب بلڈ پریشر 150/90 ایم ایم ایچ جی یا اس سے زیادہ متواتر بڑھا ہوا رہے ایسی کنڈیشن میں علاج کی طرف جلد از جلد توجہ دی جانی چاہیے۔

ہائی بلڈ پریشر کے کو مریض کی بعض علامات کو مدنظر رکھتے ہوئے بآسانی تشخیص کیا جاسکتا ہے۔ جب بلڈ پریشر بڑھا ہوا ہوتا ہے تو بعض مریضوں کو دردسر، چکر، چلنے، پھرنے پر ہلکی سانس پھولنا، بار بار پیشاب آنا، نیند ڈسٹرب ہوجانا، تکان جیسی علامات رونما ہونے لگتی ہیں۔ لیکن کسی کسی مریض میں اس طرح کی علامات محسوس نہ ہوتے ہوئے بھی اتفاقاً بلڈ پریشر کا معائنہ کرنے پر بڑھا ہوا ملتا ہے تو اپنے مریضوں کی مکمل روداد اور گردوں کے طبی افعال انجام دینے جیسی پیتھالوجی جانچیں نیز ای سی جی وغیرہ کرانا چاہیے تاکہ وقت رہتے اسباب مرض کا پتہ چل سکے اور وقت پر اس کا علاج کیا جاسکے۔ ورنہ رفتہ رفتہ دیگر عوارضات جیسے قلب پر مسلسل بار پڑنے کی وجہ سے سقوط قلب Heart Failure یا وجع القلب Angina

Pectoris جیسے امراض لاحق ہونے لگتے ہیں۔اس کے تشفی بخش علاج کے لیے ہمیں قدرت نے اسرول نام کی جڑی بوٹی سے نوازہ ہے جس کو انگریزی میں Rauwlfia کہتے ہیں اور اس کا نباتی نام Rauwlfia Sfrpintina Linn ہے اس پودے کی جڑ امراض قلب کے لیے مستعمل ہے جو کہ عطاروں کی دکانوں پر خشک حالت میں دستیاب ہوتی ہے اس کا ذائقہ نہایت تلخ ہوتا ہے اور مزاج تیسرے درجے میں سرد وخشک ہے، افعال وخواص کے اعتبار سے مسکن و منوم ہونے کی وجہ سے اس کا استعمال بے خوابی اور مالیخولیا جیسے امراض میں زمانہ قدیم سے چلا آرہا ہے لیکن جدید تحقیقات کی روشنی میں اسرول کی جڑ میں ہائی بلڈ پریشر کا شافی علاج ہونے کی خاصیت کا پتہ لگایا گیا ہے۔ سب سے پہلے حکیم اجمل خاں نے ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی کی نگرانی میں اس کی تحقیقات کا ذمہ سونپا تھا۔ 1931 سے 1949 کے دوران معلومات فراہم کی گئی جو ہر موثرہ میں فرسٹ گروپ میں (1) اجملین (2) اجملنین (3) اجملسین (4) آیو اجملین (5) نیو اجملین اور سکنڈ گروپ میں سرپٹین اور سرپٹینین شامل ہیں اس کے بعد کی تحقیقات میں 1949 سے 1964 تک مزید جوہر موثرہ کی معلومات میں اضافہ ہوا جس میں (1) راولفین (2) ریزرپین (3) راپین (4) سرپرجین (5) راہمبین (6) اوراہمبین (7) ریزرپنین (8) یوہمبین (9) تھبین (10) پپاورین شامل ہیں۔

اس کے برخلاف ضغط الدم ضعیف Low Blood Pressure کی کنڈیشن بھی کچھ کم پریشان کن نہیں ہوتی کیونکہ اس تکلیف سے متاثر شخص کو بھی متعدد دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ میڈیکل سائنس میں 100 m m hg سے کم ہوجائے تو سمجھنا چاہیے کہ مریض ضغط الدم ضعیف کی طرف جارہا ہے اور اس کو علاج و معالجے کی جانب رجوع ہونا چاہیے لیکن جب بلڈ پریشر 60 ایم ایم ایچ جی سے بھی نیچے چلا جائے تو یہ ہائی پوٹینشن Hypotension کی کنڈیشن کہلاتی ہے جس میں مریض کو بے انتہا ضعف وناتوانی کا احساس ہونے لگتا ہے حتی کہ عدم توجہی پر مریض فوت بھی ہوسکتا ہے لہٰذا اس طرح کی کنڈیشن درپیش ہونے پر مریض ماہر قلب طبیب Heart Specialist کے پاس ریفر کردینا چاہیے۔

ضغط الدم ضعیف Hypotension کی حالت امراض قلب کے ماسوا مختلف اشخاص میں مختلف مرضیاتی کیفیات کے ساتھ ساتھ نفسیاتی کیفیات بھی ذمے دار ہوتی ہیں لیکن اس روگ کا اہم ترین سبب کثرت جریان الدم ہے خواہ وہ کسی بھی وجہ سے ہو مثال کے طور پر خواتین میں کثرت حیض کی بنا پر بھی بلڈ پریشر میں کمی دیکھی گئی ہے۔ اس طرح نکسیر پھوٹنے یا قے الدم یعنی الٹی کے ساتھ خون آنے یا بواسیر الدم یعنی براہ مقعد خون آنے یا پھر آپریشن کے دوران کثرت اخراج دم کے نتیجے میں بھی مریض ہائی پوٹینشن کا شکار ہوتے دیکھا گیا ہے علاوہ ازیں کثرت قے واسہال یا ہیضے کی بنا پر جسمانی ماہیت کی کمی Dehydration کی صورت میں بھی بلڈ پریشر کی کمی سامنے آتی ہے نیز خانگی الجھنیں، کثرت فقر و فاقہ، صدمہ، کسی بڑے نقصان کی خبر سننا یا اچانک کسی سانحہ کے پیش آنے سے بھی ضغط الدم ضعیف لاحق ہوجاتا ہے مختلف امراض میں طویل عرصے تک مبتلا رہنا مثلاً ٹی بی وغیرہ کے مریض کا بھی بلڈ پریشر کم ہونے لگتا ہے بعض امراض قلب

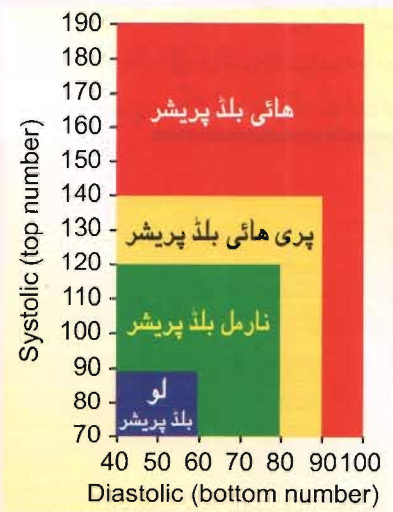

جیسے ضعف قلب کی بنا پر قلب کے درستگی سے خون کو پمپ نہ کرپانے یا قلت الدم Anaemia کے سبب سے بھی بلڈ پریشر گھٹ جاتا ہے۔ بعض اوقات بعض ادویات کے سائیڈ اف یکٹ کی بنا پر بھی بلڈ پریشر میں کمی واقع ہوجاتی ہے۔

قلت الدم ضعیف کی تشخیص کے لیے Sphegm-ominometer کی مدد سے بلڈ پریشر کی جانچ کریں ایسے مریض چکر آنے کی شکایت اکثر کرتے ہیں اس طرح کثرت ناتوانی کا احساس ہونا، آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاجانا، کھڑے ہونے پر سر چکرانا معمولی گھریلو کاموں میں بھی جلدی تھک جانا اور بعض اوقات بے ہوشی بھی آجاتی ہے۔

ضغط الدم قوی کا علاج: انگریزی دواؤں میں فوری سکون کے لیے Amlodipine یا Atenolol فارمولے کی ٹیبلیٹ بہترین نتائج فراہم کرتی ہیں مثلاً Amlokind-At بقدر ضرورت صبح و شام ایک ایک ٹیبلیٹ پانی سے نگلوائیں۔ لیکن بہتر ہوگا کہ یونانی نسخہ جات سے مریض کا تشفی بخش علاج کریں۔

ہائی بلڈ پریشر کے لیے اسرول کو بے حد مفید بتاتے ہوئے مغربی جرمنی کی فرینک فرٹ یونیورسٹی کے پروفیسر 'جارج ہان' نے کہا کہ ''اسرول کے پہنچنے سے پہلے مغربی ممالک میں چالیس فیصدی موتیں صرف بلڈ پریشر کی زیادتی سے ہورہی تھیں اور ہمارے ملک میں اس مرض کی روک تھام کے لیے اتنی مفید و موثر اور بے ضرر دوا کوئی نہ تھی مسیح الملک حکیم اجمل خان کی نظر انتخاب کی داد دینا چاہیے کہ انھوں نے یورپ کو اپنی دواؤں سے روشناس کرانے کے لیے سب سے پہلے اس دوا کا انتخاب کیا۔''
(یونانی ادویہ مفردہ صفحہ نمبر 30)

اسرول کا طریقه استعمال و مقدار خوراک:
اسرول کی جڑ کو ہاون دستہ میں کوٹ کر سفوف بنا کر رکھیں ایک گرام کی مقدار میں رات کو سونے سے قبل دودھ کے ساتھ کھلائیں یا ہمدرد دواخانہ دہلی کی تیار شدہ 'اکسیر شفا' روزانہ ایک گولی سوتے وقت دودھ کے ساتھ استعمال کرائیں۔

قلب کی تقویت کے لیے خمیرہ ابریشم حکیم ارشد والا 3 گرام کی مقدار میں صبح کو کھلائیں۔ مرغن اغذیہ سے پرہیز کرائیں۔ نمک کا استعمال کم کرنے کی ہدایت دیں۔ سمن مفرط ہو تو فربہی کم کرنے کی تدابیر اختیار کرنے کی ہدایت دیں اگر سبب خون کی زیادتی ہو تو بلڈ بینک کو خون عطیہ کردیں۔

ضغط الدم ضعیف کا علاج: ضغط الدم سے اصل سبب کا پتہ لگائیں بعد ازاں اسی کے مطابق علاج و تدابیر اختیار کریں۔ اگر بلڈ پریشر بہت ہی کم ہو تو فوری طور پر کورامین کا انجکشن لگائیں اگر یہ دستیاب نہ ہو تو Decadran انجکشن بھی مفید ہے اس کے ساتھ ہی گلوکوز سیلائن کی بوتل چڑھائیں اگر قے و اسہال سبب ہو تو نارمل سیلائین کی بوتل چڑھائیں۔ قلت الدم کی صورت میں فولاد سے مرکب ادویہ استعمال کرائیں۔

یونانی علاج: (1) جواہر مہرہ ایک عدد خمیرہ گاؤزباں عنبری جواہر والا یا دواء المسک معتدل جواہر والی پانچ گرام کے ہمراہ صبح وشام استعمال کرائیں۔

غذا و پرہیز: سوڈیم اور پوٹیشیم سے بھرپور غذائیں کثرت سے کھلائیں۔ کھانے میں نمک کی مقدار میں تھوڑا اضافہ کردیں۔ موسمی پھل اور ہری سبزیاں زیادہ استعمال کریں۔

■

Dr. Musharraf Ali, BUMS (Aligarh)
Shafi Clinic, Baduzai Peshawari,
Shehajahanpur - 182222 (UP)

سیارۂ سرخ
مریخ کی جانب پیش قدمی

عظیم اقبال

لباس سرخ پہن کر جو وہ جواب نکلا
پناہ مانگتا مریخ آسماں نکلا
(آتش)

یہ واقعہ ہے کہ اردو شاعروں نے قدرت کے مظاہر سے بار ہا تحریک لی ہے۔ اس کی ایک مثال منقولہ شعر ہے۔

دراصل مریخ، منگل ستارہ، جلاد فلک، بدھ کا دیوتا، ایک آتش مزاج یا آتش سیارے کا نام ہے جو ساتویں آسمان پر ہے۔ مریخ کے متعلق روایتیں، کہاوتیں، سوچیں زیادہ ہیں۔ اس کی حقیقت کا علم کم ہے۔ اس لاعلمی کے سبب مریخ کے نام سے لوگ خوفزدہ ہوتے رہے ہیں۔

مریخ آفتاب سے چوتھا سیارہ ہے جو سورج کے گرد 687 دنوں میں ایک گردش کرتا ہے۔ یہ سورج سے 227.9 میلین کیلومیٹر پر واقع ہے، جب کہ زمین سے سورج کی دوری تقریباً 50 میلین کیلومیٹر ہے۔

سترہویں صدی کے اختتام سے لے کر اب تک سیارہ مریخ کے متعلق مختلف قیاس آرائیاں ہوتی رہی ہیں۔ مثال کے لیے 1698 میں ڈچ ماہر فلکیات 'کرسچن گھر جن نے اپنی تصنیف میں مریخ پر ذہین ترین افراد کی موجودگی کا ذکر کیا ہے۔ پھر 1784 میں 'سو ولیم ہرمیلس نے رقم کیا کہ مریخ کے سیاہ علاقے سمندر ہیں اور ہلکے رنگ کے علاقے زمینی حصے ہیں۔ انھوں نے بھی وہاں تیز فہم افراد کی موجودگی کا یقین دلایا۔ بعدازاں 1854 میں ولیم ہاویل نے کہا کہ مریخ پر گہرے سبز رنگ کے سمندر ہیں اور زمین سرخ رنگ کی ہے۔ انھوں نے تحریر کیا کہ یہ حیرت ناک بات ہوگی اگر وہاں کسی ذی روح کا وجود ہو۔

اسی طرح 1860 میں 'امانوئل رائس نے تسلیم کیا کہ مریخ پر موجود سیاہ رنگ سمندر نہیں ہیں، بلکہ وہ نباتات سے پُر خطے ہیں۔

1867 میں برطانوی ماہر فلکیات رچرڈ اینتھونی پراکٹر، نے سیارۂ مریخ کا نقشہ تیار کیا جن میں براعظموں اور بحروں کی نشاندہی کی گئی۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ 1898 میں انگریز مصنف ایچ جی ویلز (1866-1946) نے 'دوار آف ورلڈز' یہ معنی عالمین کی جنگ ناول کی اشاعت کی۔ ناول میں مریخ کے لوگوں کے ذریعہ زمین پر حملہ کو قلمبند کیا گیا۔

ابھی ڈیڑھ سو سال بھی نہیں گزرے کہ پہلے پہل ایک اطالوی فلک داں 'وینجونشی شیاپارلی' نے اپنے 8.75 انچ کے ایک ٹیلس کوپ سے مریخ کا مطالعہ کیا۔ اپنے مطالعہ میں اُس نے 'کنالی' کا ذکر کیا۔ 'کنالی' انگریزی کے کنال (Canal) کی اطالوی شکل ہے۔

ایک دوسرے ماہر فلکیات پارسیول لاویل، نے 1900 میں اس حقیقت کی نشاندہی کی کہ مریخ پر آڑی، ترچھی لکیریں، نظر آتی ہیں، جنھیں دیکھ کر ایسا گمان ہوتا ہے کہ ان سے ہوکر نہریں رواں، دواں ہوں گی اس کے نظریات اس کی موت (1914) تک رائج رہے۔

1924 میں ایک اہم واقعہ یہ ہوا کہ اطالوی سائنسداں مارکونی (Guglilemo Marconi) (1874-1937) نے دعویٰ کیا کہ اس نے مریخ سے آئے ریڈیو سگنل کھتے ہیں۔ اس کے بعد اس سال جب مریخ زمین کے بہت قریب تھا، امریکہ میں ریڈیو اسٹیشنوں نے اپنے سارے پروگرام روک دیے تاکہ مریخ سے آنے والے پیغامات سنے جاسکیں۔ ایسا امریکی حکومت کی ہدایت پر ہوا۔

1938 میں ایک اہم واقعہ یہ ہوا کہ 'آرسن ویلس ریڈیو نے ہزار ہا سامعین کو یہ بتا کر متفکر کردیا کہ مریخ کے لوگوں نے زمین پر حملہ کردیا ہے اور امریکہ کا نیوجرسی شہر ان کا پہلا نشانہ ہے۔

ان ساری باتوں کی کوئی حقیقت نہ تھی یہ سب افواہیں تھیں۔ مریخ پر 'کینلس' یا نہروں کا وجود ہے، نہ وہاں کوئی حملہ آور قوتیں موجود ہیں۔ سچ پوچھیے تو مریخ سے متعلق لوگوں کے تجسس کا استحصال ہوا جس کے پس پردہ مصنف بھی تھے اور سائنس داں بھی۔ اس عمل میں بدنیتی کسی کی نہ تھی جو کچھ ہوا، سادہ دلی سے ہوا۔ لیکن جو بھی ہوا غیر ذمہ داری سے ہوا۔

وقت بدلا تو پھر سنجیدہ مطالعات کا دور شروع ہوا، تاہم گزشتہ 50 برسوں سے متواتر ہو رہے سنجیدہ مطالعات کے باوجود اس سرخ سیارے کے رازوں کو سائنسداں سمجھ پانے میں تقریباً ناکام رہے ہیں۔

مریخ کو سمجھنے کی موجودہ کوششوں کی کڑی میں پہلی کوشش 14 جولائی 1965 کو شروع ہوئی جب میرینر-4 (Mariner-4) کو مریخ کی تصویریں لینے کے لیے بھیجا گیا۔ اس خلائی طیارے نے پہلی دفع اسی سیارے کی تصویریں کافی قریب سے لیں ان تصویروں کے حصول کے بعد مریخ کی سطح پر نباتات یا حیوانات کے وجود کا چرچہ شروع ہوا۔ پھر بھی وثوق سے کچھ کہا جاسکا اور نہ کسی نتیجے پر پہنچا جاسکا۔

دوسرا خلائی طیارہ 'وائکنگ-1' (Viking-1) مریخ کی سطح پر جولائی 1976 میں اُترا۔ اسی طیارے سے مرسلہ تصویروں کے بعد مریخ پر زندگی سے متعلق کسی خیال کو مسترد کردیا گیا۔ تاہم سائنسدانوں کو اُمید تھی کہ وہاں پانی کے ہونے اور پانی کے اندرون حیاتات کے وجود سے متعلق ثبوت یقیناً مل جائیں گے۔ کوششیں جاری رہیں۔ لیکن یہ ثمر بار نہ ہوئیں۔

ایک نیا خلائی جہاز، پاتھ فائنڈر (Path Finder) 1997 میں مریخ کی سطح پر اترا۔ اس نے بھی وہاں سے تصویریں ارسال کیں یہ حیرت انگیز تھیں، لیکن ان سے بھی مریخ کے راز افشانہ ہوسکے۔ اب بھی مزید چھان بین کی گنجائش رہی۔

یہ حقیقت ہے کہ سائنسداں تاحال مریخ کے بارے میں صحیح معلومات نہیں حاصل کرسکے ہیں۔ ان کا سارا قیاس اسی حقیقت پر قائم ہے کہ مریخ ہمارے نظامِ شمس کا واحد سیارہ ہے جو تنہا زمین سے مماثلت رکھتا ہے۔

اس سیارے میں ہماری دلچسپی اِس مشابہت کی بنا پر ہے۔

بہرحال، گزشتہ دنوں کی تحقیقات سے یہ ظاہر ہوا ہے کہ مریخ پر کافی مقدار میں منجمد پانی موجود ہے۔ یہ پانی مریخ کے دونوں قطبوں پر جمع ہے اور باقی ماندہ جگہ پر مٹی ہے۔

یہ سوچنا ہی کافی خوش کن لگتا ہے کہ زمین کے علاوہ میں کوئی دیگر سیارہ ہے، جہاں زندگی ہے۔ انسان اور خلا کے درمیان جو رشتہ ہے، اس میں ایک نئے باب کا اضافہ ہونے والا ہے۔ اس سروکار سے ہم کافی پرامید ہیں۔

ناسا (NASA) کے مارس اوڈی سی (Mars Odyssey) نامی خلائی طیارے نے 2002 میں مریخ کی سطح کے نیچے ایک وسیع برف کے سمندر ہونے کے اشارے دیے تھے۔

مریخ پر پانی کی موجودگی سے اس بات کا امکان ہے کہ مریخ پر زمین جیسی زندگی ہے۔ مریخ پر زندگی کا پتہ لگانے کے لیے 'ناسا' نے ڈیلٹا-2 (Delta-2) راکٹ کے ذریعے 'اسپرٹ' (Spirit) اور 'اپورچونٹی' (Opportunity) نام کے دو مارس روور (Mars Rorer) طیارے مریخ کی جانب روانہ کیے۔ یوں ہماری سعی چلتی رہتی، لیکن کل ملا کر یہ لاحاصل ہی رہی۔

مریخ میں سائنسدانوں کی دلچسپی کا سبب یہ ہے کہ اس میں زمین سے مشابہت ہے۔

آیئے اب ذرا زمین اور مریخ کا تقابلی مطالعہ کریں:

موضوع	زمین	مریخ
قطر	7926 میل (12,756 کیلومیٹر)	تقریباً 4222 میل (6794 کیلومیٹر)
زندگی	ہاں	نامعلوم
آفتاب سے فاصلہ	ایک اسٹرونیکل یونٹ یا 15 کروڑ کیلومیٹر (93 ملین میل)	1.381 اسٹرونیکل یونٹ تک
درجہ حرارت	47.3 فارینائٹ (8.50 سیلس ایس) گرمی میں بہت گرم اور سردی میں بہت سرد	بیشتر اوقات بے حد خنک موسم رہتا ہے۔
متوجہ کرنے والی خاص بات	خلا سے نیلے رنگ کی دکھائی دیتی ہے، کیونکہ زمین کے دو تہائی حصے پر پانی ہے۔	خلا سے سرخ رنگ کا دکھائی دیتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہاں فولاد کے ذرات بکھرے پڑے ہیں۔
کاسمک تابکاری	مضبوط مقناطیس خطے کے سبب محفوظ	کمزور، مقناطیسی خطے کے سبب مائل پیدا کرنے والی
موسم	ہری کین، ٹائفون اور ٹارناڈو بڑے مسائل ہیں۔ کیلی فورنیا کے خطے میں زبردست دھند افریقہ کے کئی خطوں میں بارش کی کمی۔	ہر چہار سو دھول کی آندھی چلتی ہے، جو زمینی طوفان سے زیادہ شدید اور خطرناک ہے۔
سربستہ راز	زندگی کی ابتدا کیونکر ہوئی	کیا وہاں زندگی کا وجود ہے؟
دن	23 گھنٹے 56 منٹ	24 گھنٹے 37 منٹ
سال	365 دن	687 دن
کششِ ثقل	باقاعدہ	زمین کا 38 گنا زیادہ
سیارچے	چاند	دو چاند (i) فوبوس (ii) ڈیموس
کرہ باد	76 فی صد نائٹروجن 21 فی صد آکسیجن اور کم مقدار میں آرگن کاربن ڈائکسائڈ اور نیون	95.3 فی صد کاربن ڈائکسائڈ 0.5 فی صد آکسیجن
پانی	کافی	تاحال تصدیق نہیں ہوئی ہے
برف	ہاں	ہاں

ان حقائق سے قطع نظر، 6 اگست 2012 کو دنیا بھر کے اخبارات نے مریخ کے حوالے سے جو اہم خبر شائع کی ہے وہ یہ:

''امریکی خلائی تحقیقی ادارے ناسا کی طرف سے مریخ کی جانب بھیجی گئی اور روبوٹ گاڑی کیوریوسیٹی (Curiosity) آج، پیر کی صبح کامیاب سے اس سرخ سیارے کی سطح پر اتر گئی۔''

بے شک، مریخ پر کیوریوسیٹی کی کامیاب لینڈنگ ٹیکنالوجی کا ایک بے مثال کارنامہ ہے۔ یہ اب تک کسی بھی روبوٹ گاڑی کی کسی اجرام فلکی پر اُتارنے کی پیچیدہ ترین لینڈنگ تھی۔

ناسا کی طرف سے یہ مشن گزشتہ برس نومبر میں مریخ کی طرف بھیجا گیا تھا۔ اس مہینے ترین مشن پر 25 بیلین ڈالر لاگت آئی ہے۔ کیوریوسیٹی نامی روبوٹ مریخ کے ایک سال یا زمین کے 686 دنوں تک مریخ پر اپنا کام کرتا رہے گا۔ دو سال تک یہ وہاں اس بات کے ثبوت تلاش کرے گا کہ سرخ سیارے پر کبھی ایسے مادے پائے جاتے تھے جو زندگی کے لیے ضروری ہیں۔

مشن کنٹرول میں سائنس داں بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے تھے کہ روبوٹ صحیح سلامت اتر پائے گا یا نہیں جیسے ہی کامیابی کی خبر ملی، اُن میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ سب نے سرشاری کا مظاہرہ کیا۔ ناسا نے اسے روبوٹِ خلائی پرواز کا سب سے پیچیدہ عمل بتایا۔ کار کی سائز کی روبوٹ بالکل اُسی جگہ اتری، جہاں اُسے اترنا تھا۔ یوں یہ مشن کامیاب رہا ہے۔ اس کے لیے مشن سے وابستہ افراد کو ارباب اقتدار کی جانب سے دلی مبارکباد ملی ہے۔

یہ امریکن مشن تھا۔ اب ہندوستان نے بھی مریخ تک اپنی رسائی کے لیے عمل پیرا ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ جلد ہی اس پر کام شروع ہونے کی توقع کی جا رہی ہے۔

تازہ خبر یہ ہے کہ امریکہ کے ایک ارب پتی نے اگلے 12 سے 15 سال میں مریخ پر خلابازوں کو بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے۔ انٹرنیٹ کے کاروبار سے منسلک ایک امریکہ شہری ایلن ویسٹ (Allen West) نے ایک انٹرویو میں کہا ہے کہ بارہ سے پندرہ سال میں یہ ممکن ہو پائے گا کہ مریخ کی زمین کو انسانی قدم چھوئے۔ ایلن ویٹ 2010 میں سٹیلائٹ کے ذریعہ خلا میں راکٹ بھی بھیج چکے ہیں۔ ان کا مزید کہنا تھا کہ ابھی ان کی کمپنی جس راکٹ پر کام کر رہی ہے اس پر مریخ تک جانے کی صلاحیت ہوگی۔

کہتے ہیں کہ روم ایک دن میں نہیں بنا تھا۔ اس قول سے مراد یہ ہے کہ ہر بڑے کام کی تکمیل میں وقت لگتا ہے، صلاحیت لگتی ہے، صبر آزمائی ہوتی ہے، اخراجات کا طویل سلسلہ چلتا ہے۔ پھر کہیں جا کر خاطر خواہ نتیجہ نکلتا ہے۔ مریخ کی جانب ہماری پیش قدمی کے سلسلے میں بھی ان ساری باتوں کو مدنظر رکھنا ہوگا۔ مریخ کی پہنچ میں دیر ہے اندھیر نہیں، کیونکہ جہاں چاہ ہے وہاں راہ ہے۔ ہم مستقبل سے پرامید ہیں۔ ہمارا اگلا قدم یقیناً سرخ سیارے پر پڑے گا۔ اتنا ہی نہیں، اگلے اور پھر اگلے قدم کی باری بھی جلد آئے گی، کیونکہ

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

□

Azim Iqbal, Adabistan, Ganj No One, Bettiah - 845438 (Bihar)

تبصرہ وتعارف

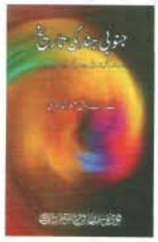

جنوبی ہند کی تاریخ

مصنف: کے اے نیل کنٹھ شاستری

صفحات: 576، قیمت: 137 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر مجیب احمد خان،

ای 62، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی 25

پیش نظر کتاب سولہ باب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب 'تاریخی ماٰخذ کا جائزہ' ہے۔ اس باب میں مورخین اور سیاحوں کے دستاویزوں، حکمراں خاندانوں کی سلسلہ وار علمی وادبی و ثقافتی، سماجی و مذہبی سرگرمیوں اور فتوحات کا ذکر کیا ہے۔ گوانھوں نے بطور ماخذ پتھر اور تانبے کے سکے اور ملکی اور بیرونی ادب کو پیش کیا جو تاریخ میں بے حد اہم اور معتبر خیال کیے جاتے ہیں۔

دوسرے باب 'تاریخی پس منظر میں جغرافیائی حالات' میں شمال وجنوب، جزیرہ نما، مغربی گھاٹ، درے اور تجارتی راستے، مشرقی گھاٹ، دکن کا پلیٹو، بارش اور نباتات، ندیاں — گوداوری، کرشنا، بھیم، تنگ بھدرا، کاویری، نرمدا اور تاپتی، بندرگاہ اور مغربی ساحل کی پٹی، مشرقی ساحل اور دریاؤں کے ڈیلٹے اور کارومنڈل ساحل وغیرہ کا جغرافیہ پیش کیا ہے۔

تیسرے باب 'ابتدائی اقوام اور تہذیبیں' میں قدیم پتھر کا زمانہ، نیا پتھر کا زمانہ، چٹانوں پہ مصوری، بڑے بڑے پتھروں کا عہد اور ان کی تاریخ، آدی چنلور اور نیلگری نسلوں کی اقسام، ہند آریائی، دراوڑ، آسٹروایشیاٹک اور مغربی ایشیا میں دراوڑ زبان سے لسانیاتی مشابہت کے تحت یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ پورے ہندوستان میں سب سے پہلے آسٹروایشیائی پھر دراوڑ اور اس کے بعد ہند آریائی زبانیں رہی ہوں گی۔

چوتھے باب 'تاریخ کا آغاز — آریوں کا عروج' ہے۔ پانچویں باب 'موریہ سلطنت کا زمانہ' میں چندر گپت موریہ کے عروج وزوال پر اچھی گفتگو کی ہے۔

چھٹے باب 'ستواہن اور ان کے جانشین' میں ستواہنوں کے عہد حکومت کو موثر پیرائے میں بیان کیا ہے اور شجرے دیے ہیں۔ ساتویں باب 'سنگم اور اس کے بعد کا عہد' پر بحث کی ہے۔

آٹھویں باب 'تین سلطنتوں کا تصادم' میں شاہی خاندانوں کی یورشیں، ریاست کے نظم ونسق وغیرہ موضوعات پر گفتگو کی ہے۔

نواں باب 'دومملکتوں کا توازن' ہے۔ چلوکیوں اور چولوں نے سلطنتوں کے توازن کو برقرار رکھا ہے۔ اس میں کئی شاہی خاندانوں کی یورشیں اور ان کے عروج وزوال کی کہانی بیان کی ہے۔ آخر میں کلیانی کے چالوکیے، مشرقی چالوکیے، چول اور راشٹرکوٹ شاہی خاندانوں کے شجرے دیے ہیں۔

دسواں باب 'چار سلطنتوں کا عہد' ہے۔ گیارہویں باب 'بہمنی اور وجیہ نگر سلطنتوں کا عروج' میں دکن پر خلجیوں کا پہلا حملہ اور دیوگری کی فتح، ہویسلوں اور پانڈیہ دیشوں پر حملے، پانڈیہ دیش میں خانہ جنگی اور تغلقوں کا حملہ، یادووں اور کاکتیہ سلطنتوں کا زوال، وجیہ نگر کا قیام، بہمنی سلطنت کا قیام، علاء الدین بہمن شاہ اور بہمنی سلطنت کا زوال پر مفصل گفتگو کی ہے اور بہمنی سلطانوں کا شجرہ ہے۔

بارہویں باب 'وجیہ نگر سلطنت' میں ہری ہراول، بکا اوّل، مدورا کی سلطنت کا خاتمہ، وجیہ نگر کی تباہی، ڈچ اور انگریزوں کی آمد اور کرناٹک سلطنت کا زوال پر قلم فرمائی کی ہے۔

تیرہویں باب 'معاشی و معاشرتی حالت' میں درباری زندگی، عوام، زراعت، نقل وحمل، تاجر اور بحری تجارت، سکے اور ناپ تول کے پیمانے پر بحث کی ہے۔

چودہویں باب 'ادب' کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ سنسکرت ہے جس میں سوتر، تفسیر، بھاگوت، بیلے لیٹرس، صنائع بدائع، فلسفیانہ ادب، فرہنگ نویسی، صرف ونحو، موسیقی ورقص وغیرہ موضوعات شامل ہیں۔ دوسرا حصہ تامل میں بعد کا سنگم ادب، تیسرا حصہ کنڑ میں پمپا سے قبل کا ادب، چوتھا حصہ تیلوگو کا ابتدائی ادب اور پانچواں حصہ ملیالم میں ابتدائی ادب وغیرہ موضوعات پر پراثر، معنیٰ خیز اور مدلل بحث کی ہے۔

پندرہویں باب 'مذہب اور فلسفہ' میں بھگتی کے مختلف مکاتب خیال، بدھ اور جین دھرموں کے خلاف ردِعمل، وجیہ نگر حکومت کے زمانہ میں مندر اور تہوار، بدھ مت، جین دھرم، آجیوک، اسلام اور عیسائی مذہب وغیرہ موضوعات پر روشنی ڈالی گئی۔ سولہواں باب 'فن کاری اور طرزِ تعمیر' میں شمالی ومغربی دکن کے چیتیہ اور وہار، اڑیسہ کی جین گپھائیں، گوداوری اور کرشنا کے نشیبی علاقوں میں بدھوں کی عبادت گاہیں، مغربی دکن کا فنِ تعمیر (پانچویں صدی)، اے ہول اور پٹاڈکل کے مندر، مغربی دکن میں چٹانوں کے فنِ تعمیر کا آخری دور، پلووں کے عہد حکومت میں چٹانوں کا فنِ تعمیر، چولوں کے ابتدائی مندر، تنجور کا بڑا مندر، چولوں کے عہد میں فن بت سازی اور کانسے کا کام، پانڈیوں کا طرزِ تعمیر، مغربی دکن کے چالوکیے مندر، ہویسلوں کے عہد حکومت میں طرز تعمیر اور فن بت سازی، اڑیسہ کا طرز تعمیر، وجیہ نگر کا عہد، غیر مذہبی عمارتیں، مدیورا طرزِ تعمیر، بہمنی طرز تعمیر، ہندو طرزِ تعمیر وغیرہ موضوعات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

ہندوستان کی تاریخ میں 'جنوبی ہند کی تاریخ' ایک بے حد اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے مصنف کے اے نیل کنٹھ شاستری ایک معتبر اور عظیم تاریخ داں ہیں۔ انھوں نے اس کتاب میں نہایت معتدل اور منصفانہ رویہ اختیار کیا ہے۔ قارئین اس کتاب کی تاریخی اہمیت وافادیت کو مدنظر رکھتے ہوئے پسند فرمائیں گے۔

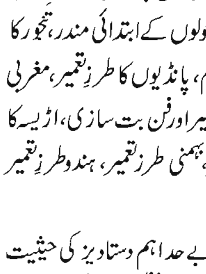

قدیم ہندوستان کی تاریخ

مصنف: رماشنکر ترپاٹھی، مترجم: سیدنخی حسن نقوی

صفحات: 581، قیمت: 138 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر منور حسن کمال، G-5/A، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی

'قدیم ہندوستان کی تاریخ' کے مصنف رماشنکر ترپاٹھی اور مترجم سیدنخی حسن نقوی

ہیں، یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی نے شائع کی ہے۔ اس کتاب کے تین حصے ہیں اور اس میں (19) ابواب ہیں۔

اس کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ برہمنوں، بودھوں اور جینیوں کے ادبی خزانے میں ایک کتاب بھی ایسی نہیں ہے جو کتاب سلاطین، تاریخ لیوی یا ہیروڈوٹس کی تاریخ کا مقابلہ کر سکے، اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہندستان کا ماضی عظیم الشان کارناموں سے بالکل عاری ہے، اس کے برخلاف وہ تمام عہد، جرأت آفریں کارناموں، معاشرتی انقلاب اور خاندانی تغیرات سے بھرپور ہے، لیکن حیرت ہوتی ہے، جب ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ تمام واقعات ترتیب کے ساتھ باقاعدہ تاریخ کی صورت اختیار نہ کر سکے۔

ہندستان کی قدیم تاریخ کو اگر تلاش کیا جائے تو اس کے ابتدائی نقوش یا پہلی قابلِ ذکر کوششوں کے طور پر ہندستان کی دو رزمیہ نظموں رامائن اور مہابھارت کو پیش کیا جاسکتا ہے۔

غیرملکی اسناد کے حوالے سے قدیم ہندستان کی تاریخ ان غیرملکی سیاحوں نے بیان کی ہے، جو یہاں آئے اور کچھ عرصہ یہاں ان کا قیام رہا۔ مثلاً ہیروڈوٹس لکھتا ہے کہ شمالی مغربی ہندستان کا سیاسی تعلق پانچویں صدی قبل مسیح میں سلطنت فارس سے تھا۔ اس کے بعد پنجاب اور سندھ پر سکندر کے حملے کا ذکر ملتا ہے۔ رماشنکر ترپاٹھی نے ان موضوعات پر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے یہ بھی بتایا ہے کہ اس کے بعد مسلم مورخین نے ہندستان کی تاریخ کے حوالے سے اپنی کتابوں میں ماخذ کے حوالے سے قابلِ ذکر روشنی ڈالی ہے ان مورخین میں سرفہرست البیرونی کا نام لیا جاسکتا ہے۔ وہ محمود غزنوی کے ہمراہ ہندستان آیا اور 1030 میں اپنی تحقیق ہند لکھی۔ اس کتاب میں ہندستان سے متعلق معلومات کا بیش بہا ذخیرہ موجود ہے، حالانکہ اس سے قبل کے مسلم مورخین بلاذری، سلیمان (سلسلۃ التواریخ اور مسعودی (مروج الذہب) کے نام بھی آتے ہیں۔ ان کے علاوہ حسن نظامی کی تاج الماثر، میرخوند کی روضۃ الصفا، خواندمیر کی حبیب السیر، فرشتہ کی تاریخ فرشتہ، نظام الدین کی 'طبقات اکبری' منہاج الدین کی 'طبقات ناصری' عینی کی 'تاریخ یمینی' اور 'ابن اثیر کی 'تاریخ الکامل' بھی تاریخ ہند پر روشنی ڈالتی ہیں۔

اس کے علاوہ تاریخی ماخذ جنھیں اثری ماخذ کہا جاتا ہے کتبے، سکے اور عمارتیں ہیں، جو ہمارے لیے تاریخ کی مشعل روشن کرتے ہیں۔

اس کے بعد ہجری عہد کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے مصنف نے بتایا ہے کہ وہ اپنے رہن سہن اور کھانے پینے کے لحاظ سے اپنی زندگیاں کس طرح گزارتے تھے۔ ساتھ ہی اس بات پر بھی کھل کر بحث کی گئی ہے کہ دراوڑ ہندستان کی سب سے پرانی مہذب نسل سے تعلق رکھتے تھے۔

ہڑپا، موہن جوڈارو، معاصر تہذیبوں عراق، ایلم اور مصر اس عہد میں تانبے اور پیتل کی اشیا اور پتھر کے ہتھیاروں اور برتنوں رگ ویدی عہد میں آریوں کی اصل اور وطن، رگ ویدی آریاؤں کا جغرافیائی پس منظر، ان کے پیشے، تجارت اور زندگی کی دیگر خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ رزمیہ شاعری کے تحت رامائن کی تاریخی حیثیت، مہابھارت کی تاریخی اہمیت کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی زیر بحث لائی گئی ہے۔

اگلے باب گوتم بدھ کا عہد ہے۔ اس باب میں بدھ مذہب سے قبل ہندستان کے سیاسی حالات اور مذہبی روایتوں اور حکایتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے اس عہد کی ریاستوں سے متعلق بھی گفتگو کی گئی ہے۔ اس کے بعد ہندستان کے بیرونی دنیا سے روابط، سکندر کا حملہ، موریہ سلطنت اور اس کے عہد کے انتظامات، اشوک، اس کی رواداری اور خصوصیات اور اس کی یادگاروں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ پھر موریہ خاندان کی تباہی، ودربھ سے جنگ، ساتواہن خاندان، ساتواہن اور آندھر، ساتواہنوں کی اصل، کلنگ کا راجہ کھارویل، پارتھیا اور باختر کی بغاوت، یونانی روابط اور اس کے نتائج بیان کرنے گپت خاندان کے شہنشاہ چندر گپت سمدر گپت ان کی فتوحات، غیرملکی حکومتوں سے تعلقات چندر گپت دوم کی تخت نشینی بڑے دلچسپ تاریخی شواہد میں، جن پر موثر انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

شمالی ہند میں مسلمانوں کی آمد پر گفتگو ہے۔ چچھ کے لڑکے داہر کو عربوں کے زبردست حملے کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اس کے سبب پر گفتگو کی گئی ہے۔

قرونِ وسطیٰ میں شمالی ہند کے ہندو خاندانی، داستانوں کے فرضی حکمراں، بنگال کی ابتدائی تاریخ، وارنگل کے کاک تیہ، مدورا کا پانڈیہ خاندان، جنوبی ہند میں ریاستوں کے عروج و زوال، انتظامی حکومت اور اقتصادی حالت سے یہ کتاب واقف کراتی ہے۔

'قدیم ہندستان کی تاریخ' میں تمام تر گفتگو حوالوں کے ساتھ کی گئی ہے جس سے اس کتاب کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے۔ یقین کیا جانا چاہیے کہ یہ کتاب ہندستان کی تاریخ کی اصل اور جڑیں تلاش کرنے والوں کے لیے خصوصاً اور ہندوستان کی تاریخ و ثقافت سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے عموماً ایک گراں مایہ تحفہ ثابت ہوگی۔

اردو میڈیا

ترتیب: ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین

صفحات: 398، قیمت: 105 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: انور پاشا، جے این یو، نئی دہلی

اردو اور میڈیا کا تعلق خاصا پرانا رہا ہے۔ اردو میں شروع سے ہی بطور زبان ایسی صفات مضمر رہی ہیں جن کی بدولت اسے ترسیل و ابلاغ کے لیے موزوں ترین زبان تسلیم کیا گیا ہے، اپنے آغاز کے ساتھ ہی اردو لنگوا فرانکا کے طور پر برصغیر میں عوامی رابطے کا وسیلہ بن گئی، یہ اس کی ترسیلی قوت کا بین ثبوت ہے۔ برصغیر میں اخبارات و رسائل ہوں یا ڈرامے اور سنیما ان کی ابتدا اور فروغ اردو کے حوالے سے ہی ہوا، رفتہ رفتہ تکنیکی ایجادات اور انفارمیشن تکنالوجی میں آئے انقلابات نے جب میڈیا کی ماہیت کو یکسر بدل کر رکھ دیا، تب بھی اردو کے استعمال کی گنجائشوں میں کمی واقع نہیں ہوئی، آج بھی ریڈیو، ٹی وی اور سنیما میں اردو زبان اور اس کے الفاظ کے استعمال کو فوقیت حاصل ہے، حتیٰ کہ جدید تر انفارمیشن کے وسائل کے ساتھ بھی اردو خود کو ہم آہنگ کرنے میں مصروف ہے، انٹرنیٹ ہو یا آن لائن میڈیا، سافٹ ویئر آج اردو داں طبقہ بغیر کسی دشواری کے اردو زبان کے توسط سے ان وسائل سے استفادہ کر رہا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب 'اردو میڈیا' اردو اور میڈیا کے باہمی رشتے کا بھرپور احاطہ کرنے کے ساتھ اردو میڈیا کے گوناگوں پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔ اس کتاب میں بڑی تعداد میں ایسے مضامین کو شامل کیا گیا ہے جو اردو میڈیا کے روایتی اور جدید تر ابعاد او جہات کا نہ صرف احاطہ کرتے ہیں بلکہ حددرجہ معلوماتی اور کارآمد ہیں، میڈیا اور ترسیل (communication) کے theoritical پہلوؤں اور میڈیا کی مختلف شاخوں کی تاریخ وارتقا سے متعلق معلوماتی مضامین کے علاوہ متعدد ایسے مضامین شامل کتاب ہیں جو میڈیا کے عملی پہلوؤں اور تقاضوں سے متعلق معلومات کے دریچے اردو قارئین پر وا کرتے ہیں۔

اردو صحافت کے ضمن میں خبر نگاری، ادارت، اداریہ نویسی، ایڈیٹنگ، سب ایڈیٹنگ، نیوز رپورٹنگ، سیاسی رپورٹنگ، بزنس رپورٹنگ، قانونی رپورٹنگ، پریس کانفرنس، انٹرویو، انٹرویو کی تکنیک، ملاقات نگاری، تبصرہ نگاری، تصویری صحافت، کارٹون نگاری، اخباری ترجمہ نگاری صفحہ سازی یا پیج میکنگ کی تکنیک وغیرہ سے متعلق لازمی معلومات اور

تفصیلات پر مشتمل مضامین کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ جبکہ ریڈیو کے ضمن میں ہندوستان میں ریڈیو نشریات، کمیونٹی ریڈیو، ٹیلی ویژن کا آغاز و ارتقا، ٹی وی، رائٹنگ کے اصول، ہندوستانی سنیما اور اردو، جیسے اہم اور معلومات مضامین اس کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ کرتے ہیں، علاوہ بریں وہ جدید ترین وسائل جو آج عوامی ذرائع ترسیل کا اہم حصہ بن گئے ہیں ان سے متعلق تازہ تر مضامین مثلاً انٹرنیٹ اور اردو، آن لائن میڈیا اور اردو، اردو ڈیجیٹل لائبریری اور آن لائن اردو کورس، اردو سافٹ ویئر، بلاگ، اینی میشن وغیرہ اس کتاب کی عصری معنویت اور اہمیت میں اضافہ کرتے ہیں۔ البتہ ڈرامہ اور سنیما سے متعلق پہلو ذرا تشنہ نظر آتا ہے۔ اگرچہ مضامین ڈرامے سے متعلق اور دو ایک اور مضامین سنیما کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرنے والے شامل ہوتے تو کتاب کی افادیت میں مزید اضافہ ہوتا۔

بہرکیف کتاب واردو میڈیا، اس لحاظ سے بے حد کارآمد ہے کہ آج میڈیا ہماری زندگی کا ایک اہم جزو بن چکا اور ہر قدم پر ہمارا واسطہ ان نئے اور بدلتے وسائل سے ہے لہٰذا یہ عین لازم ہے کہ ہماری زبان ان وسائل سے پوری مستعدی کے ساتھ ہم آہنگ ہوتا کہ طوفانی رفتار سے بدلتی اور ارتقا پذیر زندگی میں ہم پیچھے نہ چھوٹ جائیں۔ اس لیے جہاں اس بات کی ضرورت ہے کہ نئی معلومات کو اردو قارئین تک پہنچایا جائے وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ اردو کو نئے تکنیکی وسائل کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی سمت میں ہر سطح پر کوشش کی جائے۔

میڈیا کی اہمیت اور اس کے غالب عمل دخل کے پیش نظر آج یونیورسٹی اور کالجوں میں میڈیا کے شعبے قائم ہو رہے ہیں اور میڈیا پر تحقیق اور مطالعے کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو جارہا ہے، اردو میڈیا بھی اپنے ارتقا کی طرف مائل ہے لیکن میڈیا کے اردو طالب علموں اور اساتذہ کے سامنے ایک بڑا چیلنج میڈیا اور اس کے نئے اور تازہ تر تکنیکی جہات سے متعلق نصابی کتابوں کی فراہمی کا ہے۔ اس تناظر میں ڈاکٹر خواجہ اکرام کی مرتب کردہ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ذریعہ شائع کردہ زیر تبصرہ کتاب 'اردو میڈیا' اس سمت میں ایک اہم قدم ہے۔ ایسی کتابوں کی اشاعت سے اردو میڈیا کے طلبہ اور اساتذہ کی ضرورتوں کی تکمیل ہوگی۔ میں اس کتاب کی اشاعت پر مرتب اور کونسل دونوں کو مبارکباد دیتا ہوں۔

پریمی رومانی ... فکر و فن

مصنف: پروفیسر محمد اسداللہ وانی

صفحات: 200، قیمت: 400

ناشر: رچنا پبلی کیشنز، جموں توی

مبصر: ڈاکٹر محمد نوشاد عالم شعبہ اردو فارسی،
ڈاکٹر ہری سنگھ گور سنٹرل یونیورسٹی، ساگر (ایم پی)

پریمی رومانی ایک شاعر، محقق، ناقد، مبصر اور ترجمہ نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ پریمی رومانی کا اصل نام ڈاکٹر سبھاش چندرا ایمہ ہے۔ اردو ادب میں ان کی دو درجن سے زائد کتابیں شائع کر چکی ہیں۔ ان کی ادبی خدمات کے لیے ملک کے مختلف صوبوں کی اکادمیاں انھیں دس سے زائد اعزاز و انعامات سے نواز چکی ہیں۔

پریمی رومانی ایک کامیاب ترجمہ نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ انھوں نے ہندی، انگریزی، گوجری، پہاڑی، ڈوگری، پنجابی، کشمیری اور گجراتی زبانوں کے ادب کو اردو زبان میں منتقل کیا ہے۔ ابھی حال ہی میں انھوں نے ٹی این کندن کی انگریزی کتاب "The Saint Extra-Ordinary, Bhagwan Gopinath ji" کا 'بھگوان گوپی ناتھ: عقائد و افکار' کے نام سے اردو زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر پریمی رومانی کی ترجمہ نگاری کے جوہر کھل کر سامنے آئے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب 'پریمی رومانی ... فن و فکر' پروفیسر محمد اسداللہ وانی کے منتخب مضامین کا مجموعہ ہے، جس میں اردو ادب کے مشہور و معروف شخصیت کے مضامین و خطوط شامل ہیں، جن میں پروفیسر مسعود حسین خان، مظہر امام، پروفیسر حامد کاشمیری، زبیر رضوی، پروفیسر منظر اعظمی، پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، پروفیسر عالم خوندمیری، پروفیسر مرغوب بانہالی، ڈاکٹر اشفاق احمد وانی، ڈاکٹر دلیپ کمار شرما، ڈاکٹر تہمینہ اختر، ڈاکٹر ایاز رسول نازکی، عرش صہبائی، موتی لال ساقی، محمد ایوب واقف، ارجن دیو مجبور اور خود پروفیسر محمد اسداللہ وانی وغیرہ کے مضامین شامل ہیں، جو ہندوستان اور بیرونی ممالک کے ممتاز رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔

پروفیسر سلیمان اطہرت جاوید کا 'پریمی رومانی کی تنقید نگاری' کے عنوان سے مضمون شامل ہے، جس کے ذریعے موصوف نے پریمی رومانی کی تنقیدی صلاحیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ پریمی رومانی اپنے معاصرین پر قلم اٹھاتے ہوئے غیر جانبدارانہ رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کی تحقیقی کتابوں میں 'اقبال اور جدید اردو شاعری، مظہر امام: حیات و فن، پیش رفت، اور 'اقبال اور جدید شاعری' وغیرہ ایسی کتابیں ہیں جن سے ان کی تحقیقی و تنقیدی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

پروفیسر عالم خوندمیری نے 'اردو تنقید میں ایک نئی آواز' کے عنوان سے پریمی رومانی کی انداز تنقید پر روشنی ڈالی ہے۔ بقول عالم خوندمیری 'وہ عصری ادب اور نئے ادب کے فرق و امتیاز سے واقف ہیں'۔ 'پریمی رومانی کا تنقیدی شعور' کے عنوان سے زبیر رضوی نے ان کے تنقیدی مضامین کے حوالے سے بحث کی ہے۔ علاوہ ازیں پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے ان کی دو نئی کتابوں پر تبصرہ کیا ہے جس میں تنقیدی مضامین کا مجموعہ 'ردعمل' اور جدید اردو شاعری: چند مطالعے ہیں یہ کتابیں سنجیدہ ادبی حلقوں کو متاثر کیا ہے اور ان کی خوب پذیرائی بھی ہوئی ہے۔ 'ردعمل' ہمارے اردو کے جدید شاعروں کے مطالعہ پر مبنی ہے، جس میں اختر الایمان سے لے کر ندا فاضلی تک کے کئی شعرا کو شامل کیا ہے اور کچھ شاعروں کے گیت وغیرہ کا بھی جائزہ لیا ہے۔

'پیش رفت' پریمی رومانی کے تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے، جس میں بیس مضامین شامل ہیں۔ اس کتاب میں معروف ادیبوں کی شخصیت اور ان کے ادبی مقام پر تبصرہ کے علاوہ دوسرے موضوعات پر بھی خامہ فرسائی کی گئی ہے۔ ادیبوں میں اقبال، ٹیگور، جوش، جگن ناتھ آزاد، مظہر امام وغیرہ شامل ہیں۔ مظہر امام کو عصر حاضر کا نمائندہ غزل گو شاعر قرار دیا ہے۔ اس کتاب کی اہمیت و افادیت پر ڈاکٹر اشفاق احمد وانی، عبدالمغنی شیخ، پشکر ناتھ، ڈاکٹر ایاز رسول نازکی، محمد متین ندوی، ڈاکٹر تہمینہ اختر، اور ڈاکٹر دلیپ کمار شرما نے روشنی ڈالی ہے۔

زیر نظر کتاب 'پریمی رومانی ... فکر و فن' میں تقریباً تیس (30) سے زائد مضامین شامل کیا گیا ہے، جو تحقیقی و تنقیدی مقالات، خطوط اور انٹرویو پر مشتمل ہے، جن میں سے بیشتر مضامین مشاہیر ادب نے تحریر کیے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعے سے پریمی رومانی کی حیات اور ادبی خدمات کے تمام گوشوں سے مکمل آگاہی فراہم ہوتی ہے۔ کتاب کے ابتدائی صفحات پر ملک کی مختلف اہم شخصیات جن میں ادیب، سیاستداں، صحافی وغیرہ شامل ہیں۔ پریمی رومانی کی تقریباً تیس سے زائد تصاویر اس کتاب کی خوبصورتی میں اضافہ کرتی ہیں۔

پروفیسر محمد اسداللہ وانی صاحب کا شمار صوبہ جموں و کشمیر کے ممتاز قلم کاروں میں ہوتا ہے۔ وہ ایک شاعر، محقق، نقاد اور خاکہ نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ وہ کئی کتابوں کے مالک ہونے کے ساتھ ساتھ کئی زبانوں سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں اور ان کے کئی مقالات ملک کے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ انھوں نے اپنی مرتب کردہ کتاب 'پریمی رومانی ... فکر و فن' میں اپنے اہم دیباچے کے ساتھ ہندو پاک کے نامور ادیبوں، نقادوں اور دانشوروں کے مضامین کو شامل کیا ہے۔ 200 صفحات پر مشتمل اس کتاب کے

مطالعہ سے نہ صرف پریمی رومانی کی حالات زندگی سے متعلق واقفیت حاصل ہوتی ہے بلکہ ان کی ادبی وصحافتی زندگی کے بارے میں بھی معلومات حاصل ہوتی ہے۔ امید ہے کہ اس کتاب سے نہ صرف پریمی رومانی کے چاہنے والے بلکہ ادب کے طالب علم کے ساتھ ساتھ عام قارئین بھی اس سے مستفید ہوں گے اور اس کتاب کو مقبولیت حاصل ہوگی۔

کہرے میں ابھرتی پرچھائیں

شاعر: راشد انور راشد

صفحات: 256، قیمت: 300 روپے

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر پرویز شہریار، این سی ای آر ٹی، نئی دہلی

راشد انور راشد آج سب سے زیادہ شائع ہونے والے شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ آپ ہندوستان کے قرب وجوار سے کوئی بھی معیاری رسالہ اُٹھالیں اس میں راشد کی کوئی نہ کوئی پیاری سی غزل یا نظم ضرور پڑھنے کو مل جاتی ہے۔ راشد نے آج غزل کی دنیا میں اپنی ایک الگ پہچان بنالی ہے۔ جہاں جہاں غزل نے اپنی مسافت طے کی ہے، راشد انور راشد جیسے ہونہار اور اعلیٰ تعلیم یافتہ شاعروں نے بھی وہاں وہاں اپنے کلام کی خوشبو اور شائستگی سے اپنی موجودگی کا احساس دلایا ہے۔

'کہرے میں ابھرتی پرچھائیں' راشد انور راشد کی 138 معریٰ نظموں کا مجموعہ ہے۔ اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ غزل کے ایسے منجھے ہوئے شاعر کو نظموں کا سہارا کیوں لینا پڑتا ہے۔ کیا آج کی مصروف زندگی کا یہ تقاضہ ہے یا اس کے پس پردہ کوئی اور مقصد بھی پوشیدہ ہے۔ لیجیے خود بقلم شاعر ان کا یہ جواز ملاحظہ فرمائیں:

"... بعض کیفیات کو محض اشاروں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ تھوڑی وضاحت، تھوڑی تفصیل، ان کیفیات کی بہتر ترسیل میں زیادہ معاون ہوتی ہے۔ نظم میں چونکہ ایک کہانی چھپی ہوتی ہے لہٰذا اس کہانی کو بیان کرنے کے لیے ارتقا کے مختلف مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے... میں نے اپنی نظموں میں ان مرحلوں کو برتنے کی کوشش کی ہے۔"

راشد نے ویسے تو آزاد نظمیں بھی لکھی ہیں لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ نظم معریٰ زیادہ موزوں ہیئت ہے۔ کیونکہ اس میں پابند نظموں کی بندشوں سے تخلیق کار کو نہ صرف نجات ملتی ہے بلکہ قافیے ردیف کے تخلیقی استعمال سے شعریت، غنائیت، ترنم اور آہنگ میں اضافہ ہوتا ہے۔

جہاں تک موضوع کا تعلق ہے، راشد کے یہاں موضوعات کی کوئی کمی نہیں ہے۔ ان کی نظموں کا انداز مختلف ہے اور ایک ہی بات کو سو رنگ سے باندھنے کے ہنر سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ محبت ان کی نظموں کا مرکزی موضوع ہے۔ لہٰذا ہر نظم آج کے عہد کی نئی نسل کے جذبات کی ترجمانی معلوم ہوتی ہے۔ راشد نے اپنی ان نظموں کو تین مختلف مراحل میں تقسیم کیا ہے۔ اس میں نوجوانی کا لاابالی پن، جوانی کے جوش وخروش اور پھر جوانی کی پختگی کے دور کی دلی کیفیات اور داخلی احساسات کو نظم کرنے کی کوشش کی ہے۔ محبت ایک ذاتی تجربہ ہے۔ ہر کوئی اس آگ سے ہوکر گزرنا چاہتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں عبرت کام نہیں آتی۔ جنت کا لطف مرنے کے بعد کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ایک بات یہاں نشان خاطر رہے کہ راشد کے معشوق کا تصور رومانوی ادب کی طرح سادی نہیں ہے۔ راشد کے یہاں عشق کا جذبہ معشوق کو دیوی بنا کر اُس کی پرستش کرنا نہیں ہے۔ بلکہ راشد کا محبوب بھی میر وغالب کے محبوب کی طرح گوشت پوست کا جیتا جاگتا انسان ہے۔ جسے غصہ بھی آتا ہے، جو ناراض بھی ہوتا ہے، جو برہم بھی ہوتا ہے اور اسے روٹھنے پر منانا بھی پڑسکتا ہے۔ اس کی جھڑکیاں کھا کر شاعر کبھی بدمزہ بھی نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ اس کی کھٹی میٹھی اور ترش یادوں اور وعدوں پر اعتبار نہ کرتے ہوئے بھی اعتبار کرنے میں لطف محسوس کرتا ہے۔ ان مراحل سے گزرنے کے بعد عشق میں تفاخر کا احساس اکثر تشنگی کو تسکین میں بدل دیتا ہے۔ راشد کے یہاں انتظار تو ہے مگر انتشار نہیں۔ ہجر اور وصال کے ہر دو عالم میں شاعر مثبت قدروں کی پاس داری بڑی شائستگی سے کرتا ہے۔

راشد نے اعتراف کے تحت عشق میں جدائی کی کلفتوں بھری منزل سے گزرنے کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ پڑاؤ زندگی کے انتشار کو نمایاں کرتا ہے۔ لیکن اس بکھراؤ میں بھی عجیب وغریب سکون کا احساس شامل ہوتا ہے۔ نظم 'عشق نامہ' راشد کس طرح بیان کرتے ہیں یعنی عشق ایک ایسا لازوال جذبہ ہے جو ہر عہد میں اپنی معنویت برقرار رکھتا ہے اور سچی زندگی کا جو ہر صرف وہی شخص پاسکتا ہے، جس نے عشق کے دریا میں غوطہ لگایا ہے۔ لیکن اس بات سے وہ پہلے ہی آگاہ کردیتے ہیں کہ عشق کے مراحل سے گزرنا ایسے ہی جیسے کسی آگ کے دریا سے ہوکر گزرنا:

عشق دریا ہے آگ کا لیکن عشق دریا میں جو نہائے گا
زندگی کی حقیقتوں کو وہی ہر زمانے میں جان پائے گا

نظم 'انتظار' کے یہ چند مصرعے دیکھیے کہ عاشق زار زندگی کی آخری سانس تک اپنے شوخ وشنگ معشوق کے انتظار میں کس طرح جان بہ لب ہو چکا ہے:

تو جانے کس موسم میں آئے گا دل بہلانے کو آکے دیکھ لے زندہ ہوں میں بس تیرا کہلانے کو

عشق ومحبت میں ایک مقام وہ بھی آتا ہے، جب رقیب کے تصور سے ہی عاشق کی جان میں آگ سی لگ جاتی ہے لیکن معشوق کو خدا جانے کیوں عاشق نامراد کو نیم بسمل تڑپتا ہوا دیکھنے میں مزہ آتا ہے۔ راشد کی نظم 'پیاس' کے ابتدائی چند مصرعوں کی قرأت سے اس کیفیت کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔

مجھے پتہ ہے کہ تو سنگ دل نہیں لیکن ترا مزاج بھی ان قاتلوں سے ملتا ہے
جو اپنی شوخ اداؤں سے قتل کرتے ہیں جو اپنے چاہنے والوں کے دل مسلتے ہیں

اور یہ مصرعے بالخصوص اس میں راشد نے جس طرح سے پیکر تراشی کی ہے وہ قابل دید بھی ہے اور قابل داد بھی، یہ چند مصرعے ملاحظہ فرمائیں کہ:

ہزار اٹھتی ہیں موجیں بدن کے ساحل پر مگر ہے ریت کا بکھراؤ ہر طرف جاری
عجب نشہ ہے تجھے انتقام کا لیکن کبھی تو اتنا کرم کر کہ آنکھ بھر آئے

مشتے نمونہ از خروارے کے بمصداق راشد انور راشد کی منظومات کی یہ چند مثالیں ان کے لب ولہجے کی جدت، ان کی فکر کی ندرت، ان کی عصری حسیت اور ایک نئی جہانِ معنی کو اپنی نوک قلم پر خلق کرنے کی قدرت کی مبین اشاریہ ہیں۔ ان کی شاعری کا ڈکشن منفرد ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی دلفریب ہے جو ہر عمر کے قارئین کو اپنی طرف بڑی گرم جوشی سے متوجہ کرلیتے ہیں۔ مجھے ان کی شاعری میں پنہاں تازگی اور توانائی کو دیکھتے ہوئے یہ کہنے میں مسرت ہوتی ہے کہ ان کی منظومات یعنی 'کہرے میں ابھرتی پرچھائیں' کا ادبی حلقوں میں بڑی پرتپاکی سے پذیرائی حاصل ہوگی اور خیر مقدم کیا جائے گا۔

ہتوپدیش

مصنف: پنڈت نارائن شرما، مترجم: ڈاکٹر ارشاد نیازی

صفحات: 128، قیمت: -/120

ناشر: ایم- آر- پبلی کیشنز، دریا گنج، نئی دہلی

مبصر: محمد رضوان خان، MMIP، ڈی 307، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی

قصے، کہانیاں سننے سنانے کا فن قدیم زمانے سے چلا آرہا ہے۔ مگر دورِ حاضر میں،

جب سائنس وٹکنالوجی کی گوناگوں ترقیوں کے باوجود سیاسی، سماجی، تہذیبی اور اخلاقی قدریں بتدریج روبہ زوال ہوئیں، معاشی بحران نے غریب ومزدور اور انسان کے ہاتھوں میں کشکول تھما دیے اور امیر ومتوسط طبقہ بھی بے اطمینانی کا شکار ہوتا گیا تو یہ فن بھی زوال آمادہ ہوتا گیا۔ اسی طرح ترجمے کا فن بھی بہت قدیم ہے اور مختلف زبانوں میں قابل قدر کتابیں ترجمہ کی گئی ہیں، لیکن بعد کے زمانوں میں اس فن پر بھی زوال واضمحلال طاری ہو گیا ہے۔ ایسے ناگفتہ بہ حالات میں جناب ڈاکٹر ارشاد نیازی نے 'ہتوپدیش' کا ترجمہ کر کے اس فن کو دوبارہ زندہ کرنے کی مستحسن سعی کی۔ ترجمہ کا فن مختلف علوم میں صلاحیتوں کا طالب ہے۔ مترجم کو چند اصولی باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً کہ بین السطور تشنگی نہ رہے، کتاب ثقالت اور بوجھل پن سے پاک ہو۔ خارجی عوامل کا دخل نہ ہو تسلسل اور روانی کو اصل الاصول کی حیثیت حاصل ہو، من وعن کسی جملے یا پیراگراف کا ترجمہ ممکن نہ ہو تو مناسب ترجمانی سے کام لیا جائے، وغیرہ زیر نظر کتاب کے مترجم نے ان تمام اصولوں کو برتنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

'ہتوپدیش' کے معنیٰ 'نیک نصیحت' کے ہیں۔ یہ سنسکرت کا لفظ ہے۔ دراصل وارانسی کے نامور سنسکرت اسکالر اور مشہور دانشور پنڈت وشنوشرما کی تخلیق کی گئی کہانیوں کا مشہور زمانہ مجموعہ 'پنچ تنتر' کے تتبع میں تخلیق کی گئی سنسکرت کتابوں میں سب سے مشہور ومعروف کتاب 'ہتوپدیش' ہے۔ پنڈت وشنوشرما نے یہ کتاب 'پنچ تنتر' جنوبی ہند کے بادشاہ 'امرشکتی' کے تین ناکارہ بیٹوں (اُگرشکتی، بہوشکتی اور آننت شکتی) کی اصلاح کے غرض سے تالیف کی تھی۔ وشنوشرما کو بادشاہ کے بیٹوں سے مل کر یہ احساس ہوا کہ انھیں اصلاحی کہانیوں کے ذریعہ ہی سیدھی راہ دکھائی جاسکتی ہے۔ لہٰذا انھوں نے ان لڑکوں کے اندر چھ ماہ تک کہانیاں سنا سنا کر تحریک پیدا کی۔ انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ کہانیاں سننے کا شوق، جو ہر بچے کے اندر فطری طور پر ہوتا ہے، ان کے اندر بھی ہے، لہٰذا کہانیوں کے ذریعہ ہی انھیں تعلیم دی جاسکتی ہے۔ یہ نسخہ کامیاب رہا، وشنوشرما وعدے کے مطابق ان بچوں کو چھ مہینے تک تعلیم دیتے رہے۔ اس طرح وہ بچے متعین مدت میں نہایت مہذب، بااخلاق، تعلیم یافتہ، ماہر سیاسیات، قابل اور باصلاحیت بادشاہ بننے کی جملہ تمام صفات سے آراستہ ہو گئے۔

'ہتوپدیش' کے مؤلف پنڈت نارائن شرما ہیں، جو بنگال کے راجہ دھول چندر کے درباری شاعر تھے۔ اس کتاب کا بنیادی ماخذ 'پنچ تنتر' ہی ہے اور اس کا مقصد بھی وہی ہے جو 'پنچ تنتر' کا ہے۔ اسی کتاب کا عربی ترجمہ کلیلہ ودمنہ کے نام سے ہوا ہے۔ اس کتاب میں 'پنچ تنتر' کے بنیادی ماخذ کے علاوہ دیگر کتابوں سے بھی مواد لیا گیا ہے۔

کتاب میں فارسی کے بیش نصیحت آموز اشعار موجود ہیں، جن سے یقیناً بچوں کے اندر کردار، اخلاق اور منکسر المزاجی پیدا ہوگی۔ اور یہی اس کتاب کے ترجمہ کا مقصد بھی ہے۔

یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے، جو بالترتیب یہ ہیں: دوستی، اختلاف، علاحدگی، معاہدہ۔ مذکورہ عنوانات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کس قدر جامع، اور بامعنیٰ ہیں۔ اس کتاب کی چاروں کہانیاں بامقصد ہیں اور نہایت ہی سادہ اور سلیس انداز سے تحریر کی گئی ہیں۔ ادق الفاظ اور جملوں سے احتراز کیا گیا، اسلوب آسان اور عام فہم ہے، اس کتاب کے مطالعہ سے ڈاکٹر ارشاد نیازی کی علم دوستی آشکارا ہوتی ہے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اردو، ہندی اور سنسکرت زبانوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ چوں کہ ڈاکٹر ارشاد نیازی کی بنیادی تعلیم مدرسہ سے ہوئی ہے، اس وجہ سے وثوق سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ آپ کی عربی ادب پر بھی اچھی نظر ہے۔

اس کتاب کی طباعت معیاری اور سرورق عنوان کے لحاظ سے موزوں اور مناسب، بلکہ بہت خوب ہے۔ اس کے علاوہ کہانیوں میں متذکرہ کردار کی مناسبت سے سرورق پر پرندوں کی رنگین تصویروں نے، جو کہ نہایت دلکش اور اثر انگیز ہیں جان ڈال دی ہے لہٰذا یہ بات پورے وثوق اور اعتماد سے کہی جاسکتی ہے کہ ڈاکٹر ارشاد نیازی کا یہ کارنامہ 'ہتوپدیش' بجا طور پر پذیرائی کا مستحق ہے۔

شبلی سخنوروں کی نظر میں

مرتب: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
صفحات: 312، قیمت: 300 روپے
ناشر: ادبی دائرہ، اعظم گڑھ
مبصر: ڈاکٹر حنا افشاں، شعبۂ اردو
دیانند گرلس پی جی کالج، کانپور 208001

حال ہی میں ایک کتاب منظر عام پر آئی جس میں شبلی کو ایک نئے رُخ سے پیش کیا گیا ہے۔ شبلی ادیبوں کی نظر میں، شبلی نقادوں کی نظر میں، شبلی معاصرین کی نظر میں وغیرہ۔

مگر مرتب نے اس کتاب کے ذریعے شبلی سے منسلک ایک نئے گوشے کو روشن کرنے کی کامیاب کوششیں کی ہیں۔ شعری زبان جو دھڑکنوں کو سمجھنے اور سمجھانے کا کام بہتر طور پر کرسکتی ہے۔ شبلی پر سیکڑوں نظمیں لکھی گئیں مگر انھیں مجموعی طور پر شائع نہیں کیا گیا۔ 'شبلی سخنوروں کی نظر میں' کے ذریعے بلاشبہ شبلی شناسی میں اضافے کی صورت پیدا کی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب میں ڈاکٹر الیاس الاعظمی نے تقریباً 54 ایسے اشخاص کی نظموں کو شامل کیا ہے، جنھوں نے شبلی کو بہت قریب سے دیکھا اور سمجھا ہے۔ آپ نے نہ صرف ان نظموں کو یکجا کیا بلکہ اُن تمام اشخاص کا مختصر تعارف بھی پیش کیا ہے اور علامہ شبلی سے ان کے ربط وتعلق کی نوعیت وعقیدت کی بھی وضاحت کی گئی ہے۔ ان کا ایک ایک لفظ شبلی کے علم وفن اور شخصیت کو سمجھنے میں مدد کرتا ہے۔

شبلی کے لیے خلوص ومحبت سے لبریز دلوں نے ان سے منسلک ہر خوشی وغم کے موقعے پر شعر کہے ہیں۔ دھیرے دھیرے اتنا مواد تیار ہو گیا کہ ایک کتاب مرتب ہوسکتی تھی مگر اس طرف کسی کی توجہ نہ ہوئی اس کتاب کی ترتیب کے بعد یہ کمی پوری ہوئی۔ اس میں کچھ نظمیں بہت معیاری ہیں مگر بعض کمزور جس کا اعتراف خود الیاس الاعظمی نے کتاب کے دیباچہ میں کیا ہے۔

یا پھر 17 مئی 1907 کو شبلی کے حادثۂ گزند پا کے دلدوز واقعہ پر سیکڑوں نظمیں لکھی گئیں۔ بہت سے چاہنے والوں نے اپنے انداز سے اس واقعہ پر شبلی کے لیے صحت کی دعائیں کی اور اس حادثہ کا اثر خود شبلی پر بہت زیادہ ہوا۔ آپ نے کئی رباعیاں کہیں جن میں کسی قدر مایوس اور تاسف کا پہلو فطری طور پر نظر آتا ہے۔ مرتب نے مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی کے نام پر لکھا گیا شبلی کا خط صفحہ نمبر 14 پر پیش کیا ہے جس سے پاؤں زخمی ہونے کی جو تفصیل ملتی ہے وہ اپنی جگہ ہے۔ اصل واقعہ تو کچھ اور ہی ہے مگر یہاں اس کا ذکر مناسب نہیں۔

الیاس الاعظمی نے شبلی کے استاد کے حوالے سے بھی بہت سارے پہلو روشن کیے ہیں۔ ایک عالم کی زندگی میں اس کے استاد کا بڑا مرتبہ ہوتا ہے۔ شبلی کے استاد محمد فاروق جڑیاکوٹی جو اپنے تمام شاگردوں میں آپ کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ کہتے ہیں:

''طالب علمی کے زمانہ میں ایک روز ننگے سر بیٹھے تھے کہ مولانا فاروق پیچھے سے سر پر ایک چپت لگا کر کہتے ہیں ع ''ہے چپت گاہ خلائق یہ سر''
علامہ شبلی نے فوراً جواب دیا ''جتنے ہیں سر اُن پہ فائق یہ سر''
موسیقی اور خاص طور پر بھور میں بھیروی سنا کر بچپن میں ہی شعری ذوق اور تحت الشعور میں نغمگی پیدا کرنا اصلاً مولانا فاروق کا ہی کارنامہ ہے۔'' (ص نمبر 25)

یہ ذوق وشعور وقت کے ساتھ اس بام عروج پر پہنچا کہ نذیر احمد جو شبلی سے عمر میں

تقریباً 21 برس بڑے ہیں اپنے ایک لکچر سے پہلے ایک شعر کے حوالے سے مجمع عام میں شبلی کے شعری صلاحیت کا اس طرح اعتراف کیا:

تم اپنی نثر کو لو نظم و چھوڑ و نذیر احمد
کہ اس کے واسطے موزوں ہیں حالی اور نعمانی

اپنی ایک اور تقریر میں نذیر احمد کا یہ بیان کہ میں نے کسی زمانہ میں عربی اچھی پڑھی تھی۔ اب تو ایسا ڈھول ہوگیا کہ مولوی شبلی ایک صیغہ بھی پوچھ لیں تو بغلیں جھانکنی پڑیں۔ (حیات شبلی 415)

خود سے 21 برس چھوٹے شخص کی شاعری اور عربی دانی کی مجمع عام میں داد و تحسین ایک اہم بات ہے۔ یہ بزرگوں کی باتیں ہیں جو انھیں پر ختم ہوگئیں۔ مرتب نے کتاب کے آخر میں شبلی کی وہ غزلیں جو وہ عطیہ فیضی کو خط کی صورت میں بھیجتے رہے ان کا ترجمہ 'عطیہ شبلی' کے نام سے اکبر علی خاں عرشی زادہ نے کیا ہے۔ شبلی کی فن سخنوری کو سمجھنے میں مددگار ہے۔

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کی اس سے پہلے بھی کئی کتابیں شبلی کے حوالے سے قارئین ادب کو مستفید کرچکی ہیں جیسے متعلقات شبلی کتابیات، شبلی، موازنہ انیس و دبیر جیسی نایاب تصنیف کی کڑی کو جوڑتی ہوئی یہ کتاب 'شبلی سخنوروں کی نظر میں' قارئین ادب کو شبلی سے اور قریب کرے گی۔

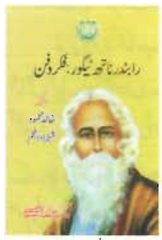

رابندر ناتھ ٹیگور: فکر و فن

مرتبین: خالد محمود، شہزاد انجم
ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی 25
صفحات: 645 قیمت: 600 روپے
مبصر: ڈاکٹر خالد مبشر، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی 25

گرودیو رابندر ناتھ ٹیگور ہمہ گیر عظمتوں کے پیکر تھے۔ وہ بجا طور پر ہند آریائی روح کا عبقری ترجمان، ہندستانی تہذیب و ثقافت کا متبحر شناور اور ہندستان کا روحانی سفیر کہلانے کے مستحق ہیں۔ وہ بیک وقت عظیم المرتبت شاعر، جدید آرٹ کے بانی، موسیقی کی کئی نئی دھنوں کے موجد، سربرآوردہ فکشن نگار، ڈراما نگار، ماہر تعلیم، دانشور اور مفکر —— سبھی کچھ تھے۔

زیر تبصرہ کتاب 'رابندر ناتھ ٹیگور: فکر و فن' دراصل شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں 25 تا 27 نومبر 2011 کو منعقد ہونے والے عظیم الشان سہ روزہ 'ٹیگور قومی سیمنار' میں پیش کردہ مقالات اور اردو اور دیگر زبانوں کے مشاہیر کے ذریعے ٹیگور کی شخصیت اور کارناموں پر تحریر کردہ بیش قیمت مضامین کا مجموعہ ہے۔

یہ کتاب قاری کو کئی اعتبار سے متاثر کرتی ہے۔ اس کی چند امتیازی خصوصیات درج ذیل ہیں:

1. یہ نہایت وقیع مقالوں کا مجموعہ ہے، بس کی ضخامت 645 صفحات کو محیط ہے۔
2. اس میں اردو اور دیگر زبانوں کے معروف اور سربرآوردہ ادیب و شعرا کے مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ مثلاً جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، سجاد ظہیر، عبدالرحمٰن بجنوری، نیاز فتح پوری، حامد حسن قادری، مخدوم محی الدین، سید احتشام حسین، شانتی رنجن بھٹاچاریہ، سروجنی نائیڈو، ستیہ جیت رے، ایس اے ڈانگے، ہیرن مے بنرجی، جگن ناتھ چکرورتی، ایس ایل پنڈت، ہندا گوپال سین گپتا، سوکمار سین، سریندر کمار، ہیرالڈ ہیارنے، شکیل الرحمٰن اور وہاب اشرفی وغیرہ۔
3. خود جس سیمینار کے مقالوں کو اس کتاب میں جمع کیا گیا ہے، وہ مقالہ نگار بھی اردو، ہندی، انگریزی اور بنگلہ زبان و ادب کی معروف شخصیات ہیں۔ مثلاً پروفیسر آفاق احمد، عارف عزیز، ضیا فاروقی، شمیم طارق، پروفیسر افصح ظفر، پروفیسر ظفر احمد صدیقی، پروفیسر شافع قدوائی، پروفیسر صغیر افراہیم، پروفیسر سلیمان خورشید، پروفیسر ہرپال سنگھ پنو، سیّد یحییٰ نشیط، پروفیسر م ن سعید، پروفیسر عبدالصمد، پروفیسر انیس الرحمٰن، پروفیسر شمس الحق عثمانی، پروفیسر معین الدین جینابڑے، پروفیسر نعمان خاں، پریاگ شکل، ڈاکٹر خالد جاوید، ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی، ڈاکٹر مشتاق صدف، ڈاکٹر ارجمند بانو، ڈاکٹر محمد کاظم، ڈاکٹر ندیم احمد اور ڈاکٹر عمیر منظر وغیرہ۔
4. اس کتاب کی نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں ٹیگور جیسی دیو قامت شخصیت کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ مثلاً ٹیگور کے ابتدائی احوال، ٹیگور کی شخصیت، زندگی، فکر و فن، تخلیقی محرکات، دانشوری، سیاسی و تہذیبی بصیرت، ٹیگور بحیثیت انسانی آفاقی اقدار کے علم بردار، تعلیمی نظریات، قومیت کا تصور، شاعرانہ عظمت، گیتانجلی کی امتیازی خصوصیات، افسانہ نگاری اور ڈراما نگاری، مصوری، موسیقی کے علاوہ ٹیگور اور دوسرے عظیم شعرا کا تقابل و موازنہ، اردو ادب پر ٹیگور کے اثرات، ٹیگور کے عالمی ادبیات پر اثرات وغیرہ۔
5. اس کتاب کا ایک نمایاں وصف اس کا حسن ترتیب بھی ہے۔ تمام مضامین کی درجہ بندی مختلف جلی عنوانات کے تحت کی گئی ہے۔ مثلاً 'شخص و عکس' کے زیر عنوان ٹیگور کی زندگی، شخصیت، سیرت اور اخلاق و کردار پر مشتمل مقالات شامل کیے گئے ہیں۔ 'نظریات و افکار' کے تحت ٹیگور کے فکر و فلسفہ، تہذیب، قومیت، انسانیت اور ترقی پسندی وغیرہ سے متعلق مضامین ہیں۔ دیگر جلی عنوانات یوں ہیں: ٹیگور کی شاعری، افسانوی ادب، مصوری اور موسیقی، ٹیگور اور دوسرے شعرا، اردو ادب اور ٹیگور، چند دوسرے گوشے اور سوانحی کوائف وغیرہ۔

کتاب کے مرتبین پروفیسر خالد محمود اور پروفیسر شہزاد انجم کی ترتیب و تحقیق اور تدوینی کاوشوں کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ کتاب کے ہر ورق اور ہر مضمون سے حسنِ ترتیب، دقت نظر اور عرق ریزی نمایاں ہیں۔ پروفیسر خالد محمود کے یہ بصیرت افروز الفاظ ان کے پیش لفظ سے ملاحظہ ہوں:

''ٹیگور کی تخلیقات خیر، خرد، حسن، صداقت، بصیرت، خواب ناکی اور صوفیانہ استغراق کا ایسا نورانی سرچشمہ ہے، جس کے رموز کی کرنیں وجدان کی چلمن سے چھن چھن کر باہر نکلتی ہیں اور قاری کے دل و دماغ کو منور کرتی ہیں۔''

پروفیسر شہزاد انجم کے یہ الفاظ بھی زریں قلم سے لکھے جانے کے قابل ہیں کہ:

''ٹیگور کا امتیاز یہ ہے کہ اس کی نرگسیت 'ذات' کے خول میں سمٹنے کے بجائے پوری ہند آریائی جمالیاتی اقدار کو اپنے جلو میں سمیٹ لیتی ہے۔ گویا ٹیگور ایک نوع کی 'ثقافتی نرگسیت' کے علم بردار ہیں۔ چنانچہ ان کی شاعری ہو یا فکشن نگاری، مصوری ہو یا موسیقی—— سب میں اسی 'ٹیگوری نرگسیت' کا اظہار ہوا ہے۔''

اس اہم کتاب کا انتساب بجا طور پر اس کے دو مستحقین ہندستانی ادب و ثقافت کے دلدادہ جناب مجیب جنگ (شیخ الجامعہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ) اور جناب جواہر سرکار (سابق سکریٹری، وزارت ثقافت حکومت ہند) کے نام کیا گیا ہے۔

رابندر ناتھ ٹیگور سے متعلق ایسی معیاری، موقر، مستند اور تاریخی کتاب کی اشاعت کے لیے مرتبین پروفیسر خالد محمود اور پروفیسر شہزاد انجم کے علاوہ شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور مکتبہ جامعہ لمیٹڈ —— قارئین کی پُرجوش مبارک باد کے مستحق ہیں۔ کیونکہ بلا مبالغہ ٹیگور کے حوالے سے اردو میں ایسی کوئی جامع کتاب تاحال نظر نہیں آتی۔ شاید اسی وجہ سے شعبۂ اردو کے لیے وزارت ثقافت حکومتِ ہند کی جانب سے 'ٹیگور ریسرچ اینڈ ٹرانسلیشن اسکیم' کے نام پر ایک 96 لاکھ کی خطیر رقم منظور کی گئی ہے اور اس اسکیم کے کوآرڈی نیٹر پروفیسر شہزاد انجم مقرر کیے گئے ہیں۔ یقیناً اردو دنیا کے لیے یہ ایک اہم اور مبارک خبر ہے۔

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم

فروغِ اردو بھون

ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ نئی دہلی 110025

تصحیح

18 اکتوبر 2012 کو ہونے والی ایگزیکیوٹیو بورڈ کی میٹنگ کی روداد

.1	آئٹم نمبر: xxxv.5 مدارس، اردو اکادمیوں اور اقلیتی طالبات و معذوروں کے لیے چلائے جارہے فیز آؤٹ مراکز کو مالی امداد جاری رکھنے کے لیے۔	تجویز اصولاً قبول کرلی گئی ہے۔ ان مراکز کی مالی امداد موجودہ ضوابط کے مطابق 10 سال کے بعد بھی جاری رکھی جائے گی۔ مزید برآں مندرجہ بالا زمرے میں آنے والے فیز آؤٹ مراکز کی مدت کار میں توسیع دیے جانے سے نئے کھلنے والے مراکز پر اثر پڑے گا۔ اس فیصلے کے پیش نظر موجودہ ضوابط میں ترمیم درکار ہے۔ اس لحاظ سے مندرجہ بالا زمروں کے فیز آؤٹ مراکز کو مالی اعانت جاری رکھنے، اس کی مدت کار میں توسیع سے متعلق فیصلے پر عملدرآمد سے پہلے ان پر قطعی فیصلے کی ضرورت ہے۔ اس غرض سے اس معاملے کو مع ممکنہ مالی اخراجات فائننس کمیٹی میٹنگ میں پیش کیا جائے۔ فی الوقت این جی او/ادارے این سی پی یو ایل کی اس اسکیم کو حاصل کرنے کے لیے آن لائن فارم بھرتے ہیں۔ مزید برآں اگر کسی دور دراز علاقے میں ہیں جہاں کمپیوٹر اور نیٹ ورک کی سہولت میسر نہیں ہے تو وہ ادارے، این جی جی ہارڈ کاپی کی شکل میں اپنی درخواست بھیج سکتے ہیں جو CABA-MDTP اسکیم کے تحت قبول کی جائیں گی۔ لیکن اس سے پہلے این سی پی یو ایل ایسے ان علاقوں کی نشاندہی کرے گی جہاں نیٹ ورک اور کمپیوٹر کی سہولیات دستیاب نہیں ہیں اور جہاں سے درخواست ہارڈ کاپی کی شکل میں قابل قبول ہوگی۔ اس قسم کا فیصلہ موجودہ پالیسی سے انحراف ہوگا۔ مزید یہ کہ انھیں این سی پی یو ایل کی اسکیم حاصل کرنے کے لیے پلاننگ کمیشن کے این جی او پورٹل سے رجسٹرڈ ہونا پڑے گا۔ پلاننگ کمیشن کی اس اہم شرط کے مدنظر اگر این جی او اس پورٹل سے رجسٹرڈ نہیں ہے۔ آن لائن درخواست نہیں دے سکتے تو ایسی درخواستوں کی ہارڈ کاپی قابل قبول نہیں ہوگی۔
.2	آئٹم نمبر: xxxv.12 لائق اور ادب سے جڑے ایسے لوگ جو بالواسطہ طور پر این سی پی یو ایل سے وابستہ نہیں ہیں کونسل ان کی خدمات کو تسلیم کرے گی۔	تجویز کو منظوری نہیں دی گئی۔
.3	آئٹم نمبر: xxxv.13 رگروپ انشورینس پالیسی پر غور وخوض کرنے کے لیے۔	بورڈ نے تجویز کو نامنظور کردیا۔
.4	آئٹم نمبر: xxxv.14 کتابوں کی دوبارہ طباعت پر پروجیکٹ رائلٹی کے لیے اہلیت سے متعلق شرائط میں تبدیلی۔	آئندہ فائنانس کمیٹی میں ایک نئی تجویز پیش کیے جانے کا فیصلہ کیا گیا۔

ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین
ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

پروفیسر وسیم بریلوی
وائس چیئرمین قومی کونسل
برائے فروغ اردو زبان

یونیورسٹیوں کی اردو سرگرمیاں

دھلی یونیورسٹی

علامہ اقبال فکر و فلسفہ

نئی دھلی: دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں شاعر مشرق علامہ سر محمد اقبال کی یوم پیدائش کے موقعے پر 'علامہ اقبال فکر و فلسفہ' کے موضوع پر 9 نومبر کو ایک قومی سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ سیمینار کی صدارت ڈی یو کے پروفیسر ایمریٹس عبدالحق اور جے این یو کے ڈاکٹر معین الدین جینا بڑے نے کی جب کہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر سید محمد ہاشم اور

فاروقی انجینئر نے شرکت کی۔ سیمینار کی نظامت کے فرائض ڈی یو کے شعبہ اردو کے صدر پروفیسر توقیر احمد خاں نے کی۔ اس موقعے پر پروفیسر سید محمد ہاشم نے کہا کہ اقبال جیسی عظیم شخصیت کبھی ہم سے جدا نہیں ہوسکتی اور وہ اپنی تخلیقات و شاعری کی بدولت آج بھی ہمارے ساتھ ہیں۔ سیمینار میں پروفیسر عبدالحق نے کہا کہ اقبال شناسی کی تدبیر کا نیا دور شروع ہوا ہے، جو آگے بھی جاری رہے گا۔ ڈاکٹر معین الدین جینا بڑے نے کہا کہ اس قسم کے سیمیناروں کے ذریعے نئی نسل کی تربیت ہوتی رہنی چاہیے تاکہ ان میں احساس ذمے داری پیدا ہو اور انھیں بیدار کیا جاسکے۔ ڈی یو کے شعبہ اردو کے اس سیمینار میں دیگر مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر مولا بخش، ڈاکٹر شیم احمد، ڈاکٹر علی احمد ادریسی، ڈاکٹر محمد محسن، ریسرچ اسکالر دانش حسین خاں، افسانہ حیات، محمد ارشد نے بھی اپنے مقالے پیش کیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا'، 10 نومبر 2012

ذاکر حسین کالج میں قومی کانفرنس کا انعقاد

نئی دھلی: ذاکر حسین دہلی کالج میں شعبہ انگریزی کی جانب سے بعنوان 'عالمی ادب میں معاصر رجحانات' ایک نیشنل کانفرنس کا انعقاد کیا گیا جس میں انگریزی زبان کے علاوہ جاپانی، روسی، فرانسیسی، اردو، ہندی، بنگالی اور میتھلی زبانوں کے ماہرین نے اپنے مقالے پیش کیے۔ ملک کے مختلف یونیورسٹیز کے علاوہ اور مختلف ریاستوں سے آئے ہوئے متعدد زبان و ادب کے اسکالروں نے بڑی تعداد میں حصہ لیا۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت آر ڈبلیو دیسائی نے کی۔ کلیدی خطبہ پروفیسر رومینا سیٹھی، شعبۂ انگریزی، پنجاب یونیورسٹی نے پیش کیا۔ کانفرنس کے ڈائریکٹر ڈاکٹر کشور داس نے مہمان خصوصی کا استقبال کرتے ہوئے ان کا تعارف پیش کیا۔ انھوں نے کانفرنس کے اغراض و مقاصد بیان کرتے ہوئے کہا کہ اس کا مقصد عالمی ادب کے عصری رجحانات کو سمجھنا اور متعدد شعبہ جات کے اسکالروں کو ایک پلیٹ فارم پر لانا ہے پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر سنتوش سرین نے کی۔ پہلے اجلاس میں انگریزی ادب پر مقالے پیش کیے گئے۔ دوسرا اجلاس ادبیات عالم کے لیے مختص کیا گیا تھا جس میں جاپانی، روسی اور چینی ادب پر مقالے پیش کیے گئے۔ اس اجلاس کی صدارت پروفیسر ایس پی گانگولی نے کی۔ تیسرے اجلاس میں ہندوستانی ادبیات بالخصوص اردو، ہندی، بنگالی اور میتھلی پر گفتگو کی گئی۔ اس اجلاس کی صدارت ہندی کے پروفیسر نیتانند تیواری نے کی۔ اردو زبان و ادب پر خالد علوی، شعبہ اردو، ذاکر حسین، دہلی کالج نے اردو شاعری پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ ابوبکر عباد نے اردو فکشن کے موضوعات و مسائل اور معاصر رجحانات کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا۔ پروفیسر اجے تیواری نے اختتامیہ کلام پیش کیا۔ اس موقعے پر بڑی تعداد میں طلبا اور اساتذہ نے شرکت کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 2 نومبر 2012

جواھر لال نھرو یونیورسٹی

میر تقی میر پر خصوصی پروگرام

نئی دھلی: جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے آڈیٹوریم میں میر تقی میر پر ایک سیمینار اور میر کی غزلوں پر مبنی ایک پروگرام 27 نومبر کو پیش کیا گیا۔ آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس، ایکسٹرنل سروسز کے زیر اہتمام منعقد تین گھنٹے کے اس پروگرام میں دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر اور سابق صدر شعبہ اردو پروفیسر ابن کنول، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی کے ڈاکٹر انور پاشا اور جامعہ ملیہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے ڈاکٹر احمد محفوظ نے میر تقی میر پر اپنے اپنے پر مغز مقالے پیش کیے اور میر تقی میر کی شاعرانہ خدمات کا کئی پہلو سے جائزہ لیا، جامعہ ملیہ کے ڈاکٹر احمد محفوظ نے 'میر کا عہد' پر اپنا مقالہ پیش کیا، جب کہ جواہر لال یونیورسٹی کے ڈاکٹر انور پاشا نے 'میر اور غالب ایک موازنہ' پر اپنا مقالہ پیش کیا 'میر کی المیہ شاعری' اور میر کے مطالعہ کے مراکز پر دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر ابن کنول نے اپنا مقالہ پیش کیا۔ اس موقعے پر آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل جناب لیلا دھر منڈلوئی، آل انڈیا ریڈیو دہلی کے ڈائریکٹر جناب ایل ایس باجپائی، ایکسٹرنل سروسز ڈویژن اور جنوبی ہند کی آل انڈیا ریڈیو کی شاخ کی ایڈیشنل ڈائریکٹر جنرل محترمہ اپرنا ویش اور ایڈیشنل ڈائریکٹر جنرل اچ کے پانی بھی موجود تھے۔ پروگرام میں معروف گلوکار جتیندر سنگھ اور شہرہ آفاق گلوکار نعیم علی نے میر کے کلام کو غزل گائیکی کا جامہ پہنایا اور اپنی مترنم آواز میں میر کی غزلیں پیش کیں، جنھیں سامعین نے بہت پسند کیا۔

روزنامہ 'جدید میل' دہلی، 1 دسمبر 2012

جامعہ ملیہ اسلامیہ

شعبہ اردو میں ٹیگور پر سیمینار

نئی دھلی: رابندر ناتھ ٹیگور، ہندوستانی ادبیات کا ایک عظیم استعارہ ہیں۔ ٹیگور کی شخصیت ہمہ گیر اور کثیر الجہت ہے۔ شعبہ اردو جامعہ میں منعقدہ ٹیگور کے فکر و فن کے قومی سیمینار کے موقعے پر انتظار حسین نے ان خیالات کا اظہار اپنے استقبالیہ جلسے میں کیا۔ وزارت ثقافت حکومت ہند نے ترجمے کے کام کی ذمے داری شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کو سونپی جو یقیناً لائق تحسین امر ہے۔ شعبے کی جانب سے منعقدہ جلسے میں کناڈا کے ممتاز شاعر اور ادیب اشفاق حسین، پاکستان کے مشہور ڈراما نگار اصغر ندیم سید اور نقاد ناصر عباس نیر کا بھی استقبال کیا گیا۔ اس جلسے کی صدارت پروفیسر خالد محمود صدر شعبہ اردو اور نظامت پروفیسر شہپر رسول نے کی۔ پروگرام کا آغاز حافظ شاہ نواز فیاض کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ جبکہ مہمانوں کا تعارف پروفیسر اختر الواسع نے کراتے ہوئے کہا کہ اتنی عظیم اور اہم شخصیات کی موجودگی سے جامعہ کا وقار بلند ہوا ہے۔ رابندر ناتھ ٹیگور ریسرچ اینڈ ٹرانسلیشن اسکیم کا تعارف پروفیسر شہزاد انجم نے کیا۔ جلسے میں شعبہ اردو

ٹیگور پر تحقیق وتراجم کی اسکیم

نئی دہلی: ترجمہ اس تناظر اور کیریکٹر کا نام ہے جو مصنف کی روح سے زیادہ قریب ہو، اس لیے اگر ترجمے میں مصنف کی روح میں سما جانے کی خوبی ہو تو یہ ایک کامیاب ترجمے کی علامت ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر سید محمد ساجد، رجسٹرار جامعہ ملیہ اسلامیہ نے 'ٹیگور ریسرچ اینڈ ٹرانسلیشن اسکیم' کے تحت منعقد ہونے والے شعبۂ اردو کے جلسے میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر عابد حسین، ذاکر حسین اور محمد مجیب کے تراجم پورے ہندوستان میں مثالی ہیں۔ مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر خالد محمود نے شیخ الجامعہ جناب نجیب جنگ کی اردو دوستی کا ذکر کیا اور فرمایا کہ یہ پروجیکٹ بھی ان کی خصوصی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ پروگرام کی نظامت کرتے ہوئے پروفیسر شہزاد انجم نے ٹیگور پروجیکٹ کے حوالے سے کہا کہ ہماری کوشش ہوگی کہ ترجمے کا کام معیاری اور وقیع ہو تاکہ جامعہ کا نام روشن ہو۔ پروفیسر عتیق اللہ نے کہا کہ اردو فکشن اور شاعری پر ٹیگور کے بڑے اثرات ہیں۔ پروفیسر اختر الواسع نے فرمایا کہ ٹیگور کے ذہنی سفر، ادبی تصورات کے مضامین بھی اردو میں منتقل ہونے چاہیے اور ساتھ ہی ان کے شعری اور افسانوی مجموعے بھی شائع ہوں۔ اس مذاکرے کے دوسرے سیشن کی صدارت پروفیسر زبیر احمد فاروقی اور پروفیسر محمد اسدالدین اور تیسرے سیشن کی صدارت پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر عتیق اللہ اور پروفیسر انیس الرحمٰن نے کی۔ پروفیسر انیس الرحمٰن نے فرمایا کہ اس پروجیکٹ میں بنگلہ زبان جاننے والوں کی شمولیت ضروری ہے۔ پروفیسر گوبند پرشاد نے کہا کہ ہندی میں ٹیگور کے ترجمے بے حد خراب ہیں۔ ترجمے کے معیار پر توجہ دینا ضروری ہے۔ پروفیسر ابن کنول نے ٹیگور کے حوالے سے یونیورسٹیوں میں تحقیق پر زور دیا۔ پروفیسر غضنفر علی اور ڈاکٹر عبدالرشید نے ٹیگور کی کتابوں کی ببلیوگرافی پیش کی۔ فرحت احساس نے اس کام کو انجام تک پہنچانے کے لیے ٹرانسلیشن ریویو کمیٹی، ٹرانسلیشن کنٹرول کمیٹی، لینگویج کمیٹی اور کور کمیٹی بنانے پر زور دیا۔ انجم عثمانی نے ٹیگور پر ایک ڈاکیومنٹری بنانے کی بات کی۔ ان کے علاوہ پروفیسر محمد اسدالدین، پروفیسر زبیر احمد فاروقی، ڈاکٹر محمد یونس، ڈاکٹر انورادھا گھوش، پروفیسر حبیب اللہ، ڈاکٹر صہیب احمد، پروفیسر رضوان قیصر، پروفیسر وہاج الدین علوی، ڈاکٹر مولا بخش، عبدالنصیب خاں، اور ڈاکٹر ندیم احمد نے بھی گراں قدر مشورے دیے۔ اس پروگرام میں شعبہ کے اساتذہ پروفیسر شہناز انجم، ڈاکٹر احمد محفوظ، ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی، ڈاکٹر عمران احمد عندلیب، ڈاکٹر سرور الہدیٰ، ڈاکٹر خالد مبشر اور جامعہ کے ریسرچ اسکالرز کے علاوہ پروفیسر محمد ذاکر، پروفیسر توقیر عالم خاں، پروفیسر تسنیم فاطمہ، سہیل انجم، ڈاکٹر افضل مصباحی، ڈاکٹر عبدالحی، ڈاکٹر اشفاق عارفی اور جناب محمد وسیم بھی اس مذاکرے میں شریک ہوئے۔

(تصویر میں (دائیں سے بائیں) پروفیسر خالد محمود، پروفیسر سید محمد ساجد (رجسٹرار جامعہ) پروفیسر انیس الرحمٰن، ڈاکٹر انورادھا گھوش، پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر شہزاد انجم، جناب سہیل انجم)

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 نومبر 2012

کے استاد پروفیسر وہاج الدین علوی نے اظہار تشکر پیش کیا۔ اس موقعے پر انتظار حسین نے کہا کہ برصغیر کی علمی روایت کو جامعہ نے توسیع دی۔ وہ پاکستان جا کر جامعہ ملیہ اسلامیہ کی علمی خدمات اور ٹیگور پروجیکٹ کا خصوصی طور پر ذکر کریں گے۔ پروفیسر خالد محمود نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی مجموعی علمی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے موجودہ شیخ الجامعہ جناب نجیب جنگ کی اردو دوستی اور ٹیگور پروجیکٹ کے حوالے سے ان کی خصوصی کاوشوں کا بھی ذکر کیا۔ اشفاق حسین نے جامعہ ملیہ اسلامیہ سے اپنے دیرینہ رشتے اور اردو زبان وادب سے گہرے لگاؤ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ زبان سے محبت کسی بھی ملک میں رہ کر کی جاسکتی ہے۔ انھوں نے کناڈا میں اردو شعر وادب کی صورت حال سے روشناس کرایا۔ اصغر ندیم سید نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی شاندار تاریخ اور علمی روایت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ نوجوان پاکستانی نقاد ناصر عباس نیر نے جامعہ ملیہ

اسلامیہ کو استعماریت کے مقابلے میں قومی خودمختاری کی ایک علامت سے تعبیر کیا۔ اس موقعے پر پروفیسر عراق رضا زیدی، ڈاکٹر عبدالحلیم کے علاوہ شعبۂ اردو کے اساتذہ میں پروفیسر شہناز انجم، ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی، ڈاکٹر ندیم احمد، ڈاکٹر عمران احمد عندلیب، ڈاکٹر سرور الہدیٰ، ڈاکٹر خالد مبشر بھی موجود تھے۔ اس پروگرام میں ریسرچ اسکالر اور طلبا و طالبات بھی شریک ہوئے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 18 نومبر 2012

پریم چند کی شخصیت

نئی دہلی: یو جی سی، سرپرستی والی خصوصی امداد پروگرام کے تحت شعبۂ انگریزی کا DRS پروجیکٹ، آؤٹ ریچ پروگرام کے باہمی اشتراک سے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں 'پریم چند ترجمے میں' کے موضوع پر تین روزہ بین الاقوامی سیمینار مورخہ 28 نومبر سے 30 نومبر 2012 کو منعقد کیا گیا۔ سیمینار کا افتتاحی اجلاس مورخہ 28 نومبر صبح دس بجے دیار میر تقی میر، ٹیگور ہال میں ہوا۔ یونیورسٹی آف کیلی فورنیا برکلے، امریکہ کی پروفیسر وسودھا ڈالمیا نے افتتاحی اجلاس میں کلیدی خطبہ پیش کیا۔ انھوں نے 'پریم چند کے عہد کو ترجمہ میں منتقل کرنے کے موضوع پر اظہار خیال کیا۔ شعبۂ انگریزی (نارتھ کیمپس) کے پروفیسر آلوک رائے نے اس اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے 'پریم چند تحقیقی مواقع' کے موضوع پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر آلوک رائے رشتے میں پریم چند کے پوتے بھی ہیں۔ افتاحی اجلاس میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر جناب خواجہ اکرام الدین اور ساہتیہ اکادمی سکریٹری جناب کے ایس راؤ مہمان ذی وقار تھے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 29 نومبر 2012

شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ترجمے پر ورکشاپ

نئی دہلی: شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی میں یو جی سی کے ڈی آر ایس فیز-II کے تحت ایک سہ روزہ ورکشاپ بہ عنوان 'ہندوستانی علاقائی زبانوں کے تخلیقی ادب کا اردو میں ترجمہ' 7 تا 9 دسمبر 2012 منعقد کیا گیا ہے۔ اس ورکشاپ میں ہندوستان کی علاقائی زبانوں کے تخلیقی ادب کی منتخب کہانیوں کو اردو زبان میں منتقل کیا گیا ہے تاکہ اہل اردو ہندوستان کی دیگر علاقائی زبانوں کے تخلیقی ادب سے روشناس ہوسکیں۔ 7 دسمبر کو اس ورکشاپ کی افتتاحی تقریب کی صدارت کرتے ہوئے

صدر شعبہ پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ یو جی سی کے ڈی آر ایس کے تحت شعبہ اردو کو دوسرے فیز میں علاقائی زبانوں کے تخلیقی ادب کو اردو میں منتقل کرنے کا کام سونپا گیا ہے۔ جبکہ اس اسکیم کے پہلے فیز میں ذرائع ابلاغ عامہ اور زبان اور ترجمے کے فن کے موضوع پر کام کیا گیا تھا جس کو مکتبہ جامعہ سے دو کتابوں کی صورت میں شائع کر دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

پریس ریلیز، سلمان فیصل، ریسرچ اسکالر، 8 دسمبر 2012

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

ابوالکلام آزاد جنوبی ایشیا کے عظیم مفکر

حیدر آباد: پروفیسر انور معظم، سابق صدر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، عثمانیہ یونیورسٹی نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں مولانا آزاد چیئر کی جانب سے منعقدہ قومی سیمینار بعنوان 'مولانا ابوالکلام آزاد: ایک ہمہ جہت مفکر' کے افتتاحی اجلاس میں کلیدی خطبہ دیتے ہوئے کہا کہ عام طور پر ہم مغربی فکر کی اندھی تقلید کرتے ہیں جب کہ ہمارے پاس مولانا آزاد جیسے مفکرین موجود ہیں۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت ممتاز مورخ پروفیسر بی شیخ علی سابق وائس چانسلر گوا و منگلور یونیورسٹیز نے کی۔ انھوں نے کہا کہ مولانا آزاد اپنے عہد سے زائد ایک صدی آگے تھے۔ مولانا نے خواتین کی تعلیم کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہا کہ پردہ میں رہتے ہوئے خواتین کو اعلیٰ تعلیم فراہم کی جانی چاہیے کیونکہ یہی اسلامی تعلیمات کا بھی تقاضہ ہے اور خواتین کی شراکت کے بغیر ہماری قوم صحیح معنوں میں ترقی نہیں کرسکتی۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کو آزادی سے بھی زیادہ ضروری تصور کرتے تھے۔ پروفیسر بی شیخ علی نے اپنی صدارتی تقریر میں شاہ ولی اللہ کے بعد ذہانت کا دوسرا نام مولانا آزاد کو قرار دیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس'، دہلی، 20 نومبر 2012

مولانا آزاد پر سیمینار

لکھنؤ: مولانا آزاد کی تعلیمی بصیرت نے نئے ہندستان کی تعلیمی ترقی میں نمایاں رول ادا کیا۔ آج بھی یہ پالیسی اور بصیرت تعلیمی ترقی کی ضامن ہے۔ ان خیالات کا اظہار روہیل کھنڈ یونی ورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر محمد مزمل نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی لکھنؤ کیمپس کے زیر اہتمام یوم آزاد اور یوم تعلیم کے موقع پر یوپی پریس کلب میں ایک علمی مذاکرے کے صدارتی خطاب کے دوران کیا۔ انھوں نے کہا کہ مولانا آزاد نے لڑکیوں کے لیے تعلیمی دروازے اس وقت کھولے جب کیمبرج اور آکسفورڈ جیسی یونی ورسٹیوں میں لڑکیوں کے لیے تعلیمی دروازے بند تھے۔ انھوں نے مولانا آزاد کی تعلیمی پالیسیوں کا ذکر کرتے ہوئے پہلی تعلیمی پالیسی کے دستاویز کا خاص طور پر ذکر کیا اور کہا کہ مولانا نے جو تعلیمی پالیسی وضع کی تھی اس میں تعلیمی اداروں کے فروغ، معیار اور سب کے لیے یکساں تعلیم کے مواقع کو خاص اہمیت

محمد اشفاق، ظفریاب جیلانی، پروفیسر محمد مزمل پروفیسر شارب ردولوی، پروفیسر نصیر احمد خاں، مائک پر ڈاکٹر عبدالقدوس (انچارج مانو لکھنؤ کیمپس)

حاصل تھی۔ مانو لکھنؤ کیمپس کے انچارج ڈاکٹر عبدالقدوس نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ انھوں نے مولانا آزاد کے قائم کردہ یونی ورسٹی ایجوکیشن، انسٹی ٹیوٹ آف ہائر ٹکنالوجی کھڑک پور، انڈین کونسل فار ایگریکلچرل اینڈ سائنٹفک ریسرچ، ساہتیہ اکادمی، سنگیت ناٹک اکادمی، للت کلا اکادمی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس سے مولانا کی تعلیمی بصیرت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے معروف قانون داں اور ایڈیشنل ایڈوکیٹ جنرل (یوپی) جناب ظفریاب جیلانی نے کہا کہ مولانا آزاد کے تعلیمی پیغام کو عام کرنے کی ضرورت ہے اور اس کے لیے ہمیں آگے آنا ہوگا۔ پروفیسر شارب ردولوی نے کہا کہ مولانا ابوالکلام آزاد مجروح قوم کے لیے توانائی کا ذریعہ ہیں۔ مولانا آزاد نے مسلمانوں کے اتحاد، ذہنی تربیت اور سیاسی نظریے کو مرتب کیا۔ جناب اشفاق حسین (کناڈا) نے کہا کہ مولانا نہ صرف اپنے عہد کے مسائل سے واقف تھے بلکہ اپنی پوری زندگی ان مسائل کے حل کے لیے نبرد آزما رہے۔ اس موقع پر انھوں نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی کی ترجمے کے میدان میں خدمات کی تعریف کی۔ پروفیسر نصیر احمد خاں نے کہا کہ مادری زبان میں تعلیم کی جو اہمیت اور افادیت ہے اس کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس موقع پر مہمانوں کی خدمت میں کیمپس کے اساتذہ نے مومنٹو پیش کیے۔ ڈاکٹر عمیر منظر نے نظامت کا فریضہ انجام دیا۔

پریس ریلیز، عمیر منظر، MANUU لکھنؤ کیمپس، 11 نومبر 2012

چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی

میرٹھ: شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میں ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کی صدارت میں مولانا محمد علی جوہر کی یوم پیدائش پر ایک سیمینار کا انعقاد ہوا۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر آصف علی نے بحسن وخوبی انجام دیے۔ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ مولانا محمد علی جوہر کی اتنی بڑی شخصیت ہونے کے پیچھے ان کی ماں بی اماں کا ہاتھ رہا۔ انھوں نے مزید کہا کہ مولانا محمد علی جوہر یونیورسٹی مولانا کو پہلا عملی خراج عقیدت ہے۔ جس سے مولانا کی عظمت مزید واضح ہوگئی۔ مہمان خصوصی آفاق احمد نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ مولانا محمد علی جوہر کو سچا خراج عقیدت یہ ہے کہ ہم ان کی زندگی کو اپنا آئیڈیل بنالیں۔

پریس ریلیز، اسلم جمشید پوری، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ، 10 دسمبر 2012

کرناٹک اسٹیٹ ویمنس یونیورسٹی

یوم اردو

بیجاپور: کرناٹک اسٹیٹ ویمنس یونیورسٹی بیجاپور کے پوسٹ گریجویٹ شعبہ اردو کے زیر اہتمام علامہ اقبال کی یوم پیدائش کی مناسبت سے یوم اردو منایا گیا۔ اس موقع پر مہمان خصوصی کی حیثیت سے علامہ اقبال کی شخصیت پر گہرا مطالعہ کرنے والے ایک غیر اردو داں ہبلی کے محمد امان اللہ انعامدار نے اقبال کی شخصیت اور ان کے افکار و نظریات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا اقبال کی شخصیت ایک عہد ساز شخصیت ہے۔ انھوں نے بتایا کہ علامہ اقبال نے اپنے کلام کے ذریعے نوجوانوں کو بیدار کرنے کے لیے بانگ درا، ضرب کلیم وغیرہ کے ذریعے انقلاب برپا کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ جلسے کے اعزازی مہمان و صحافی رفیع بھنڈاری نے بتایا کہ علامہ اقبال کے اعزاز میں صحیح اور حقیقی معنوں میں خراج عقیدت اس وقت ممکن ہے جب ہم علامہ اقبال کی تعلیمات و اصولوں بالخصوص حب الوطنی وقومی یکجہتی کو اپنی زندگی میں روبہ عمل لائیں۔ صدر جلسہ یونیورسٹی میں شعبہ لسانیات کی ڈین وجے شری سبرو نے بتایا کہ علامہ اقبال کی شاعری اور نثری تخلیقات میں علمی وفکری سرمایہ موجود ہے۔ قبل ازیں ڈاکٹر ایم بی دلشاد نے خیر مقدم کیا۔ شہ نشیں پر مینجمنٹ کے ڈین پروفیسر کاشی، ڈاکٹر طاہرہ بیگم، ڈاکٹر علیم اللہ حسینی، ڈاکٹر سمیع اللہ، ڈاکٹر جاوید قاسمی موجود تھے۔

روزنامہ 'سالار' بنگلور، 11 نومبر 2012

عالمی اردو نامہ

برطانیہ

پانچویں عالمی اردو کانفرنس

لندن: کراچی آرٹس کونسل پاکستان کے زیرِ اہتمام 4 روزہ پانچویں عالمی اردو کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں ہندوستان سے آنے والے ممتاز نقاد ڈاکٹر شمیم حنفی نے 'ہندوستان میں اردو ادب کا اجمالی جائزہ' اور ممتاز فکشن نگار انتظار حسین نے 'پاکستان میں اردو ادب کا اجمالی جائزہ' کے عنوان پر اظہار خیال کیا۔ افتتاحی اجلاس کی مجلس صدارت ڈاکٹر شمیم حنفی، فاطمہ ثریا بجیا، ڈاکٹر اسلم فرخی، انتظار حسین، حمایت علی شاعر، ڈاکٹر پیرزادہ قاسم، محمد علی صدیقی، ڈاکٹر مبارک علی، کشور ناہید، مسعود اشعر، امینہ سید، ڈاکٹر انور سجاد، درمش بلگر، سعید نقوی اور محمد حسین سید پر مشتمل تھی۔ پانچویں عالمی اردو کانفرنس کے پانچویں روز دوسرے سیشن میں ممتاز اردو فکشن نگار انتظار حسین نے ضیا محی الدین کے فن اور شخصیت پر بات کی۔ انھوں نے کہا کہ پاکستان میں مزاحمتی ادب موجود ہے جب کہ ہندوستان میں مزاحمتی ادب کی روایت موجود نہیں۔ میں اس وقت سے ڈرتا ہوں جب لوگوں کے درمیان وئی اختلاف نہ رہ جائے اور وہ ایک طرح کا سوچنے لگیں۔ دوسرے سیشن سے خطاب کرتے ہوئے ڈاٹر شمیم حنفی نے کہا ہے کہ ضیا محی الدین نے انھوں نے الفاظ کو برتنے کا فن سیکھا حالانکہ انھیں ان سے ایک ہی تفصیلی ملاقات کا موقع ملا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہر لفظ پہلے آواز کی صورت میں کھلتا ہے پھر اس کے معنی منکشف ہوتے ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 8 دسمبر 2012

اقوام متحدہ

اقوام متحدہ میں صوفیانہ موسیقی

اقوام متحدہ: اقوامِ متحدہ کا ہیڈ کوارٹر روح پرور صوفیانہ کلام سے گونج اٹھا۔ اس پروگرام کی میزبانی کا سہرا، سلامتی کونسل کے موجودہ صدر ہندوستان کے سر ہے۔ اس پروگرام کے ذریعے اقوام عالم کو امن ومحبت، رواداری اور تکثیریت کا پیام دیا گیا۔ 'سب کے لیے

پاکستان

میراجی: مشرق ومغرب کا نقاد

کراچی: بھارت سے تشریف لائے ہوئے ممتاز ادیب، دانشور پروفیسر ڈاکٹر شمیم حنفی نے کہا ہے کہ میراجی اپنے دور میں ایک نئی دنیا کا خواب دیکھ رہے تھے، وہ ن م راشد اور فیض احمد فیض سے بھی پوری طرح آگاہ تھے، انھیں مشرق اور مغرب میں یکساں مقبولیت حاصل تھی، میراجی کو یاد کرنا سب سے سنجیدہ مرحلہ اور میرے نزدیک وہ سب سے زیادہ سنجیدہ شاعر تھے۔ ان خیالات کا ظہار انھوں نے پانچویں عالمی اردو کانفرنس کے دوسرے روز اپنا مقالہ 'میراجی: مشرق ومغرب کا نقاد' پیش کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ فیض اور میراجی کی شاعری اس دور کے سماجی، معاشرتی اور روحانی زندگی کے ہر رخ کو دکھاتی ہے، ان تینوں میں سے کسی کو بھی ہٹا کر نہیں دیکھا جاسکتا، ڈاکٹر شمیم حنفی کا کہنا ہے کہ میراجی نے سر پر منڈلاتی ہوئی موت کو اطمینان سے قبول کرلیا تھا ن م راشد کے نزدیک میراجی ان کے معاصرین میں سب سے بڑا تخلیقی دماغ رکھتے تھے، معلومات میں میراجی کی شاعری کو ٹیگور کے برابر قرار دیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ فکری طور پر میراجی کی نثر بھی سب سے مختلف تھی، میراجی معلوم سے زیادہ نامعلوم کے سفر پر چلنا پسند کرتے تھے۔ معروف ادیب اور صحافی وسعت اللہ خان نے اپنے موضوع 'میراجی آج' میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ میراجی کا کلام آج بھی کل کی طرح بے حد مقبول ہے۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے اپنے موضوع 'میراجی کے تراجم' میں کہا کہ ہماری تنقید اتنی بالغ نہیں ہوئی کہ مراجی کی شاعری کے جہاں کی مکمل طور پر سیر کرسکے۔ ممتاز شاعری ڈاکٹر پروفیسر شاہدہ حسن نے اپنے موضوع 'میراجی کی گیت نگاری' میں کہا کہ ان کا شعری دراصل اپنے اندر چھپے ہوئے آدمی کی تلاش اور دریافت ہے، انھوں نے شع وادب میں سب سے انوکھی دکان کھولی تھی۔ ممتاز شاعرہ فہمیدہ ریاض نے اپنے موضوع 'میراجی کی جمالیات' میں اظہارِ خیال کیا کہ فرانسیسی مصنف ژولیان نے اردو میں کتاب لکھی۔ ژولیان نے منٹو کے مضمون 3 گولے' کا حوالہ دیا۔ منٹو کی بات اس کو دیکھ کر اس کی شاعری میرے لیے اور پیچیدہ ہوگئی۔ ان کا کہنا ہے کہ میراجی کی شاعری بہت ذہین اور اعلیٰ ذوق کے افراد سمجھ سکتے ہیں لیکن اس کے درمیان اس کی شخصیت اور 'تین گولے آجاتے ہیں' منٹو کہتے ہیں حسن، عشق اور موت کے درمیان میراجی کا رخ نوکیل نہیں تھا بلکہ زندگی اور موت کا لباس تھا اور دونوں سروں کو تھامے ہوئے تھے۔ آخر میں صدر محفل ممتاز شاعر کشور ناہید نے مختصر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا اگر میراجی کے بارے میں بہت زیادہ جاننا چاہتے ہیں تو اختر الایجان کی یادداشتیں ضرور پڑھ لیں جو ان کے آخری وقتوں کے ساتھی تھی۔ نظامت علی حیدر ملک نے کی۔

روزنامہ 'جنگ' کراچی، 8 دسمبر 2012

محبت، کسی سے عداوت نہیں' کے عنوان کے تحت یہ موسیقی ریزپروگرام، 26/11 حملوں کی چوتھی برسی کے موقعے پر منعقد کیا گیا۔ اس پروگرام میں اجمیر شریف کے مشہور شاہی قوالوں اور اقوام متحدہ کے سیمفونی آرکسٹرا نے اپنے فن کا جادو جگاتے ہوئے سماں باندھ دیا۔ ہندوستان کے مستقل نمائندہ برائے اقوام متحدہ ہردیپ سنگھ پورے نے شائقین سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اس موسیقی ریز پروگرام کا مقصد 'امن ومحبت، رواداری اور تکثیریت کا پیام بھیجنا ہے۔ یہ اقدار، آج کی دنیا میں بتدریج غائب ہوتے جارہے ہیں۔(پروگرام میں شرکت کے لیے اجمیر کے شاہی قوالوں کو ہندوستان سے بطور خاص مدعو کیا گیا تھا)۔ شرکائے محفل نے ان فن کاروں کی صوفیانہ قوالی کا، زبردست تالیوں کی گونج میں خیر مقدم کیا۔ اس پروگرام سے قبل اقوام متحدہ کے ادارہ اکادمی امپاکٹ کے زیراہتمام ایک پینل مذاکرات بعنوان 'عقیدہ، تبادلۂ خیال اور اتحاد' منعقد ہوا۔

روزنامہ 'منصف' حیدرآباد، 28 نومبر 2012

سعودی عرب

جدہ سعودی عرب میں ڈاکٹر کلیم ضیا کے اعزاز میں ایک شعری نشست

تنظیم 'اردو گلبن' جدہ کے زیراہتمام جناب عرفان بارہ بنکوی اور جناب ناصر برنی کی معیت میں بروز جمعرات 30 اگست 2012، بعد نماز عشا بمقام دولت کدہ امین نجمی، کیا گیا۔ مشہور معروف پاکستان نژاد شاعر جناب نعیم حامد علی الحامد نے فرمائی۔ آپ گزشتہ تقریباً 45 برسوں سے سعودی عرب میں مقیم ہیں۔ ہمدرد یونی ورسٹی، پاکستان نے آپ کو (اردو میں ڈاکٹر آف فلاسفی) کی ڈگری تفویض فرمائی۔ حال ہی میں جدہ، میں آپ نے اردو کی پہلی لائبریری ذاتی طور پر قائم فرمائی جس میں ایک اندازے کے مطابق مختلف النوع کتب، نایاب اور کم یاب کے علاوہ بشمول مختلف مخطوطات، پندرہ ہزار ہیں۔ اس کے بعد غزلوں اور نظموں کا دور شروع ہوا۔ ہر شاعر نے اپنی بہترین تخلیقات پیش کیں۔ اس نشست میں تقریباً 50-40 حضرات کی موجودگی مشاعرہ صبح ہونے تک چلتا رہا۔

پریس ریلیز، وسیم فرحت کارانجوی، 23 نومبر 2012

دوحہ قطر

عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ

نئی دھلی: عالمی شہرت یافتہ ادبی تنظیم 'مجلس فروغ اردو ادب دوحہ قطر' کے زیراہتمام دوحہ شیرٹن ہوٹل کے السلوئی ہال میں 16 ویں عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ کی تقسیم اور عالمی مشاعرہ 2012 منعقد کیا گیا۔ یہ ایوارڈ وزیرثقافت وفنون وتراث قطر عزت مآب ڈاکٹر حمد عبدالعزیز الکواری کے خصوصی نمائندے ڈاکٹر مرزوک بشیر بن مرزوک کے ہاتھوں تاحیات اردو زبان وادب کی گراں قدر اور اعلیٰ خدمات کے اعتراف میں ہندوستان سے ممتاز افسانہ نگار شموئل احمد اور پاکستان سے نامور مزاح نگار وشاعر عطاء الحق قاسمی اور خصوصی فروغ اردو ادب ایوارڈ شہرۂ آفاق ٹی وی سیریل مرزا غالب میں مرزا غالب کا مرکزی کردار نبھانے والے منفرد اداکار نصیرالدین شاہ کو پیش کیا گیا۔ تقریب کی صدارت پروفیسر خورشید رضوی نے کی۔ عزت مآب سنجیو اروڑا (ہندستانی سفیر)، عزت مآب محمد سرفراز احمد خان زادہ (پاکستانی سفیر)، چیئرمین مجلس محمد عتیق، محمد صبیح احمد بخاری بھی اس موقع پر موجود تھے۔ عالمی شہرت یافتہ نقاد و دانشور پدم بھوشن پروفیسر گوپی چند نارنگ، مسز منورما نارنگ، مسز رتنا پاٹھک شاہ نے بطور مہمانانِ اعزازی تقریب میں شرکت کی۔ اس تقریب میں ایوارڈ یافتگان کی خدمات پر لکھے گئے مضامین پر مشتمل ایک یادگاری مجلّے کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ 16 ویں عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ کی تقریب پذیرائی پروفیسر گوپی چند نارنگ کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ انھوں نے فنونِ لطیفہ اور فن اداکاری کے تناظر میں نصیرالدین شاہ کو عہد حاضر کا اہم ترین اور بڑا اداکار قرار دیا۔ نصیرالدین شاہ نے اس خصوصی ایوارڈ کے لیے مجلس فروغ اردو ادب دوحہ قطر کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ جو اعزاز مجھے بخشا ہے میں اپنے آپ کو قطعی طور پر اس کا مستحق نہیں سمجھتا۔ انھوں اپنے اس ایوارڈ کو فلم ساز نغمہ نگار گلزار اور مشہور غزل گو جگجیت سنگھ (مرحوم) کے نام کردیا۔ تقریب کے آخر میں مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس میں ہندوستان سے جناب منور رانا، رئیس انصاری، اقبال اشہر، نزہت انجم، پاکستان سے ڈاکٹر خورشید رضوی، عطاء الحق قاسمی، سرفراز شاہد، رخشندہ نوید، محمد علی (آسٹریلیا)، احسان شاہد (برطانیہ) نے بطور خاص شرکت کی جبکہ دوحہ قطر کی نمائندگی فرتاش سید اور اشفاق احمد قلق نے کی۔ صدارت پروفیسر خورشید رضوی اور نظامت کے فرائض محمد اسلم کولسری نے انجام دی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 24 نومبر 2012

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

خبرنامہ

این سی پی یو ایل کی موبائل وین

گیا: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ذریعے چلائی جارہی اردو زبان کی کتابوں کی نمائش اور فروخت کے لیے ملک میں گھوم رہی موبائل وین جمعہ کو 3 دنوں کے لیے گیا ضلع پہنچی جس کا افتتاح اے ایس پی شفیع الحق، مرزا غالب کالج، گیا کے سکریٹری ایڈوکیٹ قیصر، شرف الدین، پرنسپل ڈاکٹر غلام صمدانی، کائنات انٹرنیشنل کالج گیا کے ڈائریکٹر آفاق احمد سمیت دیگر لوگوں نے فیتہ کاٹ کر کیا۔ رہائش پر خطاب کرتے ہوئے اے ایس پی مسٹر حق نے کہا کہ یہ موبائل وین اپنے آپ میں کتابوں کی

پوری ایک دنیا سمیٹے ہوئے ہے۔ اس وین میں اردو کے مشہور ومعروف شاعروں اور لکھنؤ کے کاتبوں کے علاوہ اردو کی بیش قیمت کتابیں موجود ہیں۔ اس میں بچے اور بڑے سبھی کے لیے کتابیں موجود ہیں۔ وہیں پروگرام کو خطاب کرتے ہوئے کائنات انٹرنیشنل کالج گیا کے ڈائرکٹر مسٹر احمد نے اس موبائل وین کے تعلق سے اظہار خیال کیا۔ مسٹر احمد نے کہا کہ اس موبائل وین کے ذریعے حکومت ہند ملک کے دور دراز علاقے میں اردو زبان کو اس کا واجب حق دلانے کی کوشش کررہی ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 9 دسمبر 2012

نمائش فن خطاطی وجلسۂ تقسیم اسناد

حیدر آباد: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان محکمہ ثانوی و اعلیٰ تعلیم وزارتِ ترقی انسانی وسائل حکومت ہند نے خطاطی و گرافک ڈیزائن کے لیے ملک بھر کی 11 ریاستوں میں 35 مراکز کام کررکھے ہیں انھیں مراکز میں سے شعبۂ خطاطی و گرافک ڈیزائن ادارہ ادبیاتِ اردو بھی ایک مرکز ہے۔ اس مرکز کے تحت ہر سیشن کے طلبا و طالبات کی جانب سے ہر سال تیار کردہ فن پاروں کی 8 تا 15 روزہ نمائش منعقد کی جاتی ہے تاکہ طالب فن کی ہمت افزائی ہو اور طلبا میں فن خطاطی سیکھنے کا شوق پیدا ہو۔ ان طغروں میں قرآنی آیات، نعتیں، نظمیں، قطعات واشعار وغیرہ کو مختلف خطوط مثلاً خط ثلث، خطِ نسخ، خطِ نستعلیق، خطِ دیوانی، خطِ رقعہ کو مختلف وضع سے مختلف اشیا پر جیسے کاغذ، گل دانوں، کانچ، لکڑی، کپڑا تھرماکول وغیرہ پر کتابت کرکے بہترین شاہکار تیار کیے جاتے ہیں۔ ایک جلسہ یکم ستمبر 2012 کو 'ایوانِ اردو' ادارہ ادبیاتِ اردو حیدرآباد میں منعقدہ کیا گیا تھا۔ اس جلسے میں تعلیمی سال برائے 2010-2008 کے طلبا و طالبات کو جنھوں نے اپنا دو سالہ، ڈپلومہ برائے خطاطی و گرافک ڈیزائن تکمیل کیا ہے انھیں ڈپلومہ اور کلاس ٹوپر class topper کو مومنٹو سے نوازا گیا ہے ان میں انعامِ اوّل حافظ عائشہ صدیقہ انعام دوم حافظ شائستہ تبسم انعام سوم آفرین غزالہ اور ترغیبی انعام حافظ اسما بیگم کو عطا کیا گیا۔ اسی ضمن میں حافظ عائشہ صدیقہ کو ڈاکٹر شیلا راج میموریل گولڈ میڈل سے نوازا گیا۔

مہمان خصوصی ڈاکٹر الیاس رضوی نے کہا کہ فنِ خطاطی ایک اچھا فن ہے مجھے اس طلبا و طالبات کے فن پاروں کو دیکھ کر کافی مسرت ہورہی ہے۔ اگر ان طلبا و طالبات میں سے کوئی بھی اس فن کی تربیت دینے کا اور روزگار سے منسلک ہونے کا ارادہ رکھتے ہوں تو انھیں حکومتِ آندھراپردیش اقلیتی مالیتی کارپوریشن سے مالی تعاون دیا جائے گا اور ہر طرح کی مدد بھی دی جائے گی۔ ایس اے شکور صاحب نے اپنی تقریر کے دوران کہا کہ مجھے کافی مسرت ہوتی ہے اور فخر کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ ہمارے مرکز کو ایسے اساتذہ کی خدمات حاصل ہیں جو قومی اور بین الاقوامی شہرت رکھتے ہیں۔

سنٹر انچارج و استاد خطاط عبدالغفار قومی بین الاقوامی مقابلوں میں حصہ لیتے

ہیں۔ 2009 میں کل ہند مقابلہ خطاطی کشمیر میں انعامِ اوّل حاصل کیا ہے اور 2010 میں 18 ویں بین الاقوامی نمائش قرآن (خطاطی) تہران، ایران میں بھی شرکت کرچکے ہیں۔

پریس ریلیز محمد عبدالغفار، سنٹر انچارج و استاذ خطاط، شعبۂ خطاطی و گرافک ڈیزائن، ادارہ ادبیاتِ اردو 'ایوانِ اردو' پنجہ گٹہ، حیدرآباد، 3 دسمبر 2012

قومی اردو کونسل کے تعاون سے

حیات اللہ انصاری کا صد سالہ یوم پیدائش

نئی دهلی: مشہور صحافی اور ادیب حیات اللہ انصاری کے صدسالہ یوم پیدائش کے موقع پر غالب اکادمی، نئی دہلی میں فعال ادبی اور ثقافتی تنظیم ایس ویژن کے زیر اہتمام اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور انڈین کونسل آف ہسٹوریکل ریسرچ (ICHR) کے تعاون سے ایک روزہ قومی سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ جو اس لحاظ سے بہت اہم تھا کہ حیات اللہ انصاری کے فن اور شخصیت پر نہ تو ان کے عین حیات اور نہ بعد از مرگ اب تک ایسا کوئی سمینار یا جلسہ نہیں ہوا تھا۔ سمینار کی ابتدا کرتے ہوئے ایس ویژن کی صدر مہر فاطمہ حسین نے کہا کہ حیات اللہ انصاری جیسی قد آور شخصیت اور قومی سطح کے صحافی کا یوں حاشیے پر چلا جانا افسوسناک امر ہے۔ ایس ویژن کی صدر نے اس بات پر زور دیا کہ نئی نسل کو باضابطے مطالعے کے ذریعہ حیات اللہ انصاری کی صحافتی

اور ادبی عظمت کی بازیافت کی کوشش کرنی چاہیے۔ عہد حاضر کے اہم نقاد ڈاکٹر مولا بخش نے بعض غیر معمولی نکات اٹھاتے ہوئے حیات اللہ انصاری کے 'لہو کے پھول' کو 'آگ کا دریا' کے مقابل کئی خصوصیات کے اعتبار سے بہتر ناول قرار دیا۔ اس کے علاوہ پریم چند کے ذریعے تحریر کردہ Pastoral یعنی دیہی پس منظر پر مبنی فکشن سے اسی پس منظر پر لکھی ہوئی حیات اللہ انصاری کی تحریروں کو ممیز کرتے ہوئے ڈاکٹر مولا بخش نے کہا کہ اردو فکشن کی تاریخ میں پہلی مرتبہ حیات اللہ انصاری نے ثقافتی جغرافیہ کو عبارت کیا۔ اپنے صدارتی کلمات میں پروفیسر صادق نے کہا کہ حیات اللہ انصاری کا تحریر کردہ 'آخری کوشش' عظیم ترین افسانہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ مہمان خصوصی فرحت احساس نے حیات اللہ انصاری کے کارناموں کو ظفر علی خاں، مولانا آزاد، سید عابد حسین، ذاکر حسین، محمد مجیب، خواجہ غلام السیدین کی توسیع بتایا اور فکری بنیادوں پر ہندستانی قومیت کے دھارے میں مسلمانوں کی شمولیت کو صحافتی اقدار میں جاگزیں کیا۔ دوسرے سیشن کے مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر محمد علیم، ڈاکٹر مشتاق صدف، ڈاکٹر اشفاق احمد عارفی اور ڈاکٹر امتیاز وحید نے اپنے وقیع مقالے پیش کیے۔ تیسرے سیشن کی صدارت پروفیسر محمد اسلم اصلاحی نے کی جبکہ سہیل انجم، ڈاکٹر ابوظہیر ربانی، ڈاکٹر محمد توقیر عالم راہی، معید رشیدی، ڈاکٹر اسلم صدیقی نے مقالے پیش کیے۔ آخری اجلاس کے مقالہ نگار پروفیسر شہزاد انجم، ڈاکٹر کوثر مظہری، ڈاکٹر اخلاق آہن، ڈاکٹر سجاد اختر، شگفتہ یاسمین اور مسرت تھے۔

پریس ریلیز، مہر فاطمہ حسین، صدر ایس ویژن، نئی دہلی، 9 دسمبر 2012

میر کا غمِ دوراں اور شعرائے معاصرین

الہ آباد: 2010 میں اس عظیم شاعر کی وفات کے دوسو سال پورے ہونے پر میر صدی کے زیرِ نظر حمیدیہ گرلس ڈگری کالج کے شعبۂ اردو نے اوّل اپنا سالانہ جریدہ 'نقشِ نو' میر نمبر کے طور پر شائع کیا نیز یو جی سی دہلی و قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مشترکہ تعاون سے اس شاعر عظیم کو خراجِ عقیدت کے طور پر دو روزہ قومی سیمینار بموضوع 'اٹھارہویں صدی کی دلّی: میر کا غمِ دوراں اور شعرائے معاصرین' بتاریخ 17,18 نومبر 2012 کو منعقد کیا۔ سیمینار کا افتتاحی جلسہ حمد باری تعالیٰ اور رسمِ گل پوشی سے ہوا ادارے کی پرنسپل ڈاکٹر ریحانہ طارق نے مہمانان، خصوصی و دیگر شرکا کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ میر کا غزل میں کوئی ثانی نہیں اور یہ سیمینار میر کی خراجِ عقیدت کا ضامن ہے۔ اس موقع پر اردو ادب کے

مشہور و معروف ناقد و ماہر میر پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ میر کو صرف غمِ دوراں کا شاعر سمجھنا درست نہیں انھیں سمجھنے کے لیے اس دور کے طور طریقوں کو سمجھنا ہوگا انھیں انگریزی کے معیار پر پرکھنا زیادتی ہوگی۔ مہمانِ خصوصی خواجہ محمد اکرام الدین، ڈائرکٹر NCPUL نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ میر شناسی میں یہ سیمینار ایک پیش رفت ہے میر کو سمجھنے کے لیے ان کے انتخاب کے علاوہ مکمل دیوان کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ صدر جلسہ ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی، مولانا آزاد کالج، کولکاتا نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ میر کا ہر شعر شور انگیز ہے نیز میر پر منعقدہ اس سیمینار میں پیش مقالے یقیناً نئی جہت کے ساتھ میر کو انصاف دلائیں گے۔ محترمہ رشیدہ خان پریسی ڈنٹ حمیدیہ گرلس ڈگری کالج نے سیمینار کی مبارکباد دیتے ہوئے دعائیہ کلمات سے نوازا۔ کالج کی مینیجر محترمہ تزئین احسان اللہ نے سیمینار کے شرکا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے شائقین اردو اس سے ضرور استفادہ کریں گے۔ اس موقع پر کالج کی طالبات کو ان کے امتیازی مقام حاصل کرنے پر گولڈ میڈل، سٹرٹیفکیٹ اور پانچ ہزار روپے کے انعام سے سرفراز کیا گیا۔ اس کے علاوہ پانچ ہزار روپے کی رقم محترمہ رشیدہ خان کی جانب سے ادا کیے گئے۔ اختتامی جلسہ بتاریخ 18 نومبر 2012 جناب پروفیسر عبدالقادر جعفری صاحب، صدر شعبۂ فارسی الہ آباد یونیورسٹی کے زیرِ صدارت منعقد ہوا اس جلسے کے مہمانِ خصوصی جناب ایم اے قدیر، سینئر ایڈووکیٹ ہائی کورٹ تھے اور اختتامی خطبہ ڈاکٹر احمد محفوظ، شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے ادا کیے۔

پریس ریلیز، ناصحہ عثمانی، حلیمہ گرلس ڈگری کالج، الہ آباد، 17 دسمبر 2012

منشی دیانرائن توسیعی خطبہ

کانپور: شعبہ اردو، حلیم مسلم پی جی کالج، کانپور میں قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون سے منعقد دوسرے منشی دیانرائن نگم توسیعی خطبے کے موقع پر بعنوان 'لکھنؤ کی انجمن اور احتشام حسین' پر لکھنو کے فکشن نگار اور ادیب اقبال مجید نے اس عہد کو سامنے رکھ کر احتشام صدی کے موقع پر پروفیسر احتشام حسین کو خراج عقیدت پیش کیا۔ انھوں نے اپنے خطبے میں کہا کہ احتشام حسین اپنے طبقاتی پس منظر، فکری پس منظر اور علمی پس منظر کو دیکھتے ہوئے سجاد ظہیر سے مختلف تھے۔ سجاد ظہیر نے کمیونسٹ پارٹی کے لیے عملی طور پر خاصا کام کیا اور

وقت بھی دیا۔ احتشام صاحب نے پارٹی لائن کو اپنے علمی اور فکری رویے پر کبھی حاوی نہیں ہونے دیا۔ وہ کسی بھی فیصلے کو جلدی قبول نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے تجربے کا ادب میں احترام کرنے پر زور دیا لیکن یہ بھی چاہا کہ اس کا ظہور اس کی ادبی روایت کے بطن سے ہو۔ ادیب پدم شری ڈاکٹر گری راج کشور نے کہا کہ رسائل دو طرح کے ہوتے ہیں ایک رسالہ صرف معاشرے کے اعلیٰ طبقے کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے اور دوسری قسم کے رسائل عام آدمی کے لیے ہوتے ہیں۔ منشی دیانرائن نگم کی ادارت میں نکلنے والا رسالہ 'زمانہ' بھی ایسا ہی ایک رسالہ تھا جس نے ادب، تہذیب اور زبان کو ایک نئی جہت اور سمت عطا کی۔ سوامی رام تیرتھ سے لے کر پریم چند تک ادیبوں کا ایک بہت بڑا طبقہ 'زمانہ' سے وابستہ تھا۔ پریم چند کا نام بھی منشی جی کا ہی دیا ہوا ہے۔ منتظمہ کمیٹی کے سکریٹری ڈاکٹر وسیم رضوی نے کہا کہ منشی دیانرائن نگم سے منسوب یہ توسیعی خطبہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ کیونکہ شہر کانپور ہمیشہ سے گنگا جمنی تہذیب کا گہوارہ رہا ہے۔ گنیش شنکر ودیارتھی اور منشی دیا نرائن نگم جتنے ہندوؤں کے تھے اتنے ہی مسلمانوں کے تھے اور حسرت موہانی اور حافظ حلیم جتنے مسلمانوں کے تھے اتنے ہی ہندوؤں کے تھے۔ اس جلسہ کو پرنسپل ڈاکٹر شکیل احمد، ڈاکٹر جعفر عسکری اور پروفیسر اظہر راہی نے بھی خطاب کیا نظامت صدر شعبہ اردو خان احمد فاروق نے کی۔

پریس ریلیز، خان احمد فاروق، صدر شعبہ اردو، حلیم مسلم پی جی کالج، کانپور، 10 دسمبر 2012

اردو زبان پر منعقدہ قومی سیمینار

کشتواڑ: کشتواڑ شروع سے ہی علم وادب کا گہوارہ رہا ہے۔ اس سرزمین نے غلام رسول کامگار، عشرت کاشمیری، جانباز کشتواڑی، نشاط کشتواڑی، ارمان کشتواڑی وغیرہ جیسے شہرہ آفاق ادیب وشاعر پیدا کیے ہیں۔ اُردو اور فارسی کے لحاظ سے یہ سرزمین بڑی زرخیز رہی ہے۔ یہاں کی غیر سرکاری ادبی انجمنوں نے اس خطے میں اُردو کو فروغ دینے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ کشتواڑ کیمپس جموں یونیورسٹی کی جانب سے کشتواڑ کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اُردو زبان سے متعلق جموں یونیورسٹی اور قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، وزارت ترقی انسانی وسائل، نئی دہلی کے باہمی اشتراک سے قومی سیمینار کا انعقاد ہوا۔ سیمینار میں جن مقالہ نگار حضرات نے مقالات پڑھے اُن میں دہلی یونیورسٹی سے ڈاکٹر علی جاوید، کشمیر یونیورسٹی سے پروفیسر مجید مضمر، پروفیسر نذیر ملک، پروفیسر محی الدین زور کشمیری، جموں یونیورسٹی سے ڈاکٹر محمد ریاض احمد، ڈاکٹر عبدالرشید منہاس، ڈاکٹر چمن لال بھگت کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ کشتواڑ کے مشہور ومعروف شاعر فدا کشتواڑی نے بھی کشتواڑ میں اُردو کی صورتحال سے متعلق مقالہ پڑھا۔ سیمینار کا افتتاح 11 نومبر کو بوقت 11 بجے، ایم ایل اے کشتواڑ سجاد احمد کچلو نے کیا۔ اس موقعے پر ڈپٹی کمشنر کشتواڑ نے افتتاحی تقریب کی صدارت کی۔ اس موقعے پر تقریر کرتے ہوئے ایم ایل اے سجاد احمد کچلو نے اُردو کو ہندوستانی زبان قرار دیتے ہوئے اسے ہندوستان کی تہذیب یافتہ زبان سے تعبیر کیا۔ اپنے صدارتی خطبے میں ڈی سی کشتواڑ جناب محمد سلیم خان نے کشتواڑ کیمپس کو ایک روزہ قومی سیمینار منعقد کروانے کے لیے مبارکباد پیش کی۔ اُنھوں نے کہا کہ اُردو کو کسی ایک مذہب کے ساتھ جوڑنا سراسر غلطی ہے کیونکہ اس زبان نے منشی پریم چند، کرشن چندر، فراق گورکھپوری، پنڈت دیاشنکر نسیم، رتن ناتھ سرشار، جگن ناتھ آزاد جیسے ادبا وشعرا پیدا کیے جن کا تعلق اُس مذہب سے نہیں ہے جس سے اُردو کو منسوب کیا جاتا ہے۔ اپنا کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر علی جاوید نے کہا کہ ریاست جموں وکشمیر ہی ہندوستان کی ایسی واحد ریاست ہے جس کی سرکاری زبان اُردو ہے۔ یہ صرف سرکاری زبان ہی نہیں بلکہ ریاست کی آئینی زبان بھی ہے۔ علی جاوید نے مزید کہا کہ اُردو زبان نے ریاست کے تینوں خطوں کو ایک ہی لڑی میں پروئے رکھا ہے۔ ڈائرکٹر کشتواڑ کیمپس جموں یونیورسٹی پروفیسر شہاب عنایت ملک نے اپنے استقبالیہ خطبے میں ڈائریکٹر قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان ڈاکٹر خواجہ اکرام کا شکریہ ادا کیا جنھوں نے اس سیمینار کے انعقاد میں ایک اہم رول ادا کیا۔ اُنھوں نے مطالبہ کیا کہ سرکاری زبان ہونے کے ناطے تمام سرکاری دفاتر کے سائن بورڈ اُردو میں تحریر کیے جائیں، اُردو اساتذہ کی تقرری کی جائے۔ افتتاحی تقریب کے دوران ہی اُردو کے نامور افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کو خراج عقیدت پیش کرنے کی غرض سے، منٹو کے ہی افسانہ 'ٹھنڈا گوشت' پر مبنی اسٹیج ڈرامہ کھیلا گیا جسے کافی پسند کیا گیا۔ اس موقعے پر کشتواڑ میں پہلی مرتبہ کتب نمائش کا بھی انعقاد کیا گیا۔ دوپہر دو بجے اس قومی سیمینار کا اہم اجلاس منعقد ہوا جس میں مقالہ نگار حضرات نے اپنے مقالات کے ذریعے اُردو زبان کی ریاست جموں وکشمیر میں موجودہ صورتحال کا جائزہ لیا اور اس کے متعلق مسائل کے ازالہ کے لیے اہم تجاویز پیش کیں۔ اس اجلاس میں جن مقالہ نگاروں نے مقالے پڑھے اُن میں فدا کشتواڑی، سلام کشتواڑی، ڈاکٹر ریاض احمد، ڈاکٹر چمن لال بھگت، ڈاکٹر عبدالرشید منہاس کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ شام چار بجے اس سیمینار کی اختتامی تقریب منعقد ہوئی جس میں ایم ایل اے اندروال غلام محمد سروڑی بطور مہمان خصوصی شریک ہوئے۔ انھوں نے کشتواڑ کیمپس کو متحرک بنانے کے لیے کیمپس کے ڈائریکٹر شہاب عنایت ملک کو مبارکباد پیش کی۔ غلام محمد سروڑی نے کشتواڑ کیمپس کو کتابیں خریدنے کے لیے 50 ہزار روپے مالی امداد دینے کا اعلان کیا اور کشتواڑ کیمپس کی ترقی کے لیے ہر ممکن تعاون دینے کی یقین دہانی کرائی۔ یہ ایک روزہ سیمینار ڈائریکٹر کشتواڑ کیمپس پروفیسر شہاب عنایت ملک کی جانب سے پیش کردہ شکریہ کی تحریک سے اختتام پذیر ہوا۔

پریس ریلیز، ڈاکٹر چمن لال بھگت، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، جموں یونیورسٹی، 16 نومبر 2012

سید احتشام حسین: فن اور شخصیت

نئی دھلی: اردو ادب سے متعلق پروگرام کالجوں، یونیورسٹیوں اور ایوانوں تک محدود تھا۔ منار ایجوکیشنل اینڈ

ویلفیئر سوسائٹی نے اپنا دو روزہ قومی سیمینار اوکھلا کے شاہین باغ جیسے علاقے میں کروا کر اسے عام لوگوں تک پہنچانے کا قابل تحسین کام کیا ہے۔ ان خیالات کا اظہار شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے استاد ڈاکٹر کوثر مظہری نے سید احتشام حسین فن اور شخصیت کے موضوع پر منارا ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے زیر اہتمام دو روزہ قومی سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں کیا۔ ڈاکٹر کوثر مظہری نے سید احتشام حسین کی تنقید نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ احتشام صاحب کبھی بھی اپنے نظریے سے پیچھے نہیں ہٹے جب کہ اس دور میں بہت ساری ادبی شخصیات ایسی تھیں جن کے نظریات میں وقت اور حالات کے ساتھ تبدیلی دیکھی گئی۔ دیال سنگھ کالج کے شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر مولا بخش نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ سید احتشام حسین کی تنقید نگاری کا ہر دور میں اعتراف کیا گیا۔ احتشام صاحب ادب کی باریکیوں سے پوری طرح واقف تھے۔ انھوں نے لفظ کے چھپے معانی کو ایک تحریک سے تعبیر کیا۔ افتتاحی اجلاس کے بعد ہونے والے اجلاس کی صدارت شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے استاد ڈاکٹر محمد عمر فاروق نے اور نظامت ڈاکٹر عزیز احمد خان نے کی۔ دوپہر کے طعام کے بعد منعقدہ اجلاس کی صدارت دی سنڈے انڈین کے سب ایڈیٹر، جناب فاروق احمد نے کی۔ اس اجلاس میں فاضل مقالہ نگاروں نے سید احتشام حسین کے فن اور شخصیت پر جامع اور فکر انگیز مقالے پیش کیے۔ فاروق صاحب نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ اس موقعے پر ہمیں سید احتشام حسین کے فکر وعمل سے بہت کچھ سیکھنے کی ضرورت ہے۔ اس اجلاس کی نظامت جناب سلمان عبدالصمد نے کی۔ دوسرے دن پہلے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر عبدالحق نے کی۔ ڈاکٹر عبدالحق نے احتشام صاحب کے فنی محاسن کا تذکرہ کرتے ہوئے انھیں ایک عہد ساز نقاد قرار دیا اور مقالہ نگاروں کی تحریروں پر تبصرہ کرتے ہوئے انھیں ایک اہم ادبی سرمایہ قرار دیا۔ دوسرے اجلاس کی صدارت کے فرائض ڈاکٹر عزیز احمد خان نے انجام دیے۔ انھوں نے اس موقعے پر سید احتشام حسین کی ہمہ جہت شخصیت اور ان کی فنی صلاحیتوں کا تذکرہ کرتے کرتے ہوئے انھیں جدید دور کی تنقید نگاری کا ایک روشن منار قرار دیا۔ اس دو روزہ قومی سیمینار میں ڈاکٹر عبدالحق، ڈاکٹر عزیز احمد خان، صہیب احمد، فیضان شاہد، محمد قمر، شرف الدین، سلمان عبدالصمد، اسرار احمد، صغیر اور فاروقی احمد سمیت بڑی تعداد میں لوگوں نے مقالے پیش کیے۔ سیمینار کے اختتامی اجلاس میں منار ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے نائب صدر جناب اسرار احمد نے سیمینار میں شریک مہمان اور بڑی تعداد میں موجود سامعین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بھی شکریہ ادا کیا جس کے تعاون سے یہ سیمینار کامیاب ہوسکا۔

روزنامہ 'جدید میل' دہلی، 22 اکتوبر 2012

تصوف اور پنجاب

مالیر کوٹلہ: پنجاب اردو اکادمی کی جانب سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے گورنمنٹ کالج مالیر کوٹلہ کی آرٹ گیلری میں منعقدہ دو روزہ قومی سیمینار کامیابی سے ہمکنار ہوا۔ سیمینار کی افتتاحی تقریب کی صدارت مفسر قرآن و رکن آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی نے کی اور کلیدی خطبہ پروفیسر اخترالواسع نے پیش کیا۔ مالیر کوٹلہ کے ایس ڈی ایم راجیش ترپاٹھی مہمان اعزازی کے طور پر شریک ہوئے۔ اس تقریب میں چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر اسلم جمشید پوری اور ڈاکٹر کیول دھیر بھی بطور خاص تشریف لائے۔ اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر محمد اقبال نے موضوع کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے کہا کہ سرزمین پنجاب نے علوم وفنون اور تہذیب وتمدن کے ارتقا میں نمایاں رول ادا کیا ہے اور تصوف کی تاریخ بھی پنجاب کا ذکر کیے بغیر کسی طور مکمل نہیں ہوتی۔ انھوں نے کہا کہ پانچ دریاؤں کی سرزمین میں چھٹا دریا تصوف اور روحانیت کا رواں دواں ہے۔ پروفیسر اخترالواسع نے پنجاب اور تصوف کے باہمی رشتے پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ پنجاب کے صوفیائے کرام اور بزرگان دین کی عطا سے تصوف کی کائنات مالا مال ہوئی۔ افتتاحی تقریب کی نظامت ڈاکٹر ندیم احمد نے کی اکادمی کے رکن ڈاکٹر انوار احمد انصاری نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ تین مختلف تعلیمی نشستوں کی مجلس صدارت میں پروفیسر اخترالواسع، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ فلسفہ کے ڈاکٹر لطیف حسین کاظمی اور گورنمنٹ کالج مالیر کوٹلہ کے پروفیسر عبدالرشید شامل تھے۔ دوسری مجلس کی صدارت میں پروفیسر ڈاکٹر منظور حسن، پروفیسر دھرم چند وانش، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری اور تیسرے تعلیمی اجلاس کی صدارت سنسکرت دانشور پروفیسر ڈی ڈی بھٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے ڈاکٹر شکیل اختر شامل تھے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر منظور حسن نے بحسن وخوبی ادا کیے۔ اختتامی تقریب کی صدارت ہریانہ

اردو اکادمی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر دیس راج سپرا نے کی۔ اختتامی تقریب کو خطاب کرتے ہوئے اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر محمد اقبال نے کہا کہ گزشتہ سال جب انھیں اکادمی کے سکریٹری کی ذمہ داری سونپی گئی تو ان کی اولین خواہش اس اکادمی کو فعال اور سرگرم بنانے کی تھی۔ اس عرصے میں منعقد تین قومی سیمینار اسی کوشش کا حصہ ہیں۔ اس سیمینار میں پنجاب کے مشہور افسانہ نگار جناب کرشن بیتاب کا افسانوی مجموعہ 'شعلوں پر برف باری'، مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی کی کتاب 'سیدھا راستہ' کا ڈاکٹر انوار احمد انصاری کی طرف سے پنجابی میں ترجمہ کی گئی کتاب کی رسم اجرا بھی عمل میں آئی۔ اکادمی کی طرف سے پاسداران اردو پنجاب (رجسٹرڈ) کے جنرل سکریٹری اور نامور اردو و پنجابی شاعر جناب ناز بھارتی نے شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز، محمد اقبال احمد، مالیر کوٹلہ، پنجاب، 3 نومبر 2012

اردو زبان کی ترویج میں مدارس کا کردار

آگرہ: اردو زبان کے فروغ کے لیے مرکزی حکومت کی جانب سے مسلسل کوشش کی جارہی ہے۔ اس میں اہم کردار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کا ہے، جس کی مدد سے پورے ملک میں اردو کے فروغ مراکز بنائے گئے ہیں جہاں پر اردو کی تعلیم دی جاتی ہے ساتھ ہی اردو کے سیمینار بھی منعقد کیے جاتے ہیں۔ ایسا ہی ایک سیمینار انڈین سوشل ویلفیئر اینڈ ایجوکیشن سوسائٹی کی جانب سے اردو کے فروغ میں مدارس کا کردار موضوع پر شاہ گنج آگرہ میں کیا گیا۔ اس سیمینار کی نظامت مولانا ذکر الرحمان اور صدارت عبدالصلیحان نے کی۔ اس موقعے سے مولانا سید ظہر علی نے اردو اور مدارس کے تعلق پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ محمد شعیب نے اردو کی خدمت میں مدارس کے کردار پر مکمل روشنی ڈالی۔ عبدالحمید نے ہندوستان میں اردو زبان اور دینی مدارس کے خدمات کے بارے میں تفصیلی گفتگو کی۔ ان کے علاوہ ماسٹر ابرار احمد، محمد منان خاں اور ماسٹر سرور حسین نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 1 دسمبر 2012

مندی کا مظاہرہ کیا، اس کی وجہ سے ادب کی تاریخ پر منٹو کے دستخط ثبت ہو چکے ہیں۔ منٹو کے متن کی باز قرأت کئی نئے دروازے کھول دیتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام منعقدہ سہ روزہ بین الاقوامی سمینار کے افتتاحی اجلاس میں اردو کے ممتاز نقاد و دانشور پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کیا۔ پاکستان کے ممتاز فکشن نگار انتظار حسین نے افتتاحی تقریب میں کہا کہ منٹو ایسا افسانہ نگار ہے جو دنیا کی تمام زبانوں میں اپنی منفرد شناخت رکھتا ہے۔ پہلے اجلاس کی صدارت پاکستان کی ممتاز شاعرہ کشور ناہید نے کی۔ اس اجلاس میں پاکستان کے اصغر ندیم سید، ناصر عباس نیر اور جرمنی کے ریز کمگ نے اپنے اپنے مقالات پیش کیے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت اصغر ندیم سید نے کی۔ جب کہ عتیق اللہ، شمیم طارق اور مولا بخش نے مقالات پیش کیے۔ تیسرے اجلاس کی صدارت امریکہ سے آئے ستیہ پال آنند نے کی جب کہ اس اجلاس میں شافع قدوائی، خاور نقیب اور وسیم بیگم نے مقالات پیش کیے۔ پروگرام کی نظامت ساہتیہ اکادمی کی ڈپٹی سکریٹری رینو موہن بھان نے کی اور اکادمی کے پروگرام آفیسر مشتاق صدف نے آخر میں مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر کافی بڑی تعداد میں اہم شخصیات موجود تھیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 19 نومبر 2012

غالب اور منٹو

نئی دھلی: غالب اکادمی بستی حضرت نظام الدین میں غالب اور منٹو پر خصوصی لیکچر دیتے ہوئے پروفیسر شمس الحق عثمانی نے کہا کہ غالب اور منٹو نام نہیں بلکہ استعارے ہیں۔ انھوں نے ان دونوں تخلیق کاروں کی فنی بصیرت کو مساوی قرار دیتے ہوئے کہا کہ منٹو، غالب سے اس

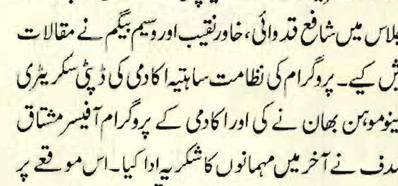

قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے لاچاری اور بے بسی میں غالب کو ہم نفس بنایا۔ غالب اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد نے کہا عوام میں غالب کی مقبولیت سہراب مودی کی فلم سے ہوئی جس کی اسکرپٹ منٹو نے لکھی تھی، انھوں نے کہا کہ منٹو نے غالب کی ڈومنی کو زندہ جاوید بنایا۔ غالب اکادمی کے صدر پروفیسر شمیم حنفی نے اپنے بیان میں کہا کہ منٹو نے اپنی تحریروں کے عنوانات غالب سے اخذ کیے ہیں جو تعلق غالب کا اپنے معاشرے سے تھا وہی تعلق منٹو کا اپنے معاشرے سے تھا۔ صدارتی خطبہ دیتے ہوئے معروف افسانہ نگار سردار رتن سنگھ نے کہا کہ غالب اور منٹو کی بہت سی باتوں میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ پروگرام کی ابتدا میں معروف شاعر متین امروہوی نے منٹو اور غالب کو منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا۔ پروگرام سے قبل ہندوستان کے سابق وزیر اعظم اور اردو دوست اندر کمار گجرال کو دو منٹ کی خاموشی کے ساتھ خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 3 دسمبر 2012

منٹو: شخصیت و فن

گلبر گه: انجمن ترقی اُردو گلبرگہ اور کرناٹک اُردو اکادمی بنگلور کے زیر اہتمام اُردو کے مایہ ناز فکشن رائٹر سعادت حسن منٹو کی شخصیت و فن پر ایک روزہ قومی سیمینار کا انعقاد بمقام حضرت خواجہ بندہ نوازؒ ایوانِ اُردو میں عمل میں آیا۔ سیمینار کا افتتاح جناب مرزا عظمت اللہ نے شمع روشن کر کے کیا۔ انھوں نے نے کہا کہ منٹو کا فکشن معاشرتی آئینہ ہے، اس کا فن آج کے عہد میں بھی نیا ہے۔ جناب ولی احمد نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ اُردو فکشن کا بڑا افسانہ نگار سعادت حسن منٹو ہے۔ منٹو کی پیدائش کے سو برس بعد بھی منٹو فہمی کا ماحول برقرار ہے۔ افتتاحی اجلاس کے آغاز میں ناظمِ اجلاس جناب خواجہ پاشاہ انعامدار (نائب صدر انجمن) نے کہا کہ منٹو کے موضوعات میں تنوع ہے، اسی لیے وہ آج کے عہد میں بھی بامعنی ہے۔ اجلاسِ اول کی صدارت پروفیسر حمید سہروردی نے کی۔ جناب سید محمد اشرف (دہلی) نے منٹو فن اور شخصیت کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ منٹو کے افسانوں کو تین حصوں میں تقسیم کر کے مطالعہ کرنا چاہیے۔ ایک تقسیم ہند، دوسرا عورت اور تیسرا فرد کی آزادی۔ انھوں نے کہا کہ منٹو کے افسانوں پر فحش نگاری کا الزام ہونے کے باوجود منٹو کے افسانوں سے لذت نہیں بلکہ عبرت حاصل کی جاسکتی ہے۔ جناب امجد جاوید (پرنسپل نیشنل پی یو کالج) نے منٹو موضوعات کا تنوع کے زیر عنوان مقالہ پیش کیا۔ ڈاکٹر کوثر پروین نے منٹو کی کہانیوں میں نسوانی کردار کے موضوع پر مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے منٹو کے افسانے ٹوبہ ٹیک سنگھ کو افسانے کی معراج قرار دیا۔ پروفیسر حمید سہروردی نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ منٹو مانوس سچائیوں کا افسانہ نگار تھا۔ اور اُس نے معاشرے کی سچائیوں کو خوبصورت انداز سے پیش کیا ہے۔ جناب اکرم

نقاش اور ڈاکٹر رفیق رہبر نے مہمانان کا تعارف کروایا۔ ڈاکٹر محمد افتخار الدین اختر نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ اجلاس دوم کی صدارت ڈاکٹر وہاب عندلیب نے کی۔ جناب سلام بن رزاق نے منٹو کے چند کردار اور انسانیت نوازی کے زیر عنوان مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ منٹو نے جنس کی کھڑکی سے انسان کے باطن کا نظارہ کیا ہے۔ جناب حامد اکمل نے منٹو اور اُردو افسانے کے زیر عنوان مقالے میں کہا کہ اقبال اور اُردو شاعری اور منٹو اُردو افسانے کی آبرو ہیں۔ انھوں نے کہا کہ منٹو کے یہاں بے باکی، ترقی پسندی اور انسان پرستی پائی جاتی ہے... ڈاکٹر غضنفر اقبال نے منٹو اور قومی ہم آہنگی کے زیر عنوان مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے منٹو کے فکشن کے حوالے سے قومی ہم آہنگی پر روشنی ڈالی۔ صدرِ اجلاس ڈاکٹر وہاب عندلیب نے کہا کہ منٹو کی صد سالہ تقریبات کا یہ ایک کامیاب سیمینار ہے۔ اس سیمینار کے حوالے سے منٹو شناسی کا نئے سرے سے آغاز ہو رہا ہے۔ اجلاس دوم کے مقالہ نگاروں کا تعارف جناب واجد اختر صدیقی نے کرایا۔ جناب میر شاہنواز علی خان شاہین نے نظامت کے فرائض بحسن و خوبی انجام دیے۔ جناب مجیب احمد (شریک معتمد) کے اظہارِ تشکر پر ایک روزہ منٹو سیمینار کا اختتام ہوا۔

پریس ریلیز، شیخ شہباز احمد، گلبرگہ، 3 دسمبر 2012

منٹو پر ہندی اکادمی کا سیمینار

نئی دھلی: ہندی اور اردو کے دانشوروں کا خیال ہے کہ رسم الخط کے لحاظ سے یہ دونوں زبانیں الگ الگ ہیں لیکن ان کی روح ایک ہے۔ ہندی اکادمی دہلی کے زیر اہتمام 'منٹو، ہندی اور اردو کہانی کے روابط' کے موضوع پر کل یہاں منعقدہ ایک سیمینار میں ہندی کے دانشور ڈاکٹر نریندر موہن نے کہا کہ اردو کے عظیم افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کے بغیر ہندی کی تاریخ ادھوری ہے۔ مشہور ہندی اردو ادیب ڈاکٹر عبدل بسم اللہ نے کہا کہ ہندی اور اردو دونوں کی اپروچ ایک ہے۔ خالد اشرف نے کہا کہ ہندی اور اردو دونوں کی کہانیوں کے پلاٹ، انداز بیان، اسلوب اور ماحول ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔ جس

قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر اور انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری کی میٹنگ

نئی دہلی: انجمن ترقی اردو (ہند) اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دونوں کل ہند سطح کے ادارے ہیں، اس لیے ملک گیر پیمانے پر اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے لیے دونوں اداروں کا باہمی تعاون اور تال میل ضروری ہے۔ ان خیالات کا اظہار انجمن ترقی اردو (ہند) کے نومنتخب جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی نے قومی کونسل برائے فروغ زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین سے ان کے دفتر میں ملاقات کے دوران کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین نے سب سے پہلے ڈاکٹر اطہر فاروقی کو انجمن کا جنرل سکریٹری مقرر ہونے پر مبارک باد دی اور کہا کہ ہمیں امید ہے کہ آپ کی سربراہی میں انجمن اردو کی ترقی اور فروغ کے لیے کوئی ایسا لائحہ عمل تیار کرے گی جس کو بروئے کار لا کر ہم اردو کی عظمت پارینہ کو دوبارہ بحال کرسکیں اور اس سلسلے میں قومی کونسل کا انجمن کے ساتھ ہمیشہ تعاون برقرار رہے گا۔ ڈاکٹر اطہر فاروقی نے کہا کہ انجمن ترقی اردو (ہند) کا جنرل سکریٹری مقرر ہونا میرے لیے اعزاز کی بات ہے اور میری پوری کوشش ہوگی کہ میں اردو اور انجمن سے محبت کرنے والے سبھی مشاہیر بزرگوں، دوستوں اور عزیزوں کی خواہشات پر پورا اتروں اور اس سلسلے میں مجھے سبھی حضرات کا تعاون اور مشورے درکار ہیں۔ اس ملاقات کے دوران انجمن اور کونسل کے باہمی اشتراک کے موضوع پر بھی گفتگو ہوئی اور مستقبل میں اردو کے فروغ کی سمت میں عملی اقدامات کرنے پر غور وخوض کیا گیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا'، دہلی، 9 نومبر 2012

سے ہندی اور اردو کی کہانیاں پڑھتے وقت قاری کو ایک ہی طرح کا احساس ہوتا ہے۔ ڈاکٹر چینچل چوہان نے کہا کہ پریم چند اور منٹو جیسے افسانہ نگاروں نے انھیں ہندی اور اردو کی طرف راغب کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ دونوں زبانوں کی کہانیوں کے کردار کا کلچر اور ان کے ماحول یکساں معلوم ہوتے ہیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس'، دہلی، 24 نومبر 2012

ادبی تھیوری اور شعریات

نئی دہلی: اردو سے مجھے بے حد محبت ہے جب کہ میری تعلیم اردو میں نہیں ہوئی اس کے باوجود میں اردو کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہوں۔ ان خیالات کا اظہار مرکزی وزیر برائے اقلیتی امور کے رحمٰن خان نے وزارت ثقافت اور سماجی و ادبی تنظیم سالویشن کے زیر اہتمام ساہتیہ اکادمی میں 'ادبی تھیوری اور شعریات' کے موضوع پر منعقدہ سہ روزہ قومی سیمینار کی افتتاحی تقریب میں اردو کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے اپنے بیان میں اردو اور اقلیتوں کے تعلیمی نظام کے حل کی یقین دہانی کراتے ہوئے کہا کہ حکومت کی یہ ذمے داری بنتی ہے کہ وہ زبانوں کی حفاظت کرے اور بچوں کو ان کی مادری زبان میں تعلیم دے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 نومبر 2012

صنف غزل کی خصوصیات وامتیازات

نئی دہلی: رابطہ ادب اسلامی ہند کے دفتر ڈی 223 ابوالفضل انکلیو جامعہ نگر نئی دہلی میں 'صنف غزل کی خصوصیات وامتیازات' کے موضوع پر منعقد سیمینار کا آغاز ہوا۔ نائب صدر رابطہ پروفیسر شفیق خان ندوی نے شعر وشاعری کے سلسلے میں مثبت ومتوازن اسلامی موقف کی وضاحت کرتے ہوئے اردو غزل کی اہمیت اجاگر کی اور کہا کہ اس کی اسی اہمیت وافادیت اور معنویت کے پیش نظر عالمی رابطہ ادب اسلامی کے سرپرست مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے 'اردو غزل کی امتیازی خصوصیات' کے موضوع عربی زبان میں ایک وقیع کتاب تالیف کی جو 2006 میں عربی زبان میں شائع ہوکر اردو زبان وادب کی عظمت میں اضافے کا باعث بنی۔ بزرگ صحافی رضوان اللہ فاروقی نے 'غزل ایک صنف ساحری' کے عنوان سے اپنا مفصل مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ "کم سے کم الفاظ میں دریائے معانی کو سمونا غزل کی خاصیت ہے۔"

پریس ریلیز، شفیق احمد خان، پروفیسر عربی ڈپارٹمنٹ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی 6 دسمبر 2012

نشتر خانقاہی فن وشخصیت

نجیب آباد: آکاش وانی نجیب آباد کے زیر اہتمام 'نشتر خانقاہی فن وشخصیت' پر منعقدہ سیمینار کو خطاب کرتے ہوئے شکیل بجنوری، ڈاکٹر ششی پربھا، جلیس نجیب آبادی اور ڈاکٹر افشاں ملک نے نشتر خانقاہی کے فنون شخصیت اور صحافتی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ نشتر خانقاہی کو شاعری وراثت میں ملی۔ ان کی شاعری میں 16 رکنی بحروں کا بھی استعمال ہوا ہے۔ انھوں نے سماج کے کرب، حسن وعشق اور ذاتی تجربات کے ساتھ ساتھ ایک پیغام

بھی دینے کی کوشش کی ہے۔ کلپنا پنلج کی نظامت میں منعقدہ تقریب کا آغاز نشتر خانقاہی کی غزل کو منور علی اور ان کے ہمنواؤں نے پیش کیا۔ اس موقعے پر آکاش وانی کے پروگرام ایگزیکٹو افسر وبھوتی بھوشن بھٹ، اقبال احمد صدیقی، راجن گپتا، ونے دھیانی، شفق بجنوری، فاروق بجنوری، امبر کھربندہ، ہرپال سنگھ ایڈووکیٹ، ڈاکٹر آفتاب نعمانی، راجندر تیاگی اور کے ایس طوفان وغیرہ نے شرکت کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 9 نومبر 2012

اقبال اور وطنیت

لکھنؤ: مولانا محمد علی جوہر فاؤنڈیشن کے تحت شاعر مشرق علامہ اقبال کا یوم پیدائش عالمی یوم اردو کے طور پر منایا گیا۔ اس موقعے پر جوہر فاؤنڈیشن ہال، امین آباد میں 'علامہ اقبال اور وطنیت' کے موضوع پر ایک سیمینار

عالمی شہرت یافتہ ادیب و شاعر پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے کی صدارت اور عمران انواروی کی نظامت میں ہوا۔ جرمنی سے آئے شاعر و صحافی عارف نقوی نے سیمینار میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ پروگرام کا آغاز ڈاکٹر ہارون رشید کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ مقررین نے علامہ اقبال کو ایک ایسی ہمہ جہت شخصیت قرار دیا کہ جسے کسی خانہ میں قید نہیں کیا جاسکتا۔ پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے کہا کہ علامہ اقبال پر دنیا کی ہر بڑی زبان میں لکھا گیا ہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ علی گڑھ سے آئے پروفیسر شکیل صمدانی نے علامہ اقبالؒ اور مشہور ڈکٹیٹر مسولینی کی تاریخ ملاقات کے حوالے سے کہا کہ علامہ اقبال حق بات کہنے میں کبھی معمولی سے ہچکچاہٹ بھی محسوس نہیں کرتے تھے۔ مہمانِ خصوصی عارف نقوی نے علامہ اقبال کے جرمنی

کے قیام اور دوران تعلیم کے بعض دلچسپ واقعات بیان کرتے ہوئے کہا کہ علامہ اقبالؒ کی شخصیت نے اپنے افکار ونظریات سے ہر مکتبۂ فکر ونظر کو متاثر کیا۔ عارف نقوی نے اقبال کی نظموں کے حوالے سے اقبال کی وطنیت پر سیر حاصل گفتگو کی۔ ڈاکٹر سلطان شاکر ہاشمی نے علامہ اقبالؒ کو ایک عبقری شخصیت قرار دیا۔ مولانا محمد علی جوہر فاؤنڈیشن کے صدر چودھری شرف الدین، ادیب و شاعر قمر گونڈوی نے بھی اپنے خیالات ظاہر کیے۔ فاروق خاں جاذب نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ پروگرام کے کنوینر وصی صدیقی نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 12 نومبر 2012

یومِ اردو

بیدر: علامہ سر محمد اقبال ایک مفکر، دانشور اور مذہب انسانیت کے علمبردار تھے۔ علامہ اقبال کے یوم پیدائش پر 'یوم اردو' کے منعقدہ جلسے میں اپنے مضمون میں یہ بات ماہر تعلیم نثار احمد کلیم نے کہی۔ صحافی سہیل انجم کا مضمون بعنوان 'اقبال: اردو کی ادبی آفاقیت کا نقیب' محمد یوسف رحیم بیدری نے پڑھ کر سنایا۔ 'یوم اردو' کے اس موقعے پر نثری نشست کی صدارت سید یوسف ہاشمی نے کی جب کہ مہمان خصوصی کا فریضہ فراست علی ایڈووکیٹ نے انجام دیا۔ شعری محفل کا انعقاد زیر صدارت نثار احمد کلیم عمل میں آیا۔

روزنامہ 'سالار' بنگلور، 11 نومبر 2012

علامہ اقبال کی یاد میں شامِ غزل

نئی دہلی: شاعر مشرق علامہ اقبال نے اپنی شاعری میں دنیا کو انسانیت کا پیغام دیا۔ ان کے اس پیغام کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم آج ان کے 135 ویں یوم پیدائش پر انھیں دل کی گہرائیوں سے خراج تحسین وعقیدت پیش کرتے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار آج پاکستان کے ہائی کمشنر سلمان بشیر نے پاکستان ہائی کمیشن میں علامہ اقبال کے یوم پیدائش کے موقعے پر منعقد 'شام غزل' کے موقعے پر کیا۔ مسٹر سلمان بشیر نے کہا کہ علامہ اقبال کی شاعری میں خودی کا جذبہ اور ارتقا کا عمل جھلکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اقبال کی شاعری کسی ایک ملک یا ایک خط کے لیے نہیں بلکہ پورے عالم انسانیت کے لیے ہے۔ یہی وجہ کہ ان کی شاعری کی اہمیت اور افادیت آج بھی برقرار ہے اور مستقبل میں بھی برقرار رہے گی۔ 'شام غزل' کا آغاز کرتے ہوئے پاکستان ہائی کمشنر سلمان بشیر کی بیگم ترنم بشیر نے تمام مہمانان کا خیر مقدم کیا اور دیوالی کی مبارکباد بھی پیش کی۔ انھوں نے اس پروگرام کے لیے ہندوستان آنے پر شفقت امانت اللہ خان کا خاص طور سے شکریہ ادا کیا۔ ترنم بشیر نے کہا کہ آج کی یہ شام شاعر مشرق علامہ اقبال کے نام سے منسوب ہے جنھوں نے انسانیت اور محبت کا پیغام کا دیا۔ اس کے بعد انھوں نے مشہور ومعروف گلوکارہ شفقت امانت اللہ کو دعوت دی، جس کے بعد شفقت امانت اللہ نے سامعین کو مسحور کر دیا اور فرمائش پر ایک کے بعد ایک نظم غزل اور گیت سنایا۔ اس موقعے پر پاکستان کے ہائی کمشنر بابر امین، کونسلر ابرار ہاشمی، سینئر صحافی کلدیپ نیر، پاکستان کے معروف گلوکار عارف لوہار، صوفی گلوکار ظلِ خان، انڈیا اسلامک کلچر سینٹر کے صدر سراج الدین قریشی اور عالمی اردو ٹرسٹ کے چیئرمین عبدالرحمٰن کے علاوہ کئی ممالک کے ڈپلومیٹ اور سرکردہ شخصیات موجود تھیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 10 نومبر 2012

یومِ تعلیم

نئی دہلی: مولانا ابوالکلام آزاد کے 124 ویں یوم پیدائش پر جو کہ یوم تعلیم کے طور پر منایا جاتا ہے۔ ایک تقریب میں فرینڈز فار ایجوکیشن کے صدر فیروز بخت احمد نے مولانا آزاد کی حیات وخدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ مولانا آزاد باہمی یگانگی اور ہندوستان کی قومی تحریک کے مقتدر ومعتبر رہنما تھے۔ انھوں نے کہا کہ ان کا قلم ایک

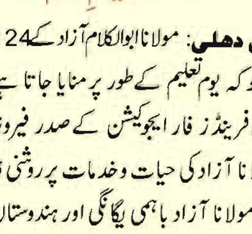

ایسا نسخہ کیمیا تھا جو ملک وملت کے تمام امراض کا بہترین علاج ثابت ہوا۔ انھوں نے بتایا کہ آج اگر دنیا میں ہندوستانی اسلام ایک آئیڈیل کے طور پر پیش کیا جارہا اور کہا جارہا ہے کہ ہندوستانی مسلمان نہ تو دہشت کا حصہ ہے اور نہ ہی منفی سیاست کا، تو اس کا سہرا مولانا آزاد کے سر جاتا ہے، جنھوں نے ایسے ماحول میں آنکھیں کھولیں، جو بڑی آزمائش کا وقت تھا۔ ایسے ماحول میں مولانا آزاد، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا عبدالوحید صدیقی، مولانا عبیداللہ سندھی اور دیگر علما وصوفیا نے مسلمانوں میں انقلابی ذہن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ جمیل قریشی (سکریٹری اترپردیش کانگریس کمیٹی اقلیتی شعبہ) نے کہا کہ ہندوستان کی مٹی میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی وغیرہ سبھی کا خون پسینہ شامل ہے اور اس ملک کی تاریخ اور بناوٹ ہی ایسی ہے کہ صدیوں سے یہ تمام قومیں اتحاد واتفاق کے ساتھ رہتی آئی ہیں۔ مولانا آزاد نے اسی بات کا درس مسلمانان ہند کو دیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی اسٹینڈنگ کونسل کے رکن محمد اطیب صدیقی نے کہا کہ مولانا آزاد کے مزار پر جو تختیاں لگائی گئی ہیں، ان کا سہرا فیروز بخت احمد کی کاوشوں کو جاتا ہے کہ جنھوں نے مزار آزاد پر لگے تالے کو بھی عدالت میں مقدمہ برائے فلاح عامہ کے ذریعہ کھلوایا۔ اس موقعے پر اقبال محمد ملک نے کہا کہ آج ہندوستان کی یہ عمارت جنونی عناصر کی منفی تحریکات کے نتیجے میں سخت خطرے میں ہے۔ کاش آج مولانا جیسا کوئی موجود ہوتا کہ جو ہندو اور مسلمان کو اس مذہبی جنون کے طوفان سے نکالتا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 نومبر 2012

یومِ تعلیم

گلبرگہ: حلیمہ ادبی وثقافتی مرکز کے زیر اہتمام حلیمہ کمپیوٹر سینٹر میں منعقدہ جلسہ 'یوم تعلیم' کے موقعے پر طلبا سے خطاب کرتے ہوئے مہمان خصوصی ڈاکٹر جلیل تنویر نے کہا ''دنیا ایک آئینہ خانہ ہے اگر اس کا کوئی ایک گوشہ بھی گرد آلود ہو تو تمام آئینے گرد آلود نظر آئیں گے۔ اس لیے اپنے نفس وکردار میں نہایت پاک وشفاف خیالات کو جگہ دیں۔ آج کے طلبہ میں ڈگری یافتہ ہوتے ہوئے قابلیت کا فقدان نظر آرہا ہے، آج اس مسابقتی دنیا میں بغیر قابلیت کے ڈگری کسی کام کی نہیں۔ جناب امجد جاوید پرنسپل نیشنل پی یو، کالج گلبرگہ نے اپنے صدارتی خطاب میں فرمایا کہ علم سے ہی دنیا میں عزت وشہرت ملتی ہے، دولت کے بہ نسبت علم کی اہمیت ہر دور میں مسلمہ رہی ہے، تاریخ گواہ ہے مسلمانوں نے ہی سائنس، ریاضی، اور جغرافیہ جیسے جدید علوم کو دنیا سے روشناس کرایا۔ لہٰذا اللہ کی قربت اور دنیا کی مادی ترقی وضروریات صرف اور صرف علم سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ جلسہ یوم تعلیم کے موقعے پر طالبات میں شیخ امرین، شہباز بیگم، کنیز فاطمہ اور سپریا بسواس نے ابوالکلام آزاد کی شخصیت اور ان کے تعلیمی نظریات پر تقاریر کیں۔

پریس نوٹ، امجد جاوید، پرنسپل نیشنل پی یو کالج، گلبرگہ، 21 نومبر 2012

مولانا ابوالکلام آزاد ڈے

گیا: بزم قلم کار گیا کے زیر اہتمام 11 نومبر 2012 کو قاسمی مڈل اسکول گیا میں 'مولانا ابوالکلام آزاد ڈے' کے

موقعے پر ایک سیمینار کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت شری رامیشور یادو (لیڈر جے دیو) نے کی جب کہ مہمان خصوصی واعزازی کی حیثیت سے پروفیسر کے کے نارائن صدر شعبہ انگریزی گیا کالج گیا وسابق کنٹرولو آف اکزامینیشن مگدھ یونی ورسٹی بودھ گیا تشریف فرما تھے۔ ان کے علاوہ صدر بزم پروفیسر شوکت علی اور سرپرست بزم قلم کار شری رائے مدن کور (سابق اسپیشل سکریٹری، بہار سرکار) نے اس فنکشن کی قیادت کی۔ پروگرام کا آغاز بزم قلم کار گیا کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر شکیل علائی نے کیا اور پروگرام کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کرتے ہوئے بزم قلم کار گیا کا تعارف پیش کیا۔ سیمینار کا باضابطہ آغاز ہوا اور حسین احمد خان نے مولانا ابوالکلام آزاد کی سیاسی زندگی پر روشنی ڈالی۔ سید عبدالقادر نے مولانا ابوالکلام آزاد کی اس تحریک پر روشنی ڈالی جب وہ گاندھی جی کے ساتھ مل کر انگریزی حکومت کے جابرانہ نظام کے خلاف کام کر رہے تھے۔ سیمینار کے دوسرے دور کے آغاز میں مہمانِ خصوصی پروفیسر کے نارائن صدر شعبہ انگریزی گیا کالج گیا کی خدمت میں گلدستہ پیش کیا گیا۔ ناظم جلسہ ڈاکٹر شکیل علائی نے ان کی ادبی ومحکماتی کارگزاریوں کی توصیف کی اس کے بعد پروفیسر کے کے نارائن نے مولانا ابوالکلام آزاد کی حیات وخدمات پر روشنی ڈالی اور یہ بھی بتایا کہ سورہ فاتحہ کی تفسیر بھی مولانا نے تیار کی جسے آج مسلمان بھولتے جارہے ہیں۔ مولانا صرف 35 سال کی عمر میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے صدر منتخب ہوئے۔ آخر میں صدر جلسہ شری رامیشور یادو نے صدارتی اسٹیج سے اپنی تقریر میں مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافتی زندگی پر اظہارِ خیال کیا اور ان کی شاہکار تخلیق 'India Wins Freedom' پر اپنے تاثرات پیش کیے۔ بزم کی مجلس عاملہ کے رکن ڈاکٹر اے جے خان مہمان خصوصی، صدر جلسہ ودیگر سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز، بزم قلم کار گیا، 20 نومبر 2012

دھلی:

ایوانِ غالب میں یومِ ذوق

نئی دھلی: ایوانِ غالب نئی دہلی میں مقبول شاعر استاذ ذوق کے یوم پیدائش کے موقعے پر 'یوم ذوق' کا انعقاد ہوا۔ پروگرام کی ابتدا مزار ذوق پر گل افشانی اور فاتحہ خوانی کے ساتھ ہوا۔ استقبالیہ تقریب میں انجمن کے جنرل سکریٹری شاہد ماہلی نے ذوق کی شخصیت پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہ کہ ذوق نے آنے والی نسلوں کے

لیے فکر انگیز شاعری کی بنیاد ڈالی اس لیے ذوق کا ہر ایک شعر اپنے میں ایک سوال ہے۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ وہ اب کسی انجمن یا قوم کے شاعر نہیں ہیں بلکہ ذوق ایک بین الاقوامی سطح کا نام ہے۔ پروفیسر اسلم پرویز نے ذوق کی حیات وخدمات کا ذکر کیا اور گلزار دہلوی نے بھی ذوق کی فنکارانہ صلاحیتوں پر روشنی ڈالی۔ اس کے بعد ایوان غالب میں محفل مشاعرہ کا انعقاد ہوا جس میں گلزار دہلوی، زبیر رضوی، قمر سنبھلی، ابرار کرت پوری، متین امروہوی، وقار مانوی، شہباز ندیم ضیائی، اقبال فردوسی، ظفر مرادآبادی اور شاہد ماہلی نے ذوق اور غالب کی زمین میں کلام پیش کیے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 20 نومبر 2012

رابطہ ادب اسلامی کی ادبی نشست

نئی دھلی: ادب تفریحِ طبع کے ساتھ ساتھ تسکین ذوق، تعمیر سیرت، تحسین اخلاق اور اصلاح معاشرہ کا موثر ذریعہ ہے جس کا استعمال مثبت اور تعمیری مقاصد کے لیے ناگزیر ہے اور دانشمندی کا تقاضہ بھی یہی ہے، یہ بات رابطہ ادب اسلامی ہند کے نائب صدر پروفیسر شفیق احمد خان ندوی نے کہی جو یہاں رابطہ کے دفتر واقع ابوالفضل انکلیو جامعہ نگر نئی دہلی کی ماہانہ ادبی نشست میں موجود ارکان رابطہ ادب اسلامی سے خطاب کر رہے تھے، انھوں نے کہا کہ ادب کو اعلیٰ انسانی، اخلاقی وروحانی مقاصد کے لیے استعمال کرنا لازم ہے تاکہ وہ فرد کی سیرت سازی، انسانی اقدار کی بحالی، اخلاق کی درستگی اور بالآخر سماجی اصلاح کا موثر ذریعہ ثابت ہوسکے۔ عالمی ادب رابطہ ادب اسلامی کے بانی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ موصوف نے سیکڑوں کتابیں لکھیں، ہزاروں تشنگانِ علم وادب کی پیاس رفع کی اور عرب وعجم کے درمیان مرجع خلائق بنے رہے۔ صدر جلسہ ڈاکٹر عبادالرحمٰن نے (جو امریکی یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ ام القریٰ یونیورسٹی مکہ مکرمہ کے شعبہ انگریزی کے سابق استاذ ہیں) کہا کہ مولانا علی میاں رحمہ اللہ صحیح معنوں میں فخر ہند تھے، جن کے باعث عرب ملکوں میں ہندوستانی مسلمانوں کے اعتبار اور وقار میں اضافہ ہوا۔

بحث ومباحثہ اور عمومی تبادلہ افکار میں جن لوگوں نے حصہ لیا، ان میں قابل ذکر نام ہیں: پروفیسر محمد ایوب تاج الدین ندوی، ڈاکٹر فوزان احمد، ڈاکٹر محیب اختر ندوی، ڈاکٹر محمد اکرم، ڈاکٹر عبدالقادر خاں، ڈاکٹر محمد سعید، فضل الرحیم ندوی، عبیداللہ جنید ندوی، اشفاق احمد قاسمی، حافظ ذوالفقار علی اور انجینئر سید زبیر مصطفیٰ، جلسے کی نظامت غیاث الاسلام صدیقی ندوی نے کی۔ آغاز حافظ مطیع الرحمٰن کی تلاوت کلام سے ہوا۔

بذریعہ ڈاک، شفیق ندوی، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، 8 نومبر 2012

انجمن تعمیر اردو کی تقریب

نئی دھلی: انجمن تعمیر اردو دہلی کے زیر اہتمام انجمن کے بانی صدر پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی کی رہائش گاہ واقع نوئیڈا میں ہندی اور اردو شعرا کی ایک مشترکہ شعری نشست کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقعے پر اپنی تقریر میں گلزار دہلوی نے کہا کہ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی خاصیت یہ ہے کہ یہاں تمام مذاہب اور عقائد کے ماننے والے ایک دوسرے کے تیوہار مل جل کر مناتے ہیں۔ اپنے بچپن اور نوجوانی کی دلی کو یاد کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ شیخ و برہمن کی تفریق نہ کرنا اس کی تہذیب کا خاصہ تھا۔ سبھی تہواروں کو مل جل کر ساتھ ساتھ منانے سے بھی مل کی یکجہتی اور اتحاد ومضبوط ہوتا ہے۔ قومی اردو کونسل کے رکن شیخ علیم الدین اسعدی نے کہا کہ گلزار دہلوی نے فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور باہمی اخوت کا جو راستہ دکھایا ہے وہ نہ صرف ہمارے لیے بلکہ آئندہ نسلوں کے لیے بھی مشعل راہ ہے۔

پریس ریلیز، انجمن تعمیر اردو دہلی، 14 نومبر 2012

سائمن قادری کو استقبالیہ

نئی دھلی: جے این یو کے ہندوستانی زبانوں کا مرکز میں والہانہ استقبال کیا گیا۔ پروفیسر محمد شاہد حسین مہمان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا ہے کہ برصغیر ہند وپاک کے بعد برطانیہ اردو کا سب سے بڑا ادبی اور لسانی مرکز ہے۔ جلسے سے خطاب کرتے ہوئے مہمان اسکالر سائمن قادری نے بتایا کہ برطانیہ میں اردو زبان وادب کی آبیاری ان لوگوں نے کی جو ہندوستان اور پاکستان سے آکر برطانیہ میں آباد ہوئے تھے۔ لیکن بعد میں برطانیہ کے لوگوں نے بھی اردو کو پھلنے پھولنے کا ماحول عطا کیا۔ اس وقت برطانیہ میں اردو بولنے والوں کی آبادی تقریباً دس لاکھ ہے۔ خوش آئند بات یہ ہے کہ آج برطانیہ میں اردو بولنے

والوں کی تیسری نسل ٹی وی پر اردو کے پروگرام پسند کررہی ہے۔ یہ وہ طبقہ ہے جس کی اکثریت اردو لکھنے اور پڑھنے میں دلچسپی نہیں لیتی لیکن اردو بولتے ہیں۔ اس طبقے کو اردو رسم الخط سے واقف کرانے کی کوششیں بھی جاری ہیں۔ طلبہ اور اساتذہ کی ایک بڑی تعداد نے سائمن قادری کی باتوں کو غور سے سنا۔ آخر میں پروفیسر انور پاشا نے مہمان اسکالر اور تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز، شفیع ایوب، جے این یو، 27 نومبر 2012

آندھرا پردیش:

انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کی ریاستی کانفرنس

کڑپہ: انجمن ترقی اردو، ضلعی شاخ کڑپہ کے زیر اہتمام 38ویں سالانہ کانفرنس 'اردو تعلیم اور ہماری ذمہ داریاں' کے عنوان کے تحت آزاد ووکیشنل اینڈ ٹریننگ سنٹر، مسلم ایسوسی ایشن ایجوکیشنل کامپلکس، کڑپہ میں منعقد کی گئی۔ جناب سید شاہ مصطفیٰ حسین بخاری نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان نہ صرف شہر کڑپہ میں بلکہ پوری ریاست اور سارے ملک میں لامحدود مسائل کا شکار بنی ہوئی ہے۔ اب حالات بدل رہے ہیں حکومت ہند نے اردو زبان کی اہمیت اور اس کی ضرورت کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ اردو زبان کی ترقی کے بغیر ملک کی ترقی ممکن نہیں۔ جناب غلام یزدانی اپنے خطبہ صدارت میں فرمایا کہ انجمن کا یہ سالانہ اجتماع ایک طرف ہمارے لیے لسانی عید ہے تو دوسری طرف خود اردو زبان والوں کی اپنی مادری زبان سے بے اعتنائی ہمیں مغموم بنا دیتی ہے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت جناب غلام یزدانی اور سید شاہ مصطفیٰ حسین بخاری پر مشتمل رہی۔ اس کانفرنس میں مندرجہ ذیل پانچ مختلف عنوانات پر مقالے پیش کیے گئے: (1) آندھرا پردیش میں اردو مدارس کی زبوں حالی: اردو والوں کا ردعمل (2) اردو مدارس سے اولیائے طلبہ کی عدم دلچسپی (3) کیا اردو ذریعہ تعلیم طلبہ کی ترقی کی راہ میں کاروٹ ہے؟ (4) اردو زبان کی ترویج و ترقی میں اردو اساتذہ اور اولیائے طلبہ کا حصہ (5) آندھرا پردیش میں اردو زبان کا موقف۔ مہمانان خصوصی جناب عبدالرحیم خان، جناب نصرت محی الدین، این ایوب حسین کے علاوہ جناب محمود شاہد، ڈاکٹر وصی اللہ بختیاری، جناب سید شوکت علی، شیخ محمد الیاس، ڈاکٹر محمد قطب الدین سلیم، جناب سید جاوید محی الدین، ڈاکٹر ایم اے قدیر، جناب محمد نقی اللہ خان نے اپنے اپنے علاقوں کی نمائندگی کرتے ہوئے مندرجہ بالا عنوانات پر مقالے پیش کیے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی یوم پیدائش کی مناسبت سے 'قومی یوم تعلیم' جلسہ عام کا انعقاد عمل میں آیا جس میں وزیر اقلیتی بہبود، اردو اکادمی اور اوقاف، جناب محمد احمد اللہ اور جناب سی راما چندریا، وزیر ہندو اوقات، جناب انل کمار، ضلع کلکٹر کڑپہ جناب سید عزیز پاشاہ سابق رکن راجیہ سبھا، جناب نصرت محی الدین، جناب شاہد حسین اور پروفیسر رحمت یوسف زئی مہمانان خصوصی رہے۔ جناب احمد اللہ وزیر اقلیتی بہبود نے اپنی تقریر میں کہا کہ کانگریس حکومت مسلمانوں اور اردو زبان کی ترقی کے لیے کمربستہ ہے۔ اردو اساتذہ کی تقرری کے لیے اقدامات کیے جارہے ہیں۔ پری پرائمری سے پی جی تک اردو تعلیمی سہولیات فراہم کی گئی ہیں۔ شہر کڑپہ میں ایک اور اردو یونیورسٹی کے قیام کے لیے حکومت کافی سنجیدہ ہے۔ دو روزہ ریاستی کانفرنس کے 'اختتامی اجلاس' کی مجلس صدارت میں جناب سید شاہ مصطفیٰ حسین بخاری صاحب اور جناب غلام یزدانی شریک رہے۔ جناب رحیم خان صاحب نے دو روزہ کانفرنس کے تمام اجلاسوں کا جائزہ پیش کیا اور کانفرنس کے شرکا کے سامنے چند قراردادیں پیش کیں جو بہ اتفاق رائے منظور کی گئیں۔

پریس ریلیز، سید ہدایت اللہ، معتمد عمومی، انجمن ترقی اردو شاخ کڑپہ، (آندھرا پردیش)، 2 دسمبر 2012

دکنی مصوری

حیدرآباد: جدید دور میں ترقی کے نام پر تہذیبی ورثہ اور ثقافتی علامتوں کی حامل عمارتوں کی بربادی پر اظہار افسوس کرتے ہوئے ممتاز آرٹسٹ پدم بھوشن جتن داس نے دکنی مصوری پر فارسی قلمکاری اور دیگر نمایاں اثرات کی نشاندہی کی۔ وہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں مرکز برائے مطالعات دکن کے زیر اہتمام منعقدہ 'ایک شام دکنی منی ایچر پینٹنگس کے نام' پروگرام سے خطاب کررہے تھے۔ انھوں نے 'دکنی مصوری' کے موضوع پر لکچر دیتے ہوئے ہندوستان کو ایک فنکار کے نظریہ سے منفرد ملک قرار دیا جہاں ہر ہندوستانی کم ازکم تین زبانیں یا بولیاں جانتا ہے۔ اس موقع پر مرکز کی جانب سے پہلے اشاعت کے طور پر ولیم ڈیل ریمپل کا 11 ستمبر کو دیا گیا۔ لکچر 'دکن کی مشترکہ تہذیب' کا مونوگراف مع ترجمہ اجرا عمل میں آیا۔ اس کا ترجمہ ڈاکٹر فہیم الدین احمد نے کیا تھا ڈاکٹر سلمیٰ احمد فاروقی، اعزازی ڈائرکٹر، مرکز نے اپنے پاور پوائنٹ پریزنٹیشن میں دنیا بھر کے ممالک میں موجود دکنی پینٹنگس میں سے چند کو پیش کرتے ہوئے ان کے تاریخی پس منظر کا احاطہ کیا۔ پروفیسر محمد میاں نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ ہمیں دوسری ثقافتوں کو سمجھنے کی ضرورت ہے تاکہ رواداری فروغ پائے۔

روزنامہ 'منصف' حیدرآباد، 28 نومبر 2012

اتر پردیش:

بچے کی پہلی درسگاہ 'ماں' کا اردو داں ہونا لازمی

بریلی: پروفیسر وسیم بریلوی نے آج نمائندہ انقلاب سے گفتگو کے ذریعے بتایا کہ اردو وراثت کارواں ایک بڑے پیمانے پر منعقد کیا گیا ہے، جس کا افتتاح دہلی میں

ہوا اور اس کے بعد یہ سیمینار ممبئی میں منعقد کیے جانے کے بعد 29 نومبر کو لکھنؤ میں کیا گیا۔ انھوں نے مرکزی سرکار اور صوبائی سرکار کے اس قدم کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ سرکار نے اقلیتوں کے لیے سیکڑوں اسکیمیں اپنی جانب سے نافذ کی ہیں، لیکن اس کے لیے اقلیتوں کی بیداری بھی ضروری ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ پہلے اپنے گھروں سے ہم اس کا آغاز کریں، جہاں آج اردو دم توڑتی نظر آرہی ہے۔ انھوں نے یہ بات کہی کہ اردو محبت سے عام ہوسکتی ہے سیاست سے نہیں۔ وزیراعلیٰ کے اس بیان کی بھی ستائش کی جس میں انھوں نے کہا کہ سرکاری سطح پر طلبہ کو ایسے لیپ ٹاپ دیے جائیں گے، جس میں ہندی انگریزی کے علاوہ اردو سافٹ ویئر بھی موجود ہوں، جن سے طلبہ گنگا جمنی تہذیب کی اس زبان کو سیکھ سکیں اور مستقبل میں اسے روزگار کا ذریعہ بنا سکیں۔ انھوں نے اردو کے فروغ پر زور دیتے ہوئے کہا کہ ہم ایک صحت مند معاشرے کی امید تبھی کرسکتے ہیں جب ہمارے آپسی اختلافات ختم ہوں اور محبت قائم ہو اور اردو زبان نے ہمیشہ لوگوں کو جوڑنے کا کام کیا ہے فاصلوں کا نہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 دسمبر 2012

اتراکھنڈ میں اردو اکادمی کا قیام

سہارنپور: نئے سال کے آغاز میں اتراکھنڈ میں اردو اکادمی کی تشکیل کردی جائے گی۔ اردو اکادمی کا صدر دفتر دہرادون میں رہے گا اور مجوزہ اردو اکادمی کو ریاستی انتظامیہ کے محکمہ ثقافت کے ماتحت رکھا جائے گا۔ یہ اعلان اتراکھنڈ کے وزیراعلیٰ وجے بہوگنا نے اپنی سرکاری رہائش گاہ پر اس وقت کیا جب انھیں اردو اکادمی کے قیام کے تعلق سے سفارشات دینے کے لیے دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر اخترالواسع کی صدارت میں تشکیل کردہ کمیٹی کی جانب سے اخترالواسع رپورٹ پیش کی گئی۔ وزیراعلیٰ وجے بہوگنا نے سفارشات پیش کرنے پر مبارکباد دی۔ اور کہا کہ اردو زبان نے تحریک آزادی میں عام ہندوستانیوں کی امنگوں اور آرزوؤں کی ترجمانی کرتے ہوئے انقلاب زندہ باد کا نعرہ اور سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا جیسا ترانہ دیا، اتراکھنڈ میں اردو اکادمی کا قیام ہماری مشترکہ تہذیب کے تانے بانے کو مضبوط کرنے میں نہ صرف معاون ہوگا بلکہ ریاست میں اردو کے حوالے سے تعلیم ترجمہ اور ثقافتی سرگرمیوں کے فروغ میں اہم رول ادا کرے گا۔ وزیراعلیٰ نے پروفیسر اخترالواسع سے کہا کہ وہ مستقبل میں بھی اپنا تعاون اردو اکادمی اتراکھنڈ کو دیتے رہیں گے۔ رپورٹ پیش کرنے کے بعد پروفیسر اخترالواسع نے کمیٹی کے اراکین کی جانب سے وزیراعلیٰ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے اردو زبان کو فروغ دینے کے بارے میں خیال کیا اور اتراکھنڈ میں اردو اکادمی کے قیام کے تعلق سے سفارشات دینے کے میری صدارت میں 9 رکنی کمیٹی تشکیل دی، تاریخ خود کو دہراتی ہے۔ 1972 میں ہندوستان اترپردیش میں پہلی اردو اکادمی کا قیام عمل میں آیا تو صوبہ کے وزیراعلیٰ ہیم وتی نندن بہوگنا تھے اور صوبہ کے گورنر اکبر علی تھے۔ آج 2012 میں اتراکھنڈ میں اردو اکادمی کی سفارشات منظور کرنے والے ہیم وتی نندن بہوگنا کے صاحبزادے وجے بہوگنا وزیراعلیٰ ہیں اور یہاں گورنر کے عہدے پر عزیز قریشی جلوہ افروز ہیں۔ انھوں نے کہا کہ زبانوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا لیکن ہر مذہب کو زبان کی ضرورت ہوتی ہے۔ پروفیسر اخترالواسع نے اس موقعے پر سفارشات کے لیے بنائی گئی کمیٹی کو اپنا تعاون دینے والے حکومت اتراکھنڈ کے دہلی میں چیف ریزیڈنٹ کمشنر سنیل کمار متو وزیراعلیٰ کے افسر برائے امور خاص شنکردت شرما، دہرادون میں حکومت کے اقلیتوں سے متعلق محکمہ کے سکریٹری ایم ایچ خاں اور تمام کارکنوں کا شکریہ ادا کیا۔

دریں اثنا اخترالواسع سفارشات میں مجوزہ اردو اکادمی کو سوسائٹی رجسٹریشن ایکٹ 1860 کے تحت اتراکنڈ میں رجسٹر کرانے وزیراعلیٰ اتراکھنڈ کو مجلس عام اور مجلس عاملہ کا صدر اتراکھنڈ کے اردو دوستوں، دانشوروں، ادیبوں، شاعروں اور اسکالروں میں زیادہ سے زیادہ 15 اور قومی سطح کے مشہور اردو دانوں میں زیادہ سے زیادہ پانچ رکن دیگر ریاستوں سے منتخب کرنے، اکادمی کے لیے یک مشت رقم کا کارپس قائم کرنے (تقریباً 20 کروڑ) کی سفارش کی ہے۔ پروفیسر اخترالواسع نے اردو زبان کے فروغ کے لیے ارو میں تصنیف و تالیف کی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی، مشاعروں کے انعقاد اردو میں ڈرامے، اسٹیج کرنے، اردو میں مذاکروں کا انعقاد، اردو مسودوں کی ذخیرہ کاری، اردو ادب کے کتب خانوں کا قیام، اردو کی تدریس کی حوصلہ افزائی، اردو کے تدریسی نصابوں کے تعین سے متعلق مشورے، اردو اساتذہ کی تربیت، اردو استعمال کرنے کے لیے انعامات و اعزازات اردو زبان کے ملکی و بین الاقوامی اداروں سے رابطہ قائم کرنا اور عوام کو اردو سیکھنے کی سہولتیں فراہم کرنے والے اہم مشورے اپنی تفصیلی رپورٹ میں دیے ہیں۔ خیال رہے کہ وزیراعلیٰ کی جانب سے اردو اکادمی کی سفارشات کے لیے پروفیسر اخترالواسع کی چیئرمین شپ میں جو کمیٹی بنائی گئی تھی اس میں ممبر اسمبلی فرقان احمد، ثروت کریم، ڈاکٹر ایس فاروق، وحید اللہ خاں، رضیہ بیگم وغیرہ کو رکن اور آئی اے ایس سنیل کمار متو کو کنوینر بنایا گیا تھا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 نومبر 2012

دارالعلوم دیوبند کی ادبی خدمات

دیوبند: دارالعلوم دیوبند میں انجمن تہذیب الافکار کے زیراہتمام ایک عظیم الشان ادبی و بیت بازی نشست کا انعقاد کیا گیا جس میں انجمن سے منسلک طلبہ مدھوبنی، دربھنگہ و سمستی پور نے اپنی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ جلسے کی صدارت مولانا افضل حسین کیموری نے کی جب کہ نظامت کے فرائض توصیف انور نے انجام دیے۔ اس بزم کی افتتاحی تقریب میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے مشہور ادیب و اسلامی اسکالر مولانا وارث مظہری قاسمی نے بطور خاص شرکت کی۔ اس موقعے پر بزم کے طلبہ نے دلچسپ تقاریر کے علاوہ ایک خوبصورت مقابلہ بیت بازی بھی پیش کیا جس میں 'بزم بہادر شاہ ظفر' اور 'بزم میر تقی میر' کے باذوق طلبہ کے مابین دلآویز مقابلہ آرائی ہوئی جس میں بزم ظفر نے فتح حاصل کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 نومبر 2012

جوش ایک ہمہ جہت شاعر

لکھنؤ: مسرور ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیراہتمام، سینٹ روز پبلک اسکول گڑھی پیر خان میں حسب سابق بیسویں صدی کے منفرد لب و لہجے کے شاعر جوش ملیح آبادی کو ان کے یوم پیدائش پر یاد کیا گیا۔ 'جوش ایک ہمہ جہت شاعر' کے عنوان سے ہونے والے پروگرام کے صدر اسکول کے بانی منیجر ڈاکٹر منصور حسن خاں تھے، مہمان خصوصی مرزا ماجد بیگ، مہمان اعزازی حامد خان تلہری تھے۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی مرزا ماجد بیگ نے کہا جوش کی ہمہ جہت شخصیت کو سمجھنے کے لیے ان کی علمی و ادبی خدمات کے علاوہ آزادی ہند میں ان کے کردار کو بھی نظر میں رکھنا چاہیے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 7 دسمبر 2012

راجستھان:

تعلیمی بیداری کنونشن

کوٹہ: مسلم معاشرہ جو تعلیم سے پچھڑا ہوا ہے اس کی بنیادی وجہ سرکاری اسکیم سے دوسری، تعلیم یافتہ طبقے، اساتذہ، اور وم کے رہنماؤں کی غفلت ہے۔ یہ بات مفتی اختر حسین اردو کالج و گیان نگر کوٹہ راجستھان میں منعقد ہونے والے کل ہند تعلیمی، بیداری کنونشن میں مفتی محمد شمیم اشرف نے 11 نومبر 2012 کو مولانا

ابوالکلام آزاد کے 125 ویں یوم پیدائش پر کہی۔ راجستھان ڈیولپمنٹ مدرسہ بورڈل کمیٹی کے چیئرمین ڈاکٹر اکرام خان اردو میڈیم فاصلاتی تعلیم کو راجستھان میں عام کرنے پر زور دیتے ہوئے کہا کہ آج جس عصری علوم کی ضرورت ہے جب تک اس علوم سے مسلم سماج مزین نہیں ہوتا اس کی ترقی ناممکن ہے۔

بذریعہ ڈاک، زعیم اشرف صدیقی، راجستھان، 10 نومبر 2012

کرناٹک:

محفلِ افسانہ

گلبرگہ: انجمن ترقی اُردو گلبرگہ اور کرناٹک اُردو اکادمی بنگلور کے زیراہتمام محفل افسانہ کا کامیاب انعقاد جناب سید محمد اشرف کی صدارت میں عمل میں آیا۔ انھوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ محفل افسانہ میں پیش کردہ افسانے عمدہ اور سماج کی نقش نگاری کرتے ہیں۔ افسانوں کا مختصر تجزیہ بھی پیش کیا۔ محفل افسانہ میں جناب سید محمد اشرف، جناب سلام بن رزاق، پروفیسر حمید سہروردی، جناب امجد جاوید، ڈاکٹر وحید انجم، ڈاکٹر کوثر پردین، پروفیسر رؤف خوشتر، جناب منظور وقار، جناب مسعود علی تماپوری اور آنسہ افشاں ترنم نے افسانے پیش کیے۔ محفل افسانہ میں جناب وقار شیخ نے بحیثیت مہمانِ خصوصی شرکت کی۔ محفل افسانہ کی نظامت ڈاکٹر انیس صدیقی نے بحسن وخوبی انجام دی۔ جناب واجد اختر صدیقی نے شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز، شیخ شہباز احمد، گلبرگہ، 3 دسمبر 2012

اردو صحافت اور حالات حاضرہ

ہبلی: گروپ ہیڈ سہارا اردو پبلی کیشنز و عالمی سہارا سید فیصل علی نے چیمبر آف کامرس ہبلی میں مڈمیک فاؤنڈیشن کے زیراہتمام منعقدہ اجلاس میں 'اردو

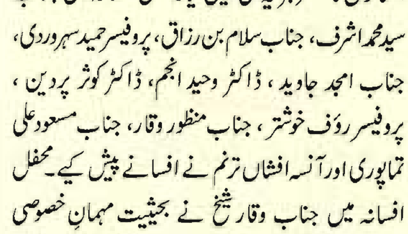

صحافت اور حالات حاضر' کے موضوع پر اپنے خطاب میں اردو کو ہندوستان کی مشترکہ تہذیب و ثقافت کی علامت قرار دیا اور اس ضمن میں سہارا انڈیا پریوار کے مینیجنگ ورکر وچیئرمین، عالی جناب سہارا شری سبرت رائے سہارا کا خصوصیت سے ذکر کرتے ہوئے انھیں

پروفیسر وارث علوی، فن اور شخصیت

گجرات: اردو ساہتیہ اکادمی کے زیراہتمام ایک آل انڈیا سمینار بعنوان پروفیسر وارث علوی، فن اور شخصیت بتاریخ 4,5 نومبر 2012 بمقام گجراتی ساہتیہ پریشد ہال، آشرم روڈ، احمد آباد، زیرصدارت جناب سید واجد حسین منعقد ہوا۔ بحیثیت مہمان خصوصی ڈاکٹر دھیرو بھائی پریکھ (سابق ڈائریکٹر، بھاشا بھون، گجرات یونی ورسٹی) نے شرکت فرمائی۔ اکادمی کے رجسٹرار شری ہرشد تریویدی نے استقبالیہ خطبہ پیش کیا۔ پروفیسر محی بمبئ والا نے تمہیدی کلمات پیش

کیے۔ شری چینو مودی، محترمہ ترنم ریاض اور ڈاکٹر دھیرو بھائی پریکھ نے علوی صاحب کی شخصیت اور فن سے متعلق اپنے خیالات اور تاثرات کا اظہار کیا۔ آخر میں پروفیسر وارث علوی نے خطاب فرمایا۔ انھوں نے اب تک کی اپنی مجموعی تحصیلات نیز تنقیدی ادب کے منظرنامہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ ظہرانے کے بعد سیمینار کے بقیہ اجلاس جمنا لال بجاج ہال، گجرات ودیاپیٹھ میں منعقد ہوئے۔ دوسرا سیشن ڈاکٹر الیاس شوقی کی صدارت میں منعقد ہوا، جس میں ڈاکٹر انور ظہیر نے (وارث علوی کے تنقیدی ابعاد)، ڈاکٹر ثروت خان نے (رنگ کچھ تیری الاپوں میں نیا پاتے ہیں ہم) اور ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے (وارث علوی کی منٹو شناسی) کے موضوعات پر اپنے مقالات پیش کیے۔ دوسرے دن 5 نومبر صبح 10.30 بجے تیسرا اجلاس سلیم شہزاد کی صدارت میں منعقد ہوا۔ سیمینار کا اختتام دوسرے دن 4.00 بجے ہندی کے مشہور و معروف ادیب شری رگھویر چودھری کی صدارت میں ہوا۔ ودیاپیٹھ کے وائس چانسلر سدرشن آینگر نے بطور مہمان خصوصی شرکت فرمائی، اور انھوں نے وارث علوی کی شخصیت اور فن اور ان کی تنقیدی خدمات کے تعلق سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اکادمی کے رجسٹرار شری ہرشد تریویدی نے بھی موصوف کی شخصیت اور فن پر اظہار خیال کیا۔

بذریعہ ڈاک، وفا جونپوری، احمد آباد، 20 نومبر 2012

محسن اردو قرار دیا۔ اجلاس کے اعزازی مہمان ڈاکٹر عبدالکریم نے دورانِ خطاب کہا کہ مجھے اپنی مادری زبان اردو ہونے پر فخر ہے۔ آل انڈیا اردو منچ کے صدر خلیل مامون نے اردو صحافت پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ادارہ جاتی سطح پر صحافیوں کی تربیت ان کے مسائل اور تحفظ کا خیال رکھا جائے۔ اجلاس کی صدارت فاؤنڈیشن کے چیئرمین اسمٰعیل شمسی نے کی جب کہ ڈائس پر فاؤنڈیشن کے ٹرسٹیز تبریز شمسی اور عرفان شمسی بھی اعزازی مہمان ڈاکٹر ایس اے قاضی (سابق وائس چانسلر کرناٹک اسٹیٹ ومنس یونیورسٹی) کے ساتھ موجود رہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 28 نومبر 2012

مہاراشٹر:

یومِ اطفال

بیاول: ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر اکادمی کے زیراہتمام 14 نومبر 2012 بروز بدھ یومِ اطفال کے موقعے پر ادارے کے نائب صدر بلال شیخ کی صدارت میں بچوں کے لیے ایک تقریب برائے ادب اطفال کا انعقاد عمل میں آیا جس میں مولانا آزاد لائبریری کے صدر آر ایم شیخ، ادریس خان، سعید خان سر محمد اسمٰعیل، شیخ امام بحیثیت مہمانِ خصوصی حاضر تھے۔ اس موقعے پر اندرا گاندھی اردو گرلس ہائی اسکول اور ڈاکٹر ذاکر حسین اردو ہائی اسکول سے جماعت پانچویں تا آٹھویں کے 20 طلبا و طالبات نے اپنی پسند کی درسی و غیردرسی (اخبارات و رسائل) نظمیں اور کہانیاں بڑے دلچسپ انداز میں پیش کیں۔ اس مقابلے میں محمد ثاقب خان، غلام غوث خان، جماعت ششم، ڈاکٹر ذاکر حسین ہائی اسکول اوّل، عظمیٰ کوثر، فیروز خان، جماعت ہشتم، اندرا گاندھی ہائی اسکول نے دوم اور اس طرح نعیم خان حبیب خان ہشتم، ڈاکٹر ذاکر حسین اردو ہائی اسکول نے سوم پوزیشن حاصل کی۔

پریس ریلیز، سلیم خان، اردو سوشل ایجوکیشنل ویلفیئر اکادمی، بیاول، 16 نومبر 2012

اعزاز و اکرام:

شمس الرحمٰن فاروقی

الہ آباد: اردو کے عظیم نقاد، شاعر و ناول نگار شمس الرحمٰن فاروقی کو اُن کی مجموعی خدمات پر گزشتہ دنوں کولکاتہ کے کلامندر ہال میں مغربی بنگال کا 'صوفی جمیل اختر' ایوارڈ

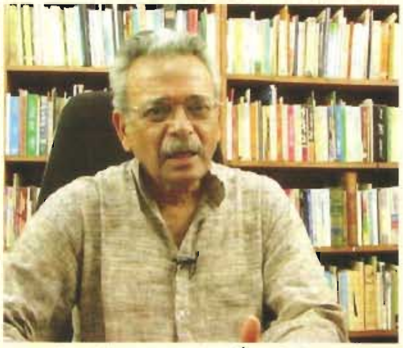

منوج کمار باجپئی (آئی پی ایس) نے پیش کیا جس میں مومنٹو 51 ہزار روپے اور ایک توصیفی سند شامل ہے۔ صوفی جمیل اختر فاؤنڈیشن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر شکیل اختر نے کہا کہ شمس الرحمٰن فاروقی کو یہ ایوارڈ دے کر ادارہ فخر محسوس کر رہا ہے۔ اس موقعے پر معروف افسانہ نگار رئیس رفیع، صدیق عالم، شبیر احمد، ڈرامہ نگار ظہیر انور اور نئی نسل کے ناقد معید رشیدی (دہلی) نے شمس الرحمٰن فاروقی کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا سب سے بڑا ادبی کارنامہ میر تقی میر پر تنقیدی کتاب 'شعر شور انگیز' ہے' جو چار جلدوں پر مشتمل ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' 7 نومبر 2012

وسیم بریلوی

بریلی: امن کمیٹی کے زیر اہتمام موتی لال قلعہ رامپور روڈ پر ایک شام وسیم بریلوی کے نام کا انعقاد کیا گیا، جس کا آغاز کرتے ہوئے بریلی کے میئر ڈاکٹر آئی ایس تومر نے

کہا کہ شہر میں امن قائم کرنے کے لیے سماج کے ذمے داران کو آگے آنا ہوگا۔ اس کے لیے ہمیں ایک دوسرے کے شانہ بشانہ کھڑے ہو کر چلنا ہوگا۔ پروگرام کے مہمان خصوصی کمشنر کے رام موہن راؤ نے کہا کہ گزشتہ تین ماہ میں شہر جن دشواریوں سے دوچار ہوا، جن حالات سے گزرا وہ شرمناک ہے۔ سٹی مجسٹریٹ شیل دھر یادو نے امن کی بقا کے لیے آپسی بھائی چارے کی بات کہتے ہوئے کہا کہ ہمیں فرقہ پرست طاقتوں کا منہ توڑ جواب دینا ہوگا۔ پروفیسر وسیم بریلوی نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ملک کی دو آنکھیں بتایا۔ اس کے بعد ڈاکٹر وسیم بریلوی کو اعزاز سے نوازا گیا اور وسیم بریلوی نے اپنے کلام کے ذریعے پیغام دیا کہ ''وے آئینے لیے روشن کیے تھے، اجالا دوسروں کا ہو گیا ہے'' جیسے اشعار سنا کر سامعین کے دلوں کو نئی تازگی بخشی۔ ان کے علاوہ اسرار نسیم، نعیم شباب کا سنگھوی، عقیل نعمانی، باقر زیدی وغیرہ نے بھی اپنے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ پروگرام میں اس موقعے پر آئی جی مکل گوئل، ڈی آئی جی ایل وی، ضلع مجسٹریٹ ابھیشیک پرکاش، ایس ایس پی ستیندر ویر سنگھ کے علاوہ کمیٹی کے ڈاکٹر عبدالقدیر احمد، تعظیم شمسی، حاجی اویس، عتیق حسین، اقبال سعی، ناصر قریشی، ہریش وگ، رضوان محمد قاسم، امرجیت سنگھ، مہندر اگروال، کے آر بیگ نے شرکت کی۔ پروگرام 'ایک شام وسیم بریلوی کے نام' موضوع پر مبنی تھا۔ لہٰذا وسیم بریلوی کے کلام کا لطف لینے کے لیے اس پروگرام میں شہر کی معزز شخصیات نے حصہ لیا۔ کمشنر کے رام موہن راؤ، میئر ڈاکٹر آئی ایس تومر، ڈی آئی جی ایل وی اینٹونی دیوکمار، سٹی مجسٹریٹ شیل دھر سنگھ یادو کے علاوہ دیگر ہستیاں بھی موجود رہیں۔ پروگرام کی صدارت سرفراز ولی خاں نے اور نظامت شبو میاں نظامی نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 نومبر 2012

گوپی چند نارنگ کو استقبالیہ

نئی دہلی: پروفیسر گوپی چند نارنگ کو حکومت پاکستان کی طرف سے ستارۂ امتیاز کے اعزاز سے سرفراز کیے جانے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ان کے پروفیسر ایمیریٹس مقرر ہونے پر عالمی اردو ٹرسٹ کے زیر اہتمام گزشتہ دنوں انڈیا انٹرنیشنل سینٹر انیکسی میں ایک شاندار استقبالیہ جلسے کا انعقاد کیا گیا جس میں ملک و بیرون ملک کی مقتدر ادبی شخصیات نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ اس موقعے پر پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ ستارۂ امتیاز اور پروفیسر ایمیریٹس کے اعزازات میرے لیے بے حد اہمیت کے حامل ہیں۔ انھوں نے اپنی جذباتی تقریر میں کہا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میرے علمی و ادبی وجود کا حصہ ہے۔ اسی طرح پاکستان میری پیدائش کی سرزمین ہے۔ اس غیر معمولی اعزاز کے لیے میں حکومت پاکستان اور پاکستانی عوام کا ممنون ہوں۔ جلسے کے مہمان خصوصی ہندوستان میں پاکستان کے ہائی کمشنر عزت مآب سلمان بشیر نے ہندوستان میں منٹو صدی تقاریب کے عظیم الشان آغاز کے لیے عالمی اردو ٹرسٹ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اس طرح کے پروگراموں سے دونوں ملکوں کے تعلقات بہتر سے بہتر ہوتے جائیں گے۔ حکومت پاکستان نے پروفیسر گوپی چند نارنگ کو اعزاز دے کر دراصل اردو زبان و ادب کے وقار میں اضافہ کیا ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 16 نومبر 2012

حامدی کاشمیری

جموں: ماہنامہ 'تریاق' ممبئی کے جموں و کشمیر نمبر (شمارہ نومبر 2012) کی رسم اجرا 7 نومبر کو پریس کلب جموں میں منعقد ہوئی جس کی صدارت جموں و کشمیر اکادمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز کی ایڈیشنل سکریٹری سویتا بخشی نے کی۔ پروفیسر قدوس جاوید مہمان ذی وقار اور پروفیسر حامدی کاشمیری مہمان خصوصی تھے۔ 'تریاق' کے اس خصوصی شمارے کی رسم اجرا کے بعد ضمیر کاظمی جو اردو فاؤنڈیشن ممبئی کے چیئرمین بھی ہیں کے ہاتھوں حامدی کاشمیری کو ان کی ادبی خدمات کے سلسلے میں، آنند لہر کو

ایک افسانہ نگار کے طور پر اور عرش صہبائی کو عالم اردو کے مشہور و معروف اور معتبر شاعر کی تاحیات علمی، ادبی اور شعری خدمات کے اعتراف میں اعزاز سے نوازا گیا۔

پریس ریلیز، خورشید کاظمی، جموں، 11 نومبر 2012

گیان پیٹھ کا پہلا اردو 'مورتی دیوی ایوارڈ' گوپی چند نارنگ کو

نئی دہلی: حالات نے اردو کو ایسے موڑ پر لے جا کر کھڑا کر دیا کہ بعض لوگ اس زبان کو دوسری نظر سے دیکھنے لگے، جس کی وجہ سے نہ صرف اردو اور اردو والوں کا

نقصان ہوا بلکہ اس سے ملک کا بھی نقصان ہوا۔ پروفیسر گوپی چند کی اس بات کے لیے ستائش کی جانی چاہیے کہ انھوں نے اردو کو ایک بار پھر زندہ کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ ان احساسات و خیالات کا اظہار نائب صدر جمہوریہ محمد حامد انصاری نے ساہتیہ اکادمی میں بھارتیہ گیان پیٹھ کی جانب سے اردو کے نقاد و ادیب پروفیسر گوپی چند نارنگ کو 24واں مورتی دیوی ایوارڈ پیش کرنے کے بعد اپنے خطاب میں کیا۔ ایوارڈ کی شکل میں انھیں ایک توصیفی سند، مومنٹو شال اور 4 لاکھ روپے کا چیک پیش کیا گیا۔ یہ ایوارڈ انھیں ان کی کتاب 'اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب' کے لیے دیا گیا ہے۔ اس پروقار تقریب کی نظامت نوجوان شاعر معین شاداب نے کی۔ پروگرام کا آغاز قومی ترانہ اور سرسوتی وندنا سے ہوا۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ یہ ایوارڈ میرا نہیں بلکہ اردو زبان کا ہے۔ گیان پیٹھ نے اس کے لیے مجھے منتخب کیا، یہ میرے لیے فخر کی بات ہے۔ انھوں نے بتایا کہ یہ کتاب ان کی تقریباً 20 برس تک محنت کا نتیجہ تھی جو تقریباً دس سال قبل شائع ہوئی تھی۔ انھوں نے کہا کہ آج غزل کا دائرہ وسیع ہوا ہے اور وہ ہندی اور پنجابی کے بعد اب گجراتی، بنگالی اور سنسکرت میں پہنچ گئی ہے۔ سابق گورنر اور گیان پیٹھ کی ایوارڈ انتخاب کمیٹی کے چیئرمین ٹی این چترویدی نے کہا کہ یہ ایوارڈ اتفاق رائے سے گوپی چند نارنگ کو دیا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ کسی اردو والے کو ملنے والا یہ پہلا مورتی دیوی ایوارڈ ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 17 نومبر 2012

علی انجم رضوی

جلگاؤں: مشہور صحافی علی انجم رضوی کی طویل صحافتی خدمات کو مدنظر رکھتے ہوئے مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی نے انھیں 2010 کے لیے خصوصی ایوارڈ سے نوازا۔ گزشتہ دنوں یشونت راؤ چوہان پرتیشٹھان میں منعقدہ ایک باوقار تقریب میں یہ اعزاز موصوف کو تفویض کیا گیا۔ دس ہزار روپے اور توصیفی سند پر مشتمل یہ ایوارڈ انھیں کابینی وزیر برائے اقلیتی ترقیات عالی جناب عارف نسیم خان کے ہاتھوں دیا گیا۔ اس پروگرام میں مہاراشٹر کے وزیر اعلیٰ عالی جناب پرتھوی راج چوہان بھی موجود تھے۔

پریس ریلیز، علی انجم رضوی، جلگاؤں، نومبر 2012

طرب ضیائی

رامپور: بزرگ شاعر حکیم شبیر علی خاں طرب ضیائی کو ان کی ادبی خدمات کے لیے اعزاز سے نوازا گیا۔ راشٹریہ سنکیت مورچہ کے صدر فیصل ممتاز اور میونسپل وارڈ نمبر 28 کے ممبر اور راشٹریہ سنکیت یوا پریشد کے ضلع صدر ضیاء الرحمٰن بابو نے طرب ضیائی کو دوشالہ پیش کیا۔ گزشتہ روز عالمی یوم اردو کے موقعے پر اردو ٹیچرس ویلفیئر ایسوسی ایشن کی جانب سے آفریدی کی صدارت میں مشاعرہ ہوا۔

روزنامہ 'خبر جدید' دہلی، 23 نومبر 2012

راشدہ خلیل

علی گڑھ: رسالہ بزم ادب کی مدیرہ محترمہ راشدہ خلیل کو اردو زبان میں ان کی قابل ذکر خدمات پر لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ اولڈ گرلس ایسوسی ایشن کی صدر پروفیسر ساجدہ نبی نے محترمہ راشدہ خلیل کی شخصیت اور خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ وہ جس لگن، ایمانداری اور قربانی کے جذبے سے اردو زبان و ادب کو فروغ دے رہی ہیں یقینی طور پر قابل تعریف ہے۔ اس موقعے پر پروفیسر دردانہ جے راجپوری، پروفیسر نعیمہ گلریز، محترمہ صبیحہ خاں، محترمہ ماریہ خاں اور محترمہ کہکشاں کے علاوہ بڑی تعداد میں معزز خواتین موجود تھیں۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 7 نومبر 2012

حسن کمال

نئی دہلی: اردو بلٹز کے سابق ایڈیٹر، معروف صحافی حسن کمال کو پریس کونسل آف انڈیا نے اردو صحافت کے لیے ایوارڈ سے نوازا ہے۔ حسن کمال انقلاب سمیت ملک کے کئی اخباروں میں کالم لکھتے رہے ہیں۔ آج کل وہ روزنامہ راشٹریہ سہارا سے وابستہ ہیں، اس سے قبل وہ روزنامہ صحافت کے ممبئی ایڈیشن کے مدیر تھے۔ ان کو یہ انعام 16 نومبر کو نیشنل پریس ڈے کے موقعے پر وگیان بھون میں منعقد ہونے والی ایک تقریب میں دیا گیا۔ بھارت کے سابق چیف جسٹس ایم این وینکٹا چلیا اور معزز مہمان، مرکزی اطلاعات و نشریات کے وزیر منیش تیواری، اور بھارت میں جرمنی کے سفیر مسٹر مائیکل اسٹینر نے بھی شرکت کی۔ پریس کونسل آف انڈیا کے چیئرمین جسٹس کاٹجو کی کاوشوں سے پریس کونسل نے اردو صحافت میں بہترین کارکردگی کے لیے قومی ایوارڈ دینے کی نئی پہل کی ہے۔ یہ ایوارڈ ایک سرٹیفکیٹ اور 25000 روپے کے نقد انعام پر مشتمل ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 10 نومبر 2012

اشفاق حسین

نئی دہلی: انجمن ترقی اردو (ہند) کے زیر اہتمام اردو گھر میں 'شاعر سے ملیے' پروگرام کے تحت کناڈا سے آئے معروف شاعر ڈاکٹر اشفاق حسین کے اعزاز میں تقریب کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت معروف دانشور اور نقاد پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی اور نظامت وسیم راشد نے کی مہمان خصوصی کے طور پر عالمی اردو ٹرسٹ کے چیئرمین عبدالرحمٰن اور معزز مہمان کے طور پر بزرگ شاعر پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی نے شرکت کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر اشفاق حسین نے کناڈا میں اردو اور اردو والوں کے حالات پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری اطہر فاروقی نے کہا کہ انھوں نے کناڈا میں اردو کا چراغ روشن کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ڈاکٹر اسلم پرویز نے ڈاکٹر اشفاق حسین کو انجمن ترقی اردو (ہند) کی تاریخ سے واقف کرایا۔ عالمی اردو ٹرسٹ کے چیئرمین عبدالرحمٰن نے کہا کہ اشفاق حسین نے کناڈا میں اردو کی ترویج و ترقی میں جو رول ادا کیا وہ قابل ستائش ہے۔ آخر میں اپنے صدارتی خطبے میں ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اردو شاعری و ادب کے حوالے سے بات کرتے ہوئے اشفاق حسین کی خدمات کی ستائش کی۔ اس موقعے پر موجود دیگر اہم شخصیات میں قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو کے سابق وائس چیئرمین چندر بھان خیال، غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر شاہد ماہلی، معروف طنز و مزاح نگار نصرت ظہیر، جاوید رحمانی اور ثاقب صدیقی وغیرہ شامل تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 19 نومبر 2012

محمد ابراہیم شیخ

علی گڑھ: مانچسٹر میڈیکل سوسائٹی کے فیلو ڈاکٹر محمد ابراہیم شیخ کی آمد پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی انجمن اردوئے معلی کے زیر اہتمام استقبالیہ پروگرام کا انعقاد عمل میں آیا جس کی صدارت پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن نے اور نظامت ڈاکٹر مہتاب حیدر نقوی نے کی جب کہ شعبۂ اردو کے سربراہ پروفیسر محمد زاہد نے

مہمانِ خصوصی کا تعارف کرایا۔ ان کی شہرہ آفاق کتاب 1001 Inventions Muslim heritage in our world پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر ابراہیم کو اردو ادب سے بھی خصوصی دلچسپی ہے جس کا ثبوت منٹو، فیض اور اقبال پر ان کے وہ مقالات ہیں جو انھوں نے مختلف کانفرنسوں میں پیش کیے۔ مہمانِ خصوصی ڈاکٹر محمد ابراہیم شیخ نے مسلمانوں کی طبی و سائنسی خدمات کے موضوع پر نہایت مبسوط اور فکر انگیز گفتگو کی۔ اپنے صدارتی خطبے میں پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن نے مذکورہ موضوع پر مہمانِ خصوصی کی علمی دسترس اور وقت نظر کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ ایک بڑے حلقے میں آپ کے تحقیقی کام کی پذیرائی ہوتی رہی ہے۔ شعبۂ اردو کے استاد سید محمد ہاشم نے کہا کہ ڈاکٹر ابراہیم شیخ کی گفتگو میں اردو زبان و ادب کی ایسی چاشنی ہے کہ وہ بیک وقت اردو اور میڈیکل سائنس کے ماہر معلوم ہوتے ہیں۔

روزنامہ 'خبر جدید' دہلی، 23 نومبر 2012

اسلم جمشید پوری

میرٹھ: شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کو تعلیمی میدان میں ان کی خدمات کے لیے دہلی کے معروف مجیدیہ گروپ آف اسکولز نے مجیدیہ سلور جبلی ایوارڈ 2012 برائے فروغ تعلیم سے نوازا ہے۔ یہ ایوارڈ شاہ آڈیٹوریم، نزد کشمیری گیٹ بس اڈہ میں ایک پروگرام میں سابق چیف جسٹس ایم پی محترم فخرالدین اور دہلی کے ہردلعزیز ایم ایل اے اور دہلی وقف بورڈ کے چیئرمین جناب چودھری متین احمد نے دیا۔ ایوارڈ ایک شال، ایک سپاس نامہ، ایک ٹرافی اور 2100 روپے نقد پر مشتمل تھا۔ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری گزشتہ 20 برسوں سے تعلیم کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں۔

پریس ریلیز، اسلم جمشید پوری، میرٹھ 21 نومبر 2012

رسم اجرا:

فراتِ غم

لکھنؤ: عشرت لکھنوی ہمارے عہد کے ان مرثیہ نگاروں میں ہیں جنھوں نے روایت کی پاسداری کے ساتھ جدید شاعری سے اپنا رشتہ استوار رکھا ہے ان کے یہاں نہ مبالغہ ہے نہ تعلی، ان کے اشعار میں ان کا عجز و انکسار ہر جگہ نمایاں ہے عشرت کے مرثیے مختصر ہیں مگر ان کے مرثیوں میں لطف شعر و آل مرثیہ کا مکمل خیال رکھا گیا ہے۔ ان خیالات کا اظہار ممتاز ترقی پسند نقاد پروفیسر شارب ردولوی نے لکھنؤ کے معتبر و مستند مرثیہ نگار عشرت رضوی لکھنوی کے مراثی کے نئے مجموعے فرات غم کی تقریب رونمائی میں کیا جو ادارۂ فکر و نظر کی جانب سے میر زین العابدین کے امام باڑے، (ہردوئی روڈ) میں منعقد کی گئی تھی۔ کناڈا سے تشریف لائے اردو کے مشہور شاعر ماہر فیضیات اشفاق حسین نے فرات غم کے اجرا کی رسم انجام دیتے ہوئے کہا کہ عشرت کے مرثیوں میں آرٹ (ART) اور کرافٹ (CRAFT) کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ خواجہ معین الدین چشتی اردو عربی فارسی یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور مشہور شاعر انیس انصاری نے کہا کہ عشرت نے اپنے مرثیوں میں ہمارے عہد کی تلخ سچائیوں کو ایسے پرکشش انداز میں پیش کیا ہے کہ وہ ہمیں تلخ ہوتے ہوئے بھی تلخ نہیں لگتیں۔ اس موقع پر جرمنی سے تشریف لائے معروف شاعر عارف نقوی، کناڈا کے امام جمعہ مولانا سید رضا الحسینی، نوجوان نقاد ڈاکٹر مرزا حسین شفق، کانگریس کے رہنما و سابق ایم ایل سی سراج مہدی نے بھی اظہارِ خیال کیا۔

پریس ریلیز، جاوید برقی، کنوینر ادارۂ فکر و نظر پیر بخارہ چوک لکھنؤ، 15 نومبر 2012

جونپور کے چند شعرا

جونپور: شیرازِ ہند جونپور کے محمد حسن پی جی کالج میں شعبۂ اردو کے زیرِ اہتمام ادیب و افسانہ نویس ایس ایم عباس ایڈوکیٹ کی تصنیف و محمد عرفان جونپوری کے ذریعے مرتب کردہ کتاب جونپور کے چند شعرا (ماضی قریب اور حال کے آئینے میں) کا اجرا کیا گیا۔ اس موقع پر مہمانانِ خصوصی سابق ایڈوکیٹ جنرل اور چیئرمین اقلیتی کمیشن اتر پردیش جناب ایس ایم اے کاظمی اور الٰہ آباد ہائی کورٹ کے سینئر وکیل جناب ایم اے قدیر اور مہمانانِ اعزازی ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی اعزازی رفیق دارالمصنّفین شبلی اکادمی اعظم گڑھ و ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی ماہر تعلیم و مدیر ادبی گزٹ رہے۔ مہمانِ خصوصی محترم ایس ایم اے کاظمی نے فرمایا کہ زبان و ادب کی اہمیت اور افادیت کسی بھی طور سے کم نہ ہوگی اور جونپور کے چند شعرا ایک اہم کتاب ہے۔ جناب ایم اے قدیر ایڈوکیٹ نے کہا یہ ایک قیمتی دستاویز ہے جو جونپور کے شعری ماحول پر مستقبل میں تحقیق کے لیے لازمی تصور کی جائے گی۔ محترم ڈاکٹر الیاس اعظمی نے اپنے خطاب میں مذکورہ کتاب کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے مصنف و مرتب کو مبارکباد پیش کی۔

پریس ریلیز، عبدالقیوم شمس، ریڈر محمد حسن پی جی کالج، شیراز ہند، جونپور، 13 نومبر 2012

صحرا صحرا

سرینگر: کشمیر کے بزرگ فلسفی شاعر سیف الدین مسعودی سوپوری کے شعری مجموعہ 'صحرا صحرا' کی رسم اجرا کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر عبدالواحد نے اقبال لائبریری کے ابن خلدون آڈیٹوریم میں کیا اس موقعے سے پروفیسر بشیر احمد نحوی، پروفیسر محمد اسلم، ظریف احمد ظریف اور اسسٹنٹ ڈین اسٹوڈنٹس ویلفیئر مسٹر شوکت شفیع نے کتاب کے مصنف سیفی سوپوری کی موجودگی میں اُن کی علمی، ادبی، فلسفی اور ناقدانہ صلاحیتوں پر بھرپور تبصرہ کیا۔ پروفیسر عبدالواحد نے 'صحرا صحرا' پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ اس شعری مجموعے میں شاعر نے صحرا میں جستجو کرتے ہوئے حقیقی طور پر زندگی کو تلاش کیا ہے۔ رسم اجرائی کے اس موقعے پر کشمیر یونیورسٹی کے نئے رجسٹرار پروفیسر ظفر احمد قریشی بھی خصوصی طور پر موجود تھے۔

روزنامہ 'روشنی' سرینگر، 1 نومبر 2012

آزاد کے تاریخی خطاب کی آڈیو سی ڈی

ممبئی: قومی یومِ تعلیم 2012 کی مناسبت سے مالیگاؤں کے ارم اسکول میں یوم آزاد تقریبات کا انعقاد کیا گیا، اس پروگرام میں مولانا آزاد کے تاریخی خطاب (بمقام جامع مسجد دہلی 1948) کی آڈیو سی ڈی کا اجرا ہوا۔ اس تاریخی خطاب کو ارم پرائمری اسکول کی جماعت سوم و چہارم کے آٹھ ہونہار طلبہ نے اپنی آواز میں پیش کیا۔ اس تاریخی تقریر کو تحریری شکل میں بھی اسکول کے مجلّہ 'اوراق' میں من و عن شائع کیا گیا۔

پریس نوٹ، عبدالحلیم صدیقی، اردو ٹائمز ممبئی، 23 نومبر 2012

منٹو: شہر ہنروراں

مئوناتھ بھنجن: ڈاکٹر شکیل احمد کی کتاب 'منٹو: شہر ہنروراں' کے اجرا کی تقریب اسکالر پبلک اسکول مئو میں مولانا نورالعین سلفی کی صدارت اور ڈاکٹر امتیاز ندیم کی نظامت میں منعقد ہوئی۔ سالم انصاری (ایم پی) نے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے پروگرام کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اپنی پارچہ بافی کی رنگ برنگی کاریگری کے ساتھ ساتھ مئو کا بنکر تعلیم کے میدان میں بھی نمایاں کردار ادا کر رہا ہے۔ سالم انصاری نے کہا کہ اس کتاب سے مئو کی تاریخ کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ ڈاکٹر انیس ادیب نے کتاب کا اجرا فرماتے ہوئے

کہا کہ یہ ایک قرض تھا جو ڈاکٹر شکیل احمد نے ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' گورکھپور، 17 نومبر 2012

ساحل بولتا ہے

دربھنگہ: اردو شاعری کو نہ صرف مقبولیت بخشنے میں بلکہ اس کی شناخت کو مستحکم بنانے میں غزل کا کلیدی کردار ہے۔ یہ باتیں ڈاکٹر مشتاق احمد، پرنسپل ملت کالج، دربھنگہ نے مقامی اینجل ہائی اسکول میں اردو کے استاد شاعر رفیق انجم نے شعری مجموعہ 'ساحل بولتا ہے' کی رسم اجرا کے بعد صدارتی خطبہ دیتے ہوئے کہیں۔ انھوں نے کہا ہمارے تین سو سالہ شعری سفر میں ہم تین درجن غزل کے شاعر کو پیدا نہیں کرسکے ہیں۔ میر، غالب آتش، شاد عظیم آبادی، اقبال، فراق، جگر، ناصر کاظمی، فیض اور احمد فراز کے عہد شاعری میں کتنے ایسے شعرا ہیں جو نمایاں ہوسکے۔

پریس ریلیز، ڈاکٹر مشتاق احمد، دربھنگہ، 6 دسمبر 2012

وفیات:

اندر کمار گجرال

نئی دهلی: سابق وزیر اعظم اندر کمار گجرال کا 30 نومبر کو انتقال ہوگیا۔ وہ 93 برس کے تھے۔ انھیں سینے میں انفیکشن کی شکایت پر گڑگاؤں کے میدانتا میڈی سٹی

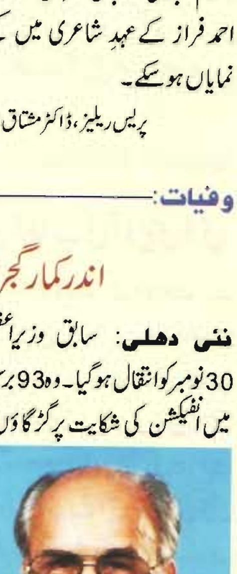

اسپتال میں داخل کرایا گیا تھا۔ سابق وزیر اعظم کے کنبے کے لوگوں نے بتایا کہ مسٹر گجرال نے تین بج کر 25 منٹ پر آخری سانس لی۔ پھیپھڑے میں انفیکشن ہونے پر مسٹر گجرال کو 19 نومبر کو گڑگاؤں کے میدانتا میدی سٹی اسپتال میں داخل کرایا گیا تھا۔ انتقال کے وقت مسٹر گجرال کے کنبے کے بھی ارکان ان کے قریب موجود تھے۔ ان کی اہلیہ شیلا گجرال کا پچھلے سال انتقال ہوا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 1 دسمبر 2012

دیویندر اسر

نئی دهلی: ممتاز و نامور نقاد، دانشور اور افسانہ نگار

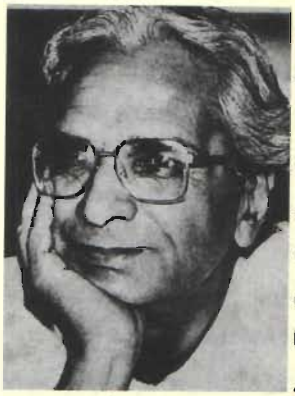

دیویندر اِسر کا طویل علالت کے بعد 6 نومبر کو نئی دہلی میں انتقال ہوگیا۔ اُن کے انتقال سے ایک ایسا خلا پیدا ہوا ہے جسے کبھی پُر نہیں کیا جاسکے گا۔ دیویندر اِسر تقسیم ملک کے بعد اُبھرنے والے ایک اہم ترقی پسند نقاد اور افسانہ نگار تھے جو اردو ادب میں جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے پیشرو تھے۔ اس سے متعلق ان کی کتابوں 'مستقبل کے روبرو' (1986) 'ادب کی آبرو' (1996) اور 'نئی صدی اور ادب' (2000) نے اُردو ادب پر اپنی گہری چھاپ چھوڑی ہے۔ دیویندر اسر کی ولادت 14 اگست 1928 کو پنجہ صاحب (حسن ابدال) ضلع کیمبلپور (پاکستان) میں ہوئی۔ اُن کے والد شری ناتھ اسر کیمبلپور (حال اٹک) کے ایک معروف وکیل تھے۔ انھوں نے 1947 میں بی اے کا امتحان گورنمنٹ کالج کیمبلپور (پاکستان) سے پاس کیا اور 1949 میں ایم اے معاشیات کی ڈگری الہ آباد یونیورسٹی سے حاصل کی۔ بعد ازاں 1953 میں انہوں نے بی ایڈ دہلی یونیورسٹی سے اور کمیونی کیشن آرٹس کی سند 1974 میں، کارنیل یونیورسٹی، امریکہ سے حاصل کی۔ دیویندر اسر کی ادبی زندگی کی ابتدا گورنمنٹ کالج کیمبلپور میں انٹر کی تعلیم کے دوران ہوئی جب کالج کے میگزین 'مشعل' میں اُن کے کئی مضامین شائع ہوئے جن میں منٹو ایک ادبی جراح، کچھ ٹیگور کے بارے میں، انسانی زندگی کا معمار اعظم، ٹیپو سلطان اور تبصرے وغیرہ شامل ہیں۔ دیویندر اسر کی اُردو، ہندی، پنجابی اور انگریزی میں پچاس سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اُردو میں چار افسانوی مجموعے 'گیت اور انگارے' (1952) 'شیشوں کا مسیحا' (1955) 'کینوس کا صحرا' (1983) 'پرندے اب کیوں نہیں اُڑتے' (1922) ایک ناولٹ 'خوشبو بن کے لوٹیں گے' (1988) اور آٹھ تنقیدی کتابیں 'فکر اور ادب'، 'ادب اور نفسیات'، 'ادب اور جدید ذہن'، وغیرہ منظر عام پر آچکی ہیں۔ اُن کی وفات سے بلاشبہ اُردو ادب ایک غیر معمولی ذہین نقاد، جدید افسانہ نگار اور دانشور سے محروم ہوگیا ہے۔

پریس ریلیز، نند کشور وکرم، دہلی، 21 نومبر 2012

ہلال سیوہاروی

نجیب آباد:

غریبوں کا لہو تو آپ کی کاروں کا ڈیزل ہے
غریبی مٹ گئی تو آپ کیا رکشا چلائیں گے

اس شعر کے خالق بین الاقوامی شہرت یافتہ مزاحیہ شاعر ہلال سیوہاروی 15 نومبر کو 2012 کو مالک حقیقی سے جاملے۔ بعد نماز جمعہ ان کو سپرد خاک کیا گیا۔ وہ 84 برس کے تھے۔ ہلال سیوہاروی کو 88-1987 میں اردو اکادمی دہلی نے غالب ایوارڈ سے سرفراز کیا تھا۔ یہ ایوارڈ آنجہانی نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے انھیں پیش کیا تھا۔ انھوں نے

1955 میں اپنی شاعری کا آغاز کیا۔ 1969 میں انگلینڈ کے ایک مشاعرے میں شرکت کی جہاں انھیں مقبولیت ملی۔ ان کی نظموں میں جوتا، کتوں کی کانفرنس اور گدھے کا بیان، کرکٹ وغیرہ شامل ہیں۔ ہلال سیوہاروی نے سیاسی لیڈران پر بھی خوب طنز کیے ہیں۔ ہلال سیوہاروی جتنے اچھے شاعر تھے، ان سے کہیں زیادہ اچھے انسان بھی تھے۔ مزاحیہ شاعر ساغر خیامی کے بعد ہلال سیوہاروی ہی ایسے شاعر بچے تھے جو ایسے معیاری اشعار کہتے تھے جو سننے والوں کو قہقہہ زار بھی بناتے تھے اور انھیں سوچنے پر بھی مجبور کرتے تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 17 نومبر 2012

رفعت پرواز

نجیب آباد: نوجوان شاعر رفعت پرواز کا گزشتہ شب اپنی رہائش گاہ پر صرف 25 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ بعد نماز ظہر ان کو سپرد خاک کردیا گیا۔ ان کی نماز جنازہ میں ادیب اور شاعروں کے علاوہ شہر کی معزز شخصیات نے شرکت کی۔ محلہ مغلوشاہ میں گیت غزل سنگم کی ایک تعزیتی میٹنگ منعقد کی گئی جس میں رفعت پرواز کے لیے دعائے مغفرت کی گئی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 16 نومبر 2012

سید شبیہ حسن

نئی دهلی: اردو کے سینئر صحافی اور خطاط سید شبیہ حسن

کا گزشتہ روز طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 79 برس تھی۔ پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ تین بیٹے اور ایک بیٹی ہیں۔ شبیہ حسن ماہنامہ 'انعام' کے ایڈیٹر تھے، وہ ایک عرصے تک آل انڈیا ریڈیو کے اردو جریدے پندرہ روزہ 'آواز' سے بھی وابستہ رہے۔ تدفین حضرت نظام الدین سے متصل قبرستان پنج پیراں میں عمل میں آئی۔ شبیہ حسن کے انتقال سے اردو اپنے ایک بے لوث خادم سے محروم ہوگئی ہے۔ سینئر صحافی مودود صدیقی نے ان کی مغفرت کے لیے خصوصی دعا کی اپیل کی ہے۔

روزنامہ 'خبر جدید' دہلی، 27 نومبر 2012

شفق شادانی، چراغ بھارتی

سنبھل: شہر کے ادبی ماحول میں اس وقت غم کے بادل چھا گئے جب ایک نہیں بلکہ دو معروف شاعروں کے انتقال کی خبر نے گشت کیا۔ محلہ کوٹ غربی اسرار احمد چراغ بھارتی کافی عرصے سے سانس کے دائمی مرض میں مبتلا تھے، کل شام ان کی طبیعت زیادہ ناساز ہوگئی اور عصر و مغرب کے درمیان انتقال ہوگیا وہ 48 سال کے تھے۔ وہ نہ صرف ایک شاعر تھے بلکہ بے باک صحافی بھی تھے۔ دوسری جانب سنبھل میں موضع واوئی کے رہنے والے شفق شادانی کا بھی انتقال ہوگیا۔ وہ بھی ایک زمانے سے علیل چل رہے تھے۔ وہ 74 سال کے تھے۔ ان کی تدفین بعد نماز ظہر آبائی قبرستان میں ہوئی۔ ان کا تعلق رامپور سے رہا ہے مگر کافی وقت سے وہ سنبھل کے واوئی میں سکونت پذیر تھے۔ ان کے اب تک کئی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں اور اردو اکادمیوں سے انھوں نے اعزاز بھی حاصل کیا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 30 نومبر 2012

ڈاکٹر کاظم علی خاں

لکھنؤ: ممتاز محقق نواب ڈاکٹر کاظم علی خاں کا 3 دسمبر کو قلبی دورہ پڑنے کے بعد انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 74 سال تھی۔ تعلیم لکھنؤ اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں حاصل کی۔ شیعہ کالج میں تدریسی سلسلہ شروع کیا بعد میں لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے متعلق رہ کر

سبکدوش ہوئے۔ ڈاکٹر کاظم علی خاں ایک مستند محقق، مرثیہ خواں اور ناقد کی حیثیت سے ادبی حلقوں میں احترام سے دیکھے جاتے تھے۔ انھوں نے خصوصیت سے انیس و دبیر اور غالب پر بڑا تخلیقی اور تنقیدی کام کیا اور اردو کا شاید کوئی ایسا مقبول یا معیاری رسالہ ہو جس میں ان کی تخلیق نہ شائع ہوئی ہو۔ انھوں نے کم و بیش پینتیس کتابیں اپنی یادگار کے طور سے چھوڑی ہیں۔ ڈاکٹر کاظم علی خاں اپنی دلفریب اور پر مذاق شخصیت کے سبب ادبی حلقوں میں بڑے محبوب اور محترم رہے تھے۔ اردو روزنامہ 'آگ' کو بطور روزنامہ نکالنے اور اس کو معیاری بنانے میں انھوں نے خصوصی دلچسپی لی۔ کاظم صاحب کے پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ دو بیٹے محسن علی خاں اور میثم علی خاں کے علاوہ بیٹی ڈاکٹر فرزانہ ہدی ہیں۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 4 دسمبر 2012

غفران احمد

نئی دھلی: ممتاز صحافی مولانا غفران احمد کا 16 نومبر 2012 کو انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 74 برس تھی۔ ان کے پسماندگان میں 2 بیٹے اور ایک بیٹی شامل ہے۔ دسمبر 1938 میں پیدا ہونے والے مولانا غفران احمد کا تعلق ایک علمی گھرانہ سے تھا۔ مدرسہ عالیہ فتح پوری سے سند فراغت حاصل کرنے کے بعد مولانا غفران نے عصری تعلیم کی طرف توجہ دی اور صحافت کے میدان میں آگئے۔ انھوں نے اپنے صحافتی زندگی کا آغاز ہفت روزہ الجمعیہ سے کیا۔ مختلف اخباروں سے وابستگی کے بعد وہ روزنامہ تیج سے وابستہ ہوئے۔ اس کے بعد جون 1970 میں اپنے زمانہ کے مشہور اخبار روزنامہ پرتاپ سے بطور سب ایڈیٹر وابستہ ہوئے۔ دسمبر 1998 میں 28 سال کی ملازمت کے بعد روزنامہ پرتاپ کے نیوز ایڈیٹر کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 17 نومبر 2012

اکھلیش متل

نئی دھلی: معروف علمی و تہذیبی شخصیت اکھلیشور دیال متل المعروف اکھلیش متل کا صبح ہولی فیملی اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ وہ 86 سال کے تھے۔ ان کا تعلق دہلی کے ایک بڑے معزز گھرانے سے تھا جو کانگریس اور مہاتما گاندھی کی تحریکات سے وابستہ رہا۔ پسماندگان میں دو بیٹے کارتک متل، کیشو متل اور ایک بیٹی ڈاکٹر فوزیہ رحمٰن متل شامل ہیں۔ متوفی اردو زبان و تہذیب کے بڑے

پر جوش حامی رہے اور زندگی بھر اپنی تحریروں کے ذریعے اپنی خدمات انجام دیتے رہے۔ تاریخی و تہذیبی موضوعات پر اکھلیش متل کا انگریزی کالم 'اتہاس' مشہور زمانہ ہوا، جو تقریباً 20 سال تک انگریزی روزنامہ ایشین ایج میں شائع ہوتا رہا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 22 نومبر 2012

پنڈت روی شنکر

نئی دھلی: ہندوستانی شاستریہ سنگیت کا دنیا بھر میں ڈنکا بجانے والے مشہور ستار نواز اور سنگیت کار پنڈت روی شنکر کا 11 دسمبر کو سان ڈیاگو میں انتقال ہوگیا۔ وہ 92 برس کے تھے۔ انھیں سانس کی تکلیف ہونے کے بعد اسپتال میں داخل کرایا گیا تھا۔ 3 مرتبہ گریمی ایوارڈ پانے والے روی شنکر اس سال بھی گریمی ایوارڈ کے لیے نامزد ہوئے تھے۔ انھوں نے رقص کے ذریعہ فنکاری کی دنیا میں قدم رکھا تھا۔

1999 میں انھیں بھارت رتن سے نوازا گیا تھا۔ پنڈت روی شنکر کی صحت کئی سال سے خراب چل رہی تھی۔ جمعرات کو ان کا آپریشن بھی ہوا تھا ان کے پسماندگان میں دو بیٹیاں مشہور ستار نواز انوشکا شنکر اور بین الاقوامی شہرت یافتہ گلوکار نورہ جونز ہیں۔ وہ 7 اپریل 1920 کو وارانسی میں پیدا ہوئے تھے ان کا نام رابندر وشنکور چودھری رکھا گیا تھا۔ انھوں نے 19 سال کی عمر میں بابا علاء الدین خاں سے ستار سیکھنا شروع کیا تھا۔ روشی شنکر نے پہلی مرتبہ 1939 میں ایک پروگرام میں لوگوں کے سامنے ستار بجایا۔ چھٹی دہائی میں وہ ملک سے باہر موسیقی کی دنیا میں چھا گئے۔ انھوں نے 1953 میں سوویت یونین میں اور 1956 میں مغرب میں اپنے فن کا مظاہرہ کرکے داد و تحسین حاصل کی۔ انھوں نے ایڈن برگ فیسٹول اور

لندن کے رائل فیسٹول ہال جیسے مقامات پر پروگرام کیے۔ انھوں نے ستیہ جیت رے کی فلم میں میوزک دیا تھا وہ 1949 سے 1956 تک آل انڈیا ریڈیو کے میوزک ڈائریکٹر رہے۔ انھیں 1986 سے 1992 کے لیے راجیہ سبھا کا ممبر نامزد کیا گیا تھا۔ انھوں نے اقبال کے ترانے 'سارے جہاں سے اچھا کی دھن' بھی تیار کی تھی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا'13 دسمبر 2012

خراج عقیدت:

اندر کمار گجرال

نئی دہلی: اردو زبان سے لگاؤ کے لیے مشہور سابق وزیراعظم اندر کمار گجرال کی موت پر مختلف تنظیموں نے اپنے رنج وغم کا اظہار کیا ہے۔ جمعیۃ علماء ہند اور جماعت اسلامی ہند کے دفتر سے جاری بیان میں اندر کمار گجرال کے سانحہ ارتحال پر تعزیت کا اظہار کیا گیا۔ جمعیۃ علماء ہند کے جنرل سکریٹری مولانا محمود مدنی نے سابق وزیراعظم اندر کمار گجرال کے سانحہ ارتحال پر اپنے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ان کے انتقال سے ایک وضع داری اور قدیم رکھ رکھاؤ کے حوالے سے بڑا خلا پیدا ہوگیا ہے۔ ہندو مسلم اتحاد اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے تناظر میں آنجہانی گجرال کا نام اہم ہے۔ مولانا مدنی نے کہا کہ گجرال کی وفات سے اردو زبان ایک اہم دوست سے محروم ہوگئی ہے۔ انھوں نے اردو کے سلسلے میں گجرال کمیٹی کی سفارشات میں جن نکتوں کی طرف توجہ دلائی تھی، ان کی اردو کے فروغ میں آج بھی بہت اہمیت ہے، ان سفارشات کو نافذ کرکے ان کو بہتر خراج عقیدت پیش کیا جاسکتا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 2 دسمبر 2012

دیویندر اسر اور اکھلیش متل

نئی دہلی: عالمی شہرت یافتہ اور برصغیر کے اردو ہندی کے معروف مصنف، نقاد اور فکشن نگار دیویندر اسر اور دہلی کی علمی، ادبی شخصیت اکھلیش متل کے انتقال پر غالب انسٹی ٹیوٹ میں ایک تعزیتی میٹنگ کا انعقاد کیا گیا۔ میٹنگ میں تعزیتی پیغامات میں مقررین نے کہا کہ دیویندر اسر کا شمار اردو ہندی کے ممتاز ادیبوں میں ہوتا ہے۔ ناول نگار اور افسانہ نگار کی حیثیت سے ان کی ایک منفرد پہچان تھی۔ غالب انسٹی ٹیوٹ نے 2004 میں دیویندر اسر کو غالب انعام برائے اردو نثر سے نوازا تھا۔ مقررین نے اکھلیش متل کے انتقال پر تعزیت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ ان کا حلقہ ارباب ذوق اردو ادب کے ممتاز شعرا، مجاز، فیض، فراق، فراز، انیتا ڈیسائی اور گوپی چند نارنگ و دیگر ہمعصر ادیبوں کے درمیان رہا۔ ان کے انتقال پر ادارہ ایوان غالب میں ایک تعزیتی جلسہ منعقد کیا گیا۔ متوفی کو خراج عقیدت پیش کرنے والوں میں سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، ڈاکٹر شاہد ماہلی، اقبال مسعود، ڈاکٹر ادریس احمد، ڈاکٹر سہیل انور، یاسمین فاطمہ، عبدالواحد، رفیق وغیرہ شامل تھے۔ دوسری جانب انجمن ترقی اردو (ہند) کے مرکزی دفتر اردو گھر میں بھی آج ایک تعزیتی نشست انجمن کے کارگزار صدر پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ اس موقعے پر انجمن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی نے کہا کہ دیویندر اسر آزادی ملک کے بعد ابھرنے والے ایک اہم ترقی پسند نقاد اور افسانہ نگار تھے۔ ڈاکٹر اسلم پرویز نے کہا کہ دیویندر اسر اردو کے ایک اہم دانشور تھے، دیویندر اسر ایک وسیع المطالعہ ادبی شخصیت تھے۔ انجمن کے نائب صدر سید شریف الحسن نقوی نے کہا کہ دیویندر اسر کی شخصیت مختلف الجہات تھی۔ انھوں نے زندگی بھر اردو زبان و ادب کی خدمت انجام دی۔ ان کے انتقال سے علم وادب کی دنیا میں ایسا خلا پیدا ہوا ہے جسے فی الحال پُر کیا جانا ناممکن نظر آرہا ہے۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اظہار تعزیت کرتے ہوئے کہا کہ دیویندر اسر کی موت سے اردو فکشن کا بہت بڑا نقصان ہوا ہے۔ ترقی پسند تحریک سے بھی ان کا بڑا گہرا تعلق تھا اور وہ اس میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیتے تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا'، 23 نومبر 2012

دیویندر اسر و ہلال سیوہاروی

نئی دہلی: اردو اکادمی، دہلی کی جانب سے ایک تعزیتی نشست زیر صدارت وائس چیئرمین پروفیسر اختر الواسع منعقد ہوئی جس میں معروف نقاد دیویندر اسر، طنز ومزاح کے مقبول شاعر ہلال سیوہاروی اور نامور اردو صحافی، ادیب و دانشور غفران احمد کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ جناب ہلال سیوہاروی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ ہلال سیوہاروی نے مشاعروں میں اپنے طنز کی کاٹ اور مزاح کی چاشنی سے محفلوں کو گرمایا اور عوام وخواص سے داد وتحسین حاصل کی۔ مرحوم غفران احمد کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ موصوف نے صحافت میں اپنی سنجیدگی اور دیانتداری سے ایک اہم مقام حاصل کیا۔ آخر میں ایک تعزیتی قرارداد پیش کی گئی جس میں تینوں شخصیتوں کے اوصاف حمیدہ پر روشنی ڈالی گئی۔

پریس ریلیز، اردو اکادمی، دہلی، 23 نومبر 2012

صفیہ صدیقی

لندن: راشد اشرف کی اطلاع کے مطابق معروف جاسوسی ناول نگار ابن صفی کی سالی اور مقبول افسانہ نگار صفیہ صدیقی کا لندن میں انتقال ہوگیا۔ راشد اشرف ابن صفی کے فرزند احمد صفی کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ احمد صفی صاحب کے دکھ بھرے پیغام میں تحریر تھا کہ ''آج میں نے اپنی ماں کو دوبارہ کھویا ہے۔'' صفیہ صدیقی کے مقبول افسانوں میں بدلتے زمانے، بکھرتے لوگ، مکالمہ وغیرہ کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔

روزنامہ 'ہمارا مقصد'30 نومبر 2012

عبدالمنان اعظمی، افضال الحق جوہر قاسمی، محمد اسلام انصاری

نئی دہلی: ''ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام آج ایک تعزیتی نشست کا اہتمام کیا گیا جس میں بحرالعلوم مفتی عبدالمنان اعظمی، دارالعلوم دیوبند کے فارغین کی تنظیم ابنائے قدیم کے بانی صدر مولانا افضال الحق جوہر قاسمی اور میرٹھ کے فاضل اجل اور حکیم حاذق حکیم محمد اسلام انصاری کے سانحات ارتحال پر گہرے رنج وغم کا اظہار کیا گیا۔ بحرالعلوم کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ ہمارے عہد میں تفقہ فی الدین میں بحرالعلوم کی ایک انتہائی ممتاز ونمایاں حیثیت تھی، ان کے فتاوی کا مجموعہ آج بھی ہماری دینی رہنمائی کے لیے مشعل راہ ہے۔'' مولانا وارث مظہری نے مولانا افضال الحق جوہر قاسمی کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ وہ نہ صرف روز اول سے تنظیم ابنائے قدیم کے سربراہ تھے بلکہ اس کے رسالے کے مدیر مسئول کے طور پر انھوں نے غیر معمولی خدمات انجام دیں۔ حکیم حضرت مولانا اسلام انصاری میرٹھی کے انتقال پر انتہائی دکھ کا اظہار کرتے ہوئے مفتی محفوظ الرحمان عثمانی نے کہا کہ حکیم صاحب نہ صرف طبیب حاذق تھے بلکہ عربی، فارسی اور علوم دینیہ کے بڑے شناوروں میں سے ایک تھے۔ آخر میں پروفیسر اختر الواسع نے ایک تعزیتی قرارداد پیش کی جس میں ان تینوں بزرگوں کے انتقال پر دکھ کا اظہار کرتے ہوئے ان کے حق میں دعا کی گئی۔

پریس ریلیز، ڈاکٹر عطاء الرحمٰن، انچارج ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، 3 دسمبر 2012